

بہنوں کا اپنا ہنامہ

فروری 2019

# شعاع

Core to Fun

<http://www.coretofun.net>





فروری 2019

جہد 33 باب 6

قیمت 70 روپے

رضیہ جمیلہ ابن حسن پر شنگ پر لیس سے چھپوا کر شائع کیا ۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: [shuaa@khawateendigest.com](mailto:shuaa@khawateendigest.com) website: [www.khawateendigest.com](http://www.khawateendigest.com)



700 روپے پاکستان (سالانہ) ---  
 6000 روپے ایشیا، افریقہ، یورپ ---  
 7000 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---  
[subscriptions@khawateendigest.com](mailto:subscriptions@khawateendigest.com)

**اختیار:** ماہنامہ شعاع و انجمن کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پیش کردہ تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، سلسلہ کوئی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی نی وی پیسٹل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی مکمل میں لائی جاسکتی ہے۔



طواف عشق،  
وہ اک شخص،

سمیرا حمید 146  
مریم عزیز 82



سمجھ میں نہیں آ رہا، کیا لکھیں، وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دکھ اور کرب کی اس کیفیت کو بیان کر سکیں جس سے اس وقت ہر حساس دل گزردہ رہے۔  
ان معصوم بچوں کی تصویریں نظروں کے سامنے سے ہٹتی ہی نہیں۔ سسکتے کی حالت میں خاموشی بھی معصوم بچیاں جو خوشی خوشی گھر سے شادی میں جانے کے لیے نکلی تھیں، ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے والدین کو خون میں نہلا دیا گیا۔ جو شاید ابھی بلوری طرح یہ بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔ ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ چھین لیا گیا ہے۔ یہ بچے ابھی زندگی کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پائے تھے کہ انہیں موت سے روشناس کرا دیا گیا۔  
ظلم و بربریت کا یہ مظاہرہ جوان کی آنکھوں کے سامنے کیا گیا، وقت گزرتے پر محب وہ اسے سبھ پائیں گے تو ان کی ذہنی کیفیت کا ہونگا۔ ان کی یہ خاموشی بہت سے سوال کر رہی ہے۔ اس کا جواب کون دے گا؟  
بنا کسی جرم کے، بنا کسی قصور کے، جارا افراد موت کی نیند سلا دیے گئے۔ اگر یہ قصور ہمارے ہی تھے تو کیا اسی منزل کے مستحق تھے۔ پھر تیرہ سالہ بچی اور ماں کا کیا قصور تھا؟ کیا اس معاملے کسی اور طریقے سے نہیں نجاتا یا سکتا تھا۔ ہم ایسے ہی ملک میں کس قدر غیر محفوظ ادبے امان ہیں، کیا ہمارا خون اتنا ہی اڑتا ہے کہ اپنے ہی ملک میں جسے چاہے جہت گری کا پتھر لگا کر مار دیا جائے۔  
دکھ سے زیادہ یہ کسی کا احساس ہے جو دل کی رگوں کو کاٹ رہا ہے۔  
ان بچوں پر جو گری ہے، وہ اسے زندگی بھر نہیں بھول پائیں گے۔ ہم ان کے والدین کو واپس نہیں لاسکتے۔ لیکن انہیں وہ محفوظ اور سافز دوسرے سکے ہیں جو ان کے ذہن کا سرمایہ بن سکے۔  
مکڑی آڑھان کے جو ممانات اب تک سامنے آئے ہیں، وہ ان کی بے حس کے مظہر ہیں، کیا ہماری ریاست ان بچوں کے لیے کچھ کر پائے گی؟

### نعیمہ ناز کا ناول - شہر تمنا

نعیمہ ناز کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جو ہمارے ارد گرد موجود زندگی کی کہانیاں لکھتی ہیں۔ یہ ادبیات ہے کہ ان کی مادہ کی کہانیوں میں زندگی کا گہرا فلسفہ اور شعور نظر آتا ہے۔ کردار نگاری اور گہرا مشاہدہ ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ خصوصاً کردار نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔ وہ گویا انسانی صورتوں کو کھینچ کر رکھ دیتی ہیں۔ اس پر باقاعدہ زبان، کوئی بھی موضوع ہو، اردو ادب کا حوالہ زبان کا استعمال ان کی تحریروں کو دلچسپ اور غیر معمولی بنا دیتا ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے۔  
اب تک انہوں نے جو کچھ ہے، ہماری قارئین نے پسند کیا ہے۔ اس ماہ سے ان کا سلسلہ 'ناول شہر تمنا' شروع کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ان کی دیگر تحریروں کی طرح یہ ناول بھی قارئین کو پسند آئے گا۔ ناول کی قسط پڑھ کر اس کے بارے میں اپنی رائے ضرور دے سکیں۔

### اسٹس شمارے میں،

- سیر احمد کا مکمل ناول - طواف عشق،
- سیر احمد کا مکمل ناول - طواف عشق،
- سٹائن بٹ کا ناول،
- افشین نعیم، حیران فشین، منشا محسن علی، مہدیہ فرغان اور شازیہ الطاف کے افسانے،
- آپ کی نگاہ سے معزز ذہن بلال کا بندھن،
- معارف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- جس طرح سے نانا جونا ہے - قارئین کے تجربات،
- سیر احمد کی ناول کی پوری بائیں اور دیگر متعلقہ ناول ہیں۔
- شعاع کا شمار آپ کو کیا لگا، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیں گے۔

مقدور ہمیں کب تیرے وصفوں کے رقم کا  
جہاں سے گنبد خضر ادکھائی دیتا ہے  
حقاکہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا  
وہاں سے آنکھ کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

اس مسند عزت پر کہ تو جلوہ نما ہے  
خدا بھی اس کا عجب اور انبیاء بھی تمام  
کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا  
وہ اک رسول جو یکتا دکھائی دیتا ہے

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن  
ہے برقرار توازن جو دین و دنیا میں  
آباد تجھی سے توبہ گھر ویر و حرم کا  
یہ راستہ تو نبی کا دکھائی دیتا ہے

ہے خوف اگر جی میں توبہ تیرے غضب کا  
نہ پوچھ خواہش دیدار مصطفیٰ کا صلہ  
اور دل میں بھر و سہا ہے توبہ تیرے کرم کا  
ہر ایک سمت اُبالا دکھائی دیتا ہے

مانند جناب آنکھ تو لے درد کھلی تھی  
نبی کا ذکر کرو دوستو کہ مدت سے  
کھینچنا نہ پراس بحر میں عرصہ کوئی دم کا  
جہاں دل میں اندھیرا دکھائی دیتا ہے

رحمان خاور

میر درد





## چالیس سال پہلے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آپس میں بحث ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔  
”اے آدم! آپ ہمارے والد ہیں، آپ نے ہمیں محرومی کا شکار کر دیا اور گناہ کا ارتکاب کر کے ہمیں جنت سے نکلوا دیا۔“

آدم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ ”اے موسیٰ! اللہ نے آپ کو شرف ہم کلامی کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو اپنے ہاتھ سے لکھ کر تورات دی، کیا آپ مجھے اس بات پر ملامت کرتے ہیں جو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میری قسمت میں لکھ دی تھی؟“

چنانچہ بحث میں آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔ ”آدم موسیٰ پر غالب آ گئے، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔“ (تین مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔)

(بخاری)

## فوائد و مسائل:

(1) حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ ملاقات، ممکن ہے جنت میں ہوئی ہو، ممکن ہے عالم ارواح میں۔ واللہ اعلم۔  
(2) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد حضرت آدم علیہ السلام کو یہ طعنہ دینا نہیں کہ انہوں نے غلطی کیوں کی کیونکہ وہ غلطی تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادی

تھی۔ ارشاد باری ہے۔

”پھر انہیں ان کے رب نے نوازا، ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔“ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ کی وجہ سے تمام انسانوں کو دنیا کی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں وضاحت فرمادی کہ یہ مصائب تو پہلے ہی تقدیر میں لکھے جا چکے تھے اور ان کا فیصلہ بہت پہلے ہو چکا تھا۔

(3) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ ”آدم علیہ السلام غالب آ گئے۔“ یہ تکرار تاکید کے لیے تھی تاکہ بخوبی علم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا، وہ تقدیر الہی اور مشیت الہی کا اجر تھا۔

## تقدیر پر بحث کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔  
”قریش کے مشرک تقدیر کے مسئلہ میں بحث کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، تو یہ آیت نازل ہوئی۔“

ترجمہ:

”جس دن انہیں چہروں کے بل آگ میں کھینٹا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) تم دوزخ کی آگ لگنے کا حزا چکھو۔ بے شک ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے مطابق پیدا کی ہے۔“ (القدر)

فوائد و مسائل:

(1) اس آیت اور حدیث سے بھی تقدیر کا ثبوت ملتا ہے۔  
(2) کفار کے لیے جہنم کا سخت عذاب مقدر ہے۔  
(3) واضح اور قطعی مسئلے میں اختلاف اور بحث کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔

## تقدیر پر بحث

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر صحابہ کے پاس تشریف لائے تو وہ تقدیر کے بارے میں بحث کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک غصے سے اس قدر سرخ ہو گیا، گو باس پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہیں۔ (تب) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے؟ یا کیا تمہیں اس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے؟ تم قرآن کی آیات کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہو۔ تم سے پہلی امتیں اسی وجہ سے تباہ ہوئی تھیں۔“ (مسند احمد)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔  
”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی مجلس سے غیر حاضر رہنے پر خوشی نہیں ہوتی جس طرح اس مجلس میں موجود نہ ہونے پر خوشی ہوئی۔“

## فوائد و مسائل:

(1) تقدیر اسرار الہی میں سے ایک راز ہے، اس پر مجمل ایمان لانا کافی ہے، اسی طرح دوسرے غیبی امور کے بارے میں بھی جس قدر بتا دیا گیا، اسے مان لینا کافی ہے اور جس چیز کی وضاحت نہیں کی گئی، اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

(2) قرآن و حدیث کی تفصیل کی وضاحت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ ان میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو، ورنہ امت میں اختلاف و افتراق پیدا ہوتا ہے اور قرآن و حدیث پر ایمان میں فرق آنے کا اندیشہ ہے۔

(3) قرآن و حدیث کے مطالعے کا اصل مقصد اخلاق و عمل کی اصلاح ہے۔ اگر کوئی شخص محض زور خطابت

کے اظہار کے لیے یا اپنے علم و فضل کا رعب بھانے کے لیے پیچیدہ مسائل میں مشغول ہوتا ہے، تو یہ اصل مقصد کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا باعث ہے۔  
(4) نصیحت کرتے ہوئے موقع محل کی مناسبت سے بعض اوقات غصے کا اظہار بھی کیا جاسکتا ہے، خصوصاً جب کہ نصیحت کرنے والا قابل احترام شخصیت کا حامل اور سامعین پر اس کے غصے کا منفی اثر پڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔

(5) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اس مجلس میں موجود نہیں تھے۔ کسی دوسرے صحابی نے انہیں یہ واقعہ سنایا، تاہم محدثین کے اصول کے مطابق یہ حدیث ”صحیح“ ہے کیونکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث براہ راست سننے والے صحابی کا نام نہ لیا جائے لیکن اس سے سن کر روایت کرنے والا بھی صحابی ہوا تو ایسی حدیث بالا اتفاق صحیح ہوتی ہے کیونکہ تمام صحابہ ”عادل“ (قابل قبول اور قابل اعتماد) ہیں۔

(6) صحابی کو اس مجلس سے غیر حاضری پر اس لیے خوش ہوئی کہ حاضرین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلطی کا اظہار فرمایا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو اگر غیب کی توقیہ مل جائے یا وہ کسی گناہ سے بچ جائے تو اس پر خوشی کا اظہار کرنا غرور و دیا میں شامل نہیں بلکہ نیکی سے محبت اور گناہ سے نفرت کی علامت ہے جو ایمان کا ایک حصہ ہے۔

## بدشگونگی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”بیماری ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، بدشگونگی کی کوئی حقیقت نہیں، نہ الو کوئی چیز ہے۔“

ایک اعرابی اٹھ کر آپ کے قریب آیا اور کہا۔  
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ایک ایسے نا، ایک اونٹ کو خارش کی بیماری ہوئی ہے، وہ تمام اونٹوں کو خارش میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”یہ تقدیر ہے، پہلے اونٹ کو خارش کس سے لگی؟“



فوائد و مسائل:

(1) عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ اگر کسی بیمار کے پاس کوئی تندرست آدمی اٹھتا بیٹھتا ہے یا اس کے ساتھ ٹکھاتا پیتا ہے یا اس کا لباس استعمال کرتا ہے تو اسے بھی وہی بیماری لگ جاتی ہے جو مریض کو تھی۔ عرف عام میں ایسی بیماریوں کو متعدی بیماریاں کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیماری اس طرح ایک سے دوسرے کو نہیں لگتی، البتہ ایسا ہو سکتا ہے کہ جس وجہ سے پہلے آدمی کے جسم میں مرض پیدا ہوا ہے، وہی وجہ کسی اور شخص میں بھی پائی جائے اور وہ بھی بیمار ہو جائے۔ جدید طب میں جراثیم کا نظریہ بہت مقبول ہے لیکن یہ جراثیم بھی بخلاف الہی اثر انداز ہوتے ہیں، گو یا دوسرے مریض کے بیمار ہونے کی اصل وجہ حکم باری تعالیٰ ہے نہ کہ مریض کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا۔ اس کے علاوہ ہومیوپیتھک نظریہ علاج جراثیم کو امراض کا سبب ہی تسلیم نہیں کرتا، اس لیے اس نظریے کے مطابق بھی مرض کا ایک شخص سے دوسرے کو منتقل ہونا ایک غلط تصور ہے۔

(2) عرب لوگ پرندوں اور جنگلی جانوروں کے گزرنے سے شگون لیتے تھے۔ کوئی شخص کوئی کام کرنا چاہتا تو کسی پیٹھے ہوئے پرندے یا ہرن وغیرہ کو پتھر مار کر بھگاتا، اگر وہ دائیں جانب جاتا تو سمجھا جاتا کہ کام سچ ہو جائے گا، اگر بائیں طرف جاتا تو سمجھا جاتا کہ کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طرح کے کام محض توہم پرستی کا مظہر ہیں، جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آج کل بھی اس طرح کے توہمات پائے جاتے ہیں، مثلاً کسی لکڑے یا ایک چشم انسان سے ملاقات ہو جائے تو اسے محسوس کا باعث قرار دینا۔ کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو سمجھنا کہ کام نہیں ہوگا یا کسی خاص عدد (مثلاً تیرہ کا عدد) یا کسی خاص دن (مثلاً منگل) یا کسی خاص مہینہ (مثلاً ماہ صفر) کو نامبارک قرار دینا بھی اسی میں شامل ہے۔ کوئی نقش بنا کر اس کے خانوں میں انگلی رکھنا یا اس قسم کے قال ناموں سے قسمت معلوم کرنے کی کوشش کرنا سب ایمان کی کمزوری کی علامت ہے۔

(3) مشرکین عرب میں ایک غلط تصور یہ بھی پایا جاتا تھا کہ اگر مقتول کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی روح الوی شکل اختیار کر کے مٹی اور چغنی پھرتی ہے اور انتقام کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے ان لوگوں میں نسل در نسل انتقام اور قتل و غارت کا سلسلہ جاری رہتا تھا، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، اسی طرح الو کو منوس تصور کرنا غلط ہے۔ وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہے جس کا انسانوں کی قسمت سے کوئی تعلق نہیں۔

### دل کی مثال

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”دل کی مثال ایک پر کی سی ہے جسے ہوا میں چھیل میدان میں لٹائی پلٹائی رہتی ہیں۔“

فوائد و مسائل:

(1) پرندے کا اکھڑا ہوا ایک پر بہت ہلکی چیز ہوتا ہے جسے معمولی ہوا بھی سیدھے سے اٹا اور اٹنے سے سیدھا کر سکتی ہے۔ اگر وہ کسی کھلے میدان میں ہو تو ظاہر سے ہوا اس پر زیادہ اثر انداز ہوگی کیونکہ وہاں ہوا کے اثر کو کم کرنے والی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ اور وہ بڑی تیزی سے الٹ پلٹ ہوتا ادھر سے ادھر اور یہاں سے وہاں اڑتا پھرے گا، انسان کے دل کی بھی یہی حالت ہے۔ اس پر مختلف جذبات و احساسات تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بھی نیکی کی طرف مائل ہوتا ہے بھی گناہ کی طرف، بھی اس میں محبت کے لطیف جذبات موجزن ہوتے ہیں، بھی نفرت کی آندھی چڑھ آتی ہے۔ دل کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھا کر شیطان اسے گناہوں میں ملوث کر دیتا ہے، لہذا کسی کو نیکی کی راہ پر گامزن دیکھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ ضرور جنت میں جائے گا اور نہ کسی کو گناہوں میں غرق دیکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ لازماً جہنمی ہے، اس لیے نیکی کی توفیق ملے تو اللہ سے استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور گناہ ہو جائے تو اشک ندامت کا نذرانہ لے کر اللہ تعالیٰ

کے سامنے حاضر ہو جانا چاہیے ایسا نہ ہو کہ گناہوں کی آندھی اسے رحمت سے بہت دور لے جائے۔

(2) چونکہ دل کی کیفیات کسی بھی لمحے تبدیل ہو سکتی ہیں، اس لیے انسان اپنے انجام کے بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ ایمان پر وفات کی دعا کی جائے اور ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے ہدایت و رہنمائی کی درخواست کی جائے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا کرتے تھے۔

”اے دلوں کو پھیرنے والے! میرا دل اپنی اطاعت و فرماں برداری پر ثابت رکھ۔“

### عمر میں اضافہ

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”صرف نیکی ہی عمر میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے اور تقدیر کو محض دعائیں ناسی ہے، بلاشبہ انسان کو بعض اوقات ایک گناہ کے ارتکاب کی وجہ سے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔“

فوائد و مسائل:

(1) یہ روایت بعض محققین کے نزدیک حسن درجے کی ہے جو البتہ اس حدیث کا آخری حصہ ”انسان اپنے برے عمل کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔“ کسی معتبر سند سے ثابت نہیں بلکہ شیخ البانی رحمۃ اللہ اس کی بابت لکھتے ہیں کہ یہ موزوں ہے۔

(2) نیکی کا ثواب جس طرح آخرت میں بلندی و درجات اور ابدی نعمتوں کا باعث ہوتا ہے، اسی طرح نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی نعمت، عزت اور مزید نیکی کی توفیق سے نوازتا ہے، اسی طرح برے عمل کی سزا دنیا اور آخرت دونوں میں ملتی ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمادے۔

(3) عمر میں اضافے کے مختلف مفہوم بیان کیے گئے

ہیں۔ (1) یعنی عمر میں برکت ہوتی ہے اور وہ اچھے کاموں میں صرف ہوتی اور ضائع ہونے سے بچ جاتی ہے۔ (ب) نیکیوں کی توفیق ملتی ہے جس کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ثواب پہنچتا رہتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ”باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب کے لحاظ سے بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے اچھی ہیں۔“

(ج) فرشتوں کو یا ملک الموت کو اس کی جو عمر معلوم تھی، اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ فرشتوں کے لحاظ سے اضافہ ہے، اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ یہ شخص فلاں نیکی کرے گا جس کے انجام کے طور پر اس کی عمر میں اس قدر اضافہ کر دیا جائے گا۔

تقدیر بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مصیبت سے انسان ڈرتا ہے، دعا کی برکت سے رک جاتی ہے اور آئی ہوئی مصیبت رفع ہو جاتی ہے۔ جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو دعا کی وجہ سے مچھلی کے پیٹ سے نجات مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

”اگر وہ (اللہ کی) پاکیزگی بیان کرنے والوں میں سے نہ ہو جاتے، تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک اس (مچھلی) کے پیٹ ہی میں رہتے۔“

الفصل 143-144

(4) یہاں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تبدیلی فرشتوں کے علم کے مطابق تبدیلی ہے، اللہ کے علم میں تبدیلی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا کہ فلاں شخص دعا کرے گا، پھر اس کی مشکل حل ہو جائے گی۔

(5) اس میں دعا کی ترغیب پائی جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا بھی جائز اسباب میں سے ہے جسے اختیار کرنا تو کل کے منافی نہیں بلکہ عین توکل ہے۔

### عمل

حضرت سراقہ بن جشم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا۔

”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا عمل ان امور میں شامل ہے جنہیں لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ ہو چکا یا اس کا تعلق



آئندہ (فیصلہ ہونے والے معاملات) سے ہے۔“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بلکہ وہ ان امور میں شامل ہے جن کو لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور اس کا اندازہ ہو چکا اور ہر ایک کے لیے وہ کام آسان ہو جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا۔“  
فائدہ:

انسان کے نیک اور بد ہونے کا تعلق بھی تقدیر سے ہے لیکن بندے کو اس کا علم نہیں۔ وہ شریعت کے مطابق عمل کرنے کا مکلف ہے۔

### مومن

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”مومن ہمیشہ اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتا ہے جب تک وہ حرام خون (بہانے کا ارتکاب) نہ کرے۔“

(بخاری)

فائدہ:

اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ مومن جب تک کسی کا باحق خون نہیں بہاتا، اسے دین پر عمل کرنے کی توفیق ملتی رہتی ہے اور دوسرا مفہوم ہے کہ اللہ کی رحمت اس کے لیے کشادہ رہتی ہے، مالی (انجام) دونوں کا ایک ہی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت کا زیادہ مستحق اور امیدوار ہوتا ہے اور جوں ہی وہ عمل باحق کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ کی رحمت کی امید کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے اور وہ ناامیدوں میں سے ہو جاتا ہے۔

### نا جائز لینا

حضرت خولہ بنت ثامر انصار پہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے اور یہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”بلاشبہ کچھ لوگ اللہ کے مال (بیت المال) میں ناجائز تصرف کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے

لیے قیامت والے دن جہنم کی آگ ہے۔“

(بخاری)

فائدہ:

قوی خزانے میں ناجائز تصرف اور اسے مصالح عامہ کے بجائے مصالح خاصہ کے لیے استعمال کرنا کبیرہ گناہ ہے جس پر اسے جہنم کی سزا ہو سکتی ہے، اگر اس نے مرنے سے قبل خالص توبہ نہ کی۔

### نہید کا غلبہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،  
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی شخص رات کو (عبادت کے لیے) کھڑا ہو اور قرآن کا پڑھنا (غلبہ نہید کی وجہ سے) اس کی زبان پر مشکل ہو رہا ہو اور اس کو کوئی علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ لیٹ جائے (تھوڑی دیر سولے)۔“ (مسلم)

فائدہ: نماز کے لیے چونکہ حضور قلب اور خشوع خضوع نہایت ضروری ہے، اس لیے نماز ایسی حالت میں پڑھنی چاہیے جب انسان تازہ دم ہو، اس کے اندر سستی اور تھکاوٹ نہ ہو۔ اسی لیے مذکورہ دونوں حدیثوں میں غلبہ نہید کے وقت نماز پڑھنے سے روک دیا گیا ہے کیونکہ ایسی حالت میں بارگاہ الہی میں عاجز و نیاز کا صحیح اظہار نہیں ہو سکتا جو نماز کی اصل روح ہے۔

بنابریں ایسی حالت میں انسان کو سو کر پہلے اپنی نیند پوری کر لینی چاہیے کیونکہ اس کے بعد ہی اسے قرآن پڑھنے، دعا و مناجات اور توبہ و استغفار کرنے اور نماز پڑھنے میں حرا آئے گا۔

www.caretofun.net

### بندہ

## درمیان بیکار ہمارا بیکار

شاہین رشید

بچے؟

”میری شادی 12 دسمبر 2009ء میں اپنے کزن بلال پراچہ کے ساتھ ہوئی۔ یہ میرے پھوپھی کے بیٹے ہیں اور میری پھوپھی ہمارے خاندان کی وہ پہلی خاتون ہیں جن کی برادری سے باہر شادی ہوئی۔ ہم کشمیری بٹ ہیں اور ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہیں ہے۔ بلال بہت ہی اچھے اور سچے ہوئے انسان ہیں اور میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں میں ان کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ بہت پڑھے لکھے اور باشعور انسان ہیں اور مجھے بہت عزت دیتے ہیں۔ میری بیٹی آٹھ سال کی ہے۔ دوسری تین سال کی ہے۔ میرے میاں صاحب تقریباً پانچ چھ سال ملک سے باہر رہے اب یہاں پاکستان میں جا رہے ہیں۔“

”شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی؟ تیاری خود کی؟“

”جی..... شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ میری شادی سے پہلے میری امی کا انتقال ہو چکا تھا۔ مگر میرے بھائیوں نے میرے بہت خرچے اٹھائے اور بہت چاہت کے ساتھ میری شادی کی۔ ان کی یہی خواہش تھی کہ ”شمن“ کی شادی میں کوئی کمی اور کسر نہ رہے۔ میری ساری تیاری میری بھابی نے کی۔ البتہ شادی کا جوڑا، دیگر کپڑے اور جوتے اپنی پسند سے خریدے تھے۔ سسرال والوں کے ساتھ مل کر شاپنگ نہیں کی۔ میری بھابی چونکہ میری پسند سے واقف تھیں لہذا کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔“

”شوہر کے لیے جو تصور تھا آپ کا، پورا ہوا؟“

”شادی سے پہلے ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ

یہ جو ہماری مصنفین ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ انہیں اپنی تحریروں سے قارئین کے دلوں میں جگہ بنانا۔ ان کی اصلاح کرنا، مسائل کو خوبی سے حل کرنے کا طریقہ آنا ہے۔ درمیان بھی ایک ایسی ہی لکھاری ہیں، جو ہم سب کی پسندیدہ ہیں۔ اپنی تحریروں سے تمام مسائل کو خوب صورتی کے ساتھ حل کرنے والی ہماری یہ رائٹر اصل زندگی میں اپنے ”بندھن“ کیسے نبھاتی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہم ان کے انٹرویوز کرتے رہتے ہیں اس بار ہمارا انتخاب ”درمیان بلال“ ہیں۔

”کیا حال ہیں؟ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”الحمد للہ..... بہترین گزر رہی ہے۔“

”چلو تو شروع کرتے ہیں باتیں..... پہلے اپنا فیملی بیک گراؤڈ بتاؤ؟“

”میری امی کا تعلق راجپوت بھٹی فیملی سے ہے اور سونی کے شہر گجرات سے ان کا تعلق تھا۔ امی کے انتقال کو دس سال ہو گئے۔ ابو حیات ہیں، خدا انہیں لمبی عمر دے۔ (آمین) ابو کا تعلق سیالکوٹ سے ہے..... امی کے سارے میکے کے لوگ آری اور نیوی میں ہیں جیسے میجر عزیز بھٹی شہید، بشیر شہید اور راجیل شریف ہمارے قریبی بھائی ہیں۔ میرے والد بٹ کشمیری فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ امی کی شادی برادری سے باہر ہوئی۔ میں 21 مئی کو سرگودھا میں پیدا ہوئی۔ ہم دو بیٹیاں اور پانچ بھائی ہیں۔ میرا نمبر پانچواں ہے۔ چار بھائی شادی شدہ ہیں اور ملک سے باہر ہیں۔ ایک بھائی کی ابھی شادی نہیں ہوئی وہ سب سے چھوٹا ہے۔“

”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہو گیا ہے اور



## سلطان محمد فاتح

ملت اسلامیہ کے لازوال کردار "سلطان محمد فاتح" کے کارہائے نمایاں کی سبق آموز داستان محترمہ شاہدہ لطیف کی سلسلہ وار کہانی تاریخ کے جہرہ کے،

## خونی ہاتھ

سیاست ایک جنگل کے دستور کا نام ہے جس میں ہر چیز بد وقت ضرورت جائز ہوتی ہے

ایم الیاس کی سیاسی داؤد کی منہ بولتی تصویر،

## حرمائے الفت

انسان جو بوتا ہے اسے ویسی ہی فصل کاٹی پڑتی ہے جاوید رابی کا صہیت آموز انداز،

## تقدیر کا ستم

دام میں پھانسنے والوں کی بے دم سازشوں کا قصہ سلمان راحت کا دلکش انداز بیان،

## ضمیر کی جنگ

ایک عورت کی سنگ دلی اور خود غرضی کا دلچسپ واقعہ سیدہ عطیہ زاہرہ کے قلم سے،

اس کی علاوہ دس دس کی روایتیں، سسٹین اور تجسین سے پیرور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زار و ترجمہ کہانیاں

فروری 2019 کا شمار آج ہی خریدیں

"عروسی جوڑا کتنا قیمتی تھا..... ہزاروں میں لایا لاکھوں میں لایا تھا؟"

"عروسی جوڑا کافی اچھا اور کاہنہ تھا تو سال پہلے کے حساب سے تھا، بھاری بھی تھا..... لاکھوں کا تو نہیں مگر ہزاروں میں ضرور تھا۔ نو سال قبل میں نے اپنا عروسی جوڑا چالیس ہزار میں خریدا تھا۔ بہت پیارا تھا اور سب نے بہت تحریف کی تھی۔"

"سکھڑ بھو بن کے آئیں یا سب کچھ سسرال میں ہی سیکھا؟"

"امی کی بیماری کی وجہ سے میں کافی کم عمری میں گھریلو امور میں ماہر ہو گئی تھی اور شکر الحمد للہ سکھڑ بھو کے روپ میں، میں سسرال آئی تھی اور شادی سے پہلے ہی میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی خاندان بھر میں دھوم تھی اور شادی کے ایک ہفتے کے بعد ہی میں نے کوئٹہ شروع کر دی تھی..... اور سب سے پہلے میں نے شاہی زردہ بنایا تھا جو سب کو بے حد پسند آیا تھا۔"

"میاں صاحب خوش خوراک ہیں، چوڑی ہیں یا جو پک گیا کھا لیا؟"

"بلال! بہت کم کھاتے ہیں، مگر بہت اچھا کھانا کھانے کے عادی ہیں اور خوشین ہیں اور اب تو میرے ہاتھ کا کھانا جب سے کھانے لگے ہیں انہیں کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند ہی نہیں آتا۔"

"کیا بیوی کو بھی کمانا چاہیے؟"

"دیکھیں اگر عورت یہ سمجھتی ہے کہ میرے جاب کرنے سے گھر، شوہر اور بچے نظر انداز نہیں ہوتے اور وہ سب ذمہ داریوں کو ساتھ لے کر چل سکتی ہے تو ضرور جاب کرے..... اور اپنے میاں کا ہاتھ بٹائے، کیونکہ اپنی مہنگائی ہو گئی ہے کہ اب گھر میں سب کو کمانا چاہیے تو اپنے میاں کو سپورٹ کرے۔"

"یہ سوال میں سب سے کرتی ہوں کہ لڑکی کو ہم دھوم دھام سے بیاہ کر لاتے ہیں مگر کچھ عرصے کے بعد لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں تو ایسا کیوں

شوہر بیرون ملک چلے گئے تھے۔ ان سے میری جدائی ہی میری بہت بڑی قربانی تھی۔ وہ تقریباً چھ سال ملک سے باہر رہے۔"

"شادی کے بعد آپ کے مزاج میں کیا تبدیلی آئی؟"

"شادی کے بعد مزاج میں کچھ خاص فرق نہیں آیا۔ پہلے بھی کم بولتی تھی، اب بھی کم بولتی ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ مزاج میں تھوڑی خجندی آ گئی ہے۔ اپنے کام سے کام نہ کرتی ہوں بلا وجہ کسی کے معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ خوش مزاج پہلے بھی تھی اور اب بھی ہوں۔"

"تین سال متکلی رہی۔ کوئی خاص واقعہ پیش آیا..... اور کیا تمام رسمیں ہوئی تھیں؟"

"نہیں جی..... اللہ کا شکر ہے کہ کوئی واقعہ جو قابل ذکر ہو پیش نہیں آیا..... اور رسمیں بھی سب ہوئی تھیں اور دونوں گھروں نے بہت انجوائے کیا تھا۔"

"اگر شادی نہ ہوئی ہوتی یا پھر بلال آپ کی زندگی میں نہ آتے ہوتے تو زندگی کیسی گزر رہی ہوتی؟"

"اگر خدا خواستہ شادی نہ ہوئی ہوتی تو زندگی اور عروسی ہوتی..... میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا رہتا اور پھر اگر بلال میری زندگی میں نہ ہوتے تب بھی زندگی نامکمل ہوتی، کیونکہ بلال فطرتاً رشتوں کے معاملے میں اور محبتوں کے معاملے میں بہت حساس اور کیرنگ ہیں۔ جتنی میں ان کے ساتھ اچھی اور آرام دہ زندگی گزار رہی ہوں۔ کسی اور کے ساتھ نہ گزار سکتی مای کی بیماری کے دوران میں نے جتنا ان کا خیال رکھا تو مجھے لگتا ہے کہ بلال میری والدہ کی دعاؤں کا صلہ ہیں۔ اللہ بلال کو ہمیشہ صحت کے ساتھ سلامت رکھے۔ (آمین)۔"

"رخصتی کے وقت اور نکاح کے وقت کیا کیفیت تھی؟"

"نکاح اور رخصتی کے وقت بہت روٹی تھی۔ امی بھی بہت یاد آ رہی تھیں اور رخصتی کے وقت میرے بھائی اور بہن بھی بہت روتے تھے۔"

آپ کا شوہر بہت کیرنگ ہو، لوگ ہو۔ آپ کے ساتھ تخلص ہو اور الحمد للہ بلال کو میں نے اپنے تصور سے بہت زیادہ تخلص، پیار کرنے والا پایا، بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھے بہت عزت دیتے ہیں، محبت عزت کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے اور الحمد للہ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔ میری متکلی تین سال رہی تھی۔"

"شادی کے بعد گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"چونکہ میں بیاہ کر اپنی پھوپھو کے گھر آئی تھی تو ماحول میں تو کوئی خاص فرق نہیں تھا البتہ سونے جاگنے اور کھانے پینے کے ٹائم میں فرق تھا۔ چونکہ امی کا تعلق آرمی کے خاندان سے تھا تو ہم نے بہت ڈسپلن لائف گزار دی تھی، ہر کام کے لیے ٹائم مقرر تھا..... مثلاً میکے میں صبح آٹھ بجے ناشتہ کرتے تھے، سسرال میں دس، گیارہ بج جاتے تھے۔ میکے میں صبح ایک بجے کر لیتے تھے جبکہ سسرال میں تین چار بج جاتے تھے۔ رات کا کھانا میکے میں آٹھ بجے کھا لیتے تھے جبکہ سسرال میں تقریباً دس بج جاتے تھے۔"

"جوائنٹ فیملی میں آئی تھیں آپ؟ بہتر کیا ہے جوائنٹ یا سنگل فیملی؟"

"جی..... میں جوائنٹ فیملی میں آئی تھی۔ بلال کی فیملی میں والدین کے علاوہ صرف تین بھائی ہیں۔ جوائنٹ فیملی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کی تربیت اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔"

"شادی کے دو تین سال لڑکی کے لیے مشکل ہوتے ہیں کہ نیا ماحول ہوتا ہے تو قربانی دینی پڑتی ہے لڑکی کو..... اور پھر گھر اپنا ہو جاتا ہے..... ایسا ہے؟"

"شادی کو نبھانے کے لیے عورت کو بھی قدم قدم پر اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ اپنا گھربنانے کے لیے عورت کو ہی زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں تب کہیں جا کر شوہر اور گھر والوں کے دلوں میں مقام بنتا ہے..... شادی کے بعد میں نے جو سب سے بڑی قربانی دی تھی وہ کہ شادی کے دو سال بعد ہی میرے



# دستک دستک

شاہین رشید



سونیا حسین

”کیا حال ہیں؟“

”اللہ کا شکر ہے..... آپ ٹھیک ہیں۔“

”الحمد للہ..... آنگن“ دیکھ رہے ہیں۔ ہمیشہ

کی طرح جان دار پر فارمنس؟“

”بہت شکریہ..... واقعی“ آنگن“ بہت زیادہ

پسند کیا جا رہا ہے۔“

”کر دار مشکل لگ رہا ہے؟“

”ارے نہیں..... اب تو ماشاء اللہ سے اتنا کام

کما ہے کہ اب کوئی کام مشکل نہیں لگتا..... اور اب تو

کروڑوں کے کوئی چیلنجنگ رول ملے تو کروں.....

”نہیں..... کام کر دار بھی کافی حد تک چیلنجنگ ہے۔“

بہت پیاری پر فارمر ہو۔ گزشتہ دنوں

IIPA ایوارڈ میں تم کو دیکھا..... ایوارڈ کی مبارک باد!

”جی..... بہت شکریہ ایوارڈ ملنے پر میں بہت

خوش ہوں اور یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات

ہے کہ سینئرز کے ساتھ مجھے بھی ایوارڈ ملا۔“

”مبارکباد ہوئی تھیں تو ایوارڈ ملنے کی امید

کتنی تھی..... کوئی امید نہیں تھی یہ تو اللہ

کا فضلہ تھا..... کہ ایوارڈ مل گیا مجھے۔“

”اور ایسے ہی مزید ایوارڈز لینے کے لیے اب

”بالکل جی..... یہ ایوارڈز میں نے اپنے

”پاکستان کے کام کیا ہے..... اور ج تو یہ

ایوارڈ کے بعد میری قدم دار یوں میں مزید

کام میں زیادہ سے زیادہ محنت کروں اور

”میں نے بڑے

”ان کے جانے کے بعد میں سسرال میں ہی

رہی..... امی کا بھی چونکہ انتقال ہو چکا تھا تو میں نے

مناسب نہیں سمجھا اسکے میں رہنا..... میاں صاحب

جب ملک سے باہر گئے تو میری بیٹی صرف ایک سال

کی تھی۔ تو میرا سارا وقت اسی کے ساتھ گزر جاتا تھا یا

چھوٹے موٹے کاموں میں گزر جاتا تھا۔“

”میاں صاحب گھر کے کاموں میں آپ کا

ہاتھ بٹاتے ہیں؟“

”میرے میاں صاحب جاب کرتے ہیں اور

جب ان کی چھٹی کا دن ہوتا ہے تو گھر کے کاموں میں

میری بہت مدد کرواتے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی

کام کے حوالے سے مجھ پر بوجھ نہیں ڈالا، بلال ان

مردوں کی طرح نہیں ہیں جو بیویوں پر رعب چلاتے

ہیں یا رعب ڈالتے ہیں۔ میرا بہت ساتھ دیتے ہیں یہ

چھٹی کے دن۔“

”بچوں کی تربیت میں زیادہ ہاتھ کس کا ہے،

آپ کا یا بلال صاحب کا؟“

”دونوں بچیوں کی تربیت میں ظاہر ہے میرا

زیادہ ہاتھ ہے اور بلال بھی بچوں کی تربیت کی کافی

فکر کرتے ہیں اور میرا ساتھ دیتے ہیں اور بیٹیوں کو جو

بات سمجھانی ہوتی ہے بڑے طریقے سے سمجھاتے

ہیں..... اور ہم دونوں مل جل کر بیٹیوں کی تربیت پہ

توجہ دیتے ہیں۔“

”اور آخر میں..... جن کی شادیاں نہیں ہوتیں

ان کے لیے کچھ کہیں گی؟“

”شادی ضرور کرنی چاہیے، یہ حکم خداوندی ہے،

اللہ کا سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے یہ..... نکاح

ضرور کریں، شادی ضرور کریں یہ ایک مشکل سزا تو ہے

لیکن عورت اپنے صبر سے، محبت اور ایثار و قربانی سے

اپنے اس سزا کو بہت زیادہ خوش گوار بنا سکتی ہے۔ میری

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب بیٹیوں کی قسمت اچھی کرے

اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم اور آباد رہیں۔

(آمین) اور اس کے ساتھ ہی ہم نے درجن سے

اجازت چاہی۔

”ہے؟“

”سسرال میں لڑائی جھگڑے اس وجہ سے

ہوتے ہیں۔ جب میاں بیوی کے جھگڑے یا آپس

کے معاملات بیڈروم سے باہر آ جاتے ہیں۔ تو پھر

مسائل جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں اور میرا خیال ہے

کہ ایک مخصوص مدت کے بعد جوائنٹ فیملی سے الگ

ہو جانا چاہیے۔ اس طرح رشتوں میں محبت قائم رہتی

ہے۔ کم تلیں مگر اچھے طریقے سے تلیں۔ اس طرح

رشتوں کا بھرم قائم رہتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی

کے قریب رہ کر آپ ان کے دل کے قریب بھی رہ

سکتے ہیں..... بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے

قریب رہ کر آپ ان کے لیے دل سے بہت دور

ہوتے ہیں جوائنٹ فیملی میں رشتوں کا بھرم ختم ہو جاتا

ہے۔“

”گھر کا بجٹ کون بناتا ہے اور کیا لگا بندھا ملتا

ہے یا میاں صاحب ساری کمائی آپ کے ہاتھ میں

رکھ دیتے ہیں؟“

”گھر کا بجٹ میں ہی بناتی ہوں اور بلال جو

کماتے ہیں میرے ہی ہاتھ میں لا کر رکھ دیتے

ہیں..... اور بقول بلال کے کہ تم بہت اچھے طریقے

سے گھر چلا سکتی ہو اور چلائی ہو، جو کہ میرے بس کی

بات نہیں ہے۔“

”میاں صاحب کو آپ بھی بنی اچھی لگتی ہیں یا

سادگی میں؟“

”میں اپنے میاں کو ہر حال میں پسند ہوں اور

وہ مجھے اکثر کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری شخصیت اچھی لگتی

ہے۔ حلیہ سے مجھے کوئی مطلب نہیں ہے..... میرے

میک اپ کا خرچا تو بالکل بھی نہیں ہے کیونکہ گھر میں

بالکل بھی میک اپ نہیں کرنی۔ میں میک اپ میں

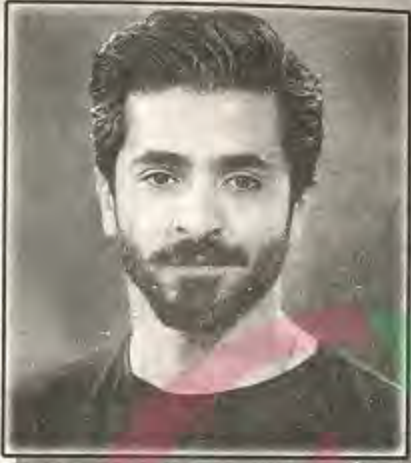
”آئی لائٹر“ اور ”لپ اسٹک“ لگاتی ہوں اور کچھ نہیں

لگاتی۔“

”میاں صاحب ملک سے باہر رہے تو آپ

بھی ایک آدھ مرتبہ گئیں یا سسرال میں ہی رہیں؟“





کی کہ گھر میں سب کو اپنے خیالات بدلنے پڑے۔  
 ”آپ کے والد ایئر فورس میں تھے آپ کا دل نہیں چاہا؟“  
 ”بس کہتے ہیں نا کہ جہاں دھیان پڑ جائے۔  
 اداکاری کا جنون تھا اور اس جنون کے آگے سب کچھ  
 ثانوی تھا۔ جبکہ میرے والد کو تو تمغہ امتیاز اور ستارہ  
 امتیاز بھی مل چکا ہے۔“  
 ”اور کیا مشاغل رہے آپ کے؟“  
 ”بس تقریری مقابلوں میں بہت حصہ لیتا تھا  
 اور ڈیوٹی ٹیم کا کپتان بھی رہ چکا ہوں۔ کرکٹ سے  
 بھی لگاؤ رہا اور کھیل بھی چکا ہوں۔ بس باقی اپنی فیلڈ  
 میں ہی دلچسپی رہی۔“



### سورق کی شہسب

ماڈل ..... انعم فیاض  
 میک اپ --- روز بیوٹی پارلر  
 فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا

میں نے ”ایم بی اے“ کی ڈگری حاصل کی ہے۔“  
 ”اچھا گڈ..... استعمال میں نہیں لائیں،  
 مطلب جاب نہیں کی؟“  
 ”اچھی اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ ابھی شو بز  
 میں بہت سیٹ ہوں۔ خدا خواستہ کوئی مسئلہ ہوا تو پھر  
 یہ ڈگری کام آئے گی۔“  
 ”اپنے کیے گئے ڈراموں میں بہترین کے کہو  
 گی؟“

☆☆☆

### شہر یار منور

”کیا حال ہیں؟“  
 ”جی اللہ کا شکر ہے۔“  
 ”اسکرین پر نظر نہیں آ رہے آپ؟“  
 ”میں کم کام کر کے معیاری کام کرنے کا قائل  
 ہوں۔ اچھے کردار کے آگے کوئی سمجھوتا نہیں..... اور  
 ویسے بھی میں کم اس لیے نظر آتا ہوں کہ جب بھی  
 اسکرین پر آؤں دھماکہ خیز کردار میں نظر آؤں.....“  
 ”تجس طرح ”آسمانوں پر لکھا ہے“ میں آپ کا  
 کردار لازوال تھا..... کیا کہتے ہیں آپ؟“  
 ”بالکل ٹھیک کہا کہ میرا رول لازوال تھا۔ سچل  
 اور میری پر فارمنس کو بہت پسند کیا گیا اور سیریل ہٹ  
 گیا..... تو جب آج تک لوگ اس رول کو یاد کرتے  
 ہیں تو میری خواہش ہے کہ آئندہ بھی ایسا ہی اچھا رول  
 کروں کہ ہمیشہ یاد رکھا جاؤں۔“  
 ”آج کل کیا کر رہے ہیں؟“  
 ”فلمیں بھی ہیں اور کچھ ڈرامے بھی..... لیکن  
 ابھی نہیں بتاؤں گا کہ پھر سپنس ختم ہو جائے گا۔“  
 ”آپ اتنے اچھے فنکار ہیں ہمارے کئی فنکار  
 پڑوسی ملک کی فلمیں کر بھی رہے ہیں اور کر کے بھی

”یہ تو بہت مشکل سوال ہے..... تاہم کچھ ہی  
 عرصہ قبل میں نے ایک سیریل کیا تھا۔ ”کیسی ہے یہ  
 تنہائی“ بہت ہٹ گیا تھا یہ ڈرامہ اور مجھے بھی بہت  
 پسند ہے۔ بہت اچھا رول تھا میرا۔“  
 ”اب فلموں میں بھی قدم جما چکی ہو؟“  
 ”تمہاری پہلی فلم تھی۔ کیا کہو گی اپنی فلموں کے بارے  
 میں، یعنی فلم انڈسٹری کے بارے میں؟“  
 ”ہاں..... یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ ہماری  
 فلم انڈسٹری بہت آگے بڑھ رہی ہے..... گوکہ آہستہ  
 آہستہ بڑھ رہی ہے مگر بڑھ تو رہی ہے نا۔“  
 ”فلم کے لیے کردار کی کوئی خاص ترجیح ہوگی یا  
 فلم تو ہے کردار مل رہا ہے تو قبول کرلو؟“  
 ”نہیں نہیں..... میں نے بھی ڈراموں کے  
 لیے کپور و ماہر نہیں کیا اور ہمیشہ معیار کو ترجیح دی تو بھلا  
 بڑی اسکرین کے لیے کیسے کپور و ماہر کر سکتی ہوں.....

میری ترجیح بہت ہی اچھا اور چیلنجنگ رول ہوگا.....  
 میری خواہش ہے کہ میں ایسی فلموں میں کام کروں  
 جس کی اسٹوری میرے ارد گرد گھومتی رہے، جس کی

### سانحہ ارتحال

ہماری ساتھی ثوبیہ قطب کے والد قطب الدین رضائے الہی سے انتقال کر گئے۔

اللہ ودانا الیہ راجعون

ادارہ خواتین ڈائجسٹ، ثوبیہ اور ان کے گھر والوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔





خدا بھجوانے کے لیے پتا  
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔  
Email: shauha@khawateendigest.com

پہلا خط لاہور سے شہنازناہید کا ہے، لکھتی ہیں  
شعاع اور میر اساتھ تو تقریباً ایک ڈیڑھ سال پرانا  
ہے لیکن خواتین تو میں بہت دیر سے پڑھ رہی ہوں جب  
میں جوان تھی۔ بچے چھوٹے تھے، دو بیٹے۔ ایک بیٹی بہت  
محسن حالہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انہوں نے  
میں سے انہوں پر مایہ ناز اور اہمیت رکھتی ہیں پڑا  
کالج میں ہے اور میں خود پڑھی ہوئی ہوں۔ تارن  
پیدائش چودہ اگست 1947ء ہے عمر کا اب خرچ حساب  
لگائیں۔ جلد پریشر اور شوگر کی سرینیس ہوں لیکن الحمد للہ  
میں ٹھیک نہیں ہوں۔ فجر کے بعد واک کرتے جاتی ہوں  
پھر آ کے ٹی وی پر سونا پھر اٹھ کر امی اور اپنا ناشتہ بناتی  
ہوں۔ ناشتہ کر کے قرآن پاک پڑھتی ہوں پھر صبح میں  
سیر کرنا شروع کرتی ہوں۔

بھی میں دھوپ میں چھت پر بیٹھی آپ کو خط لکھ رہی ہوں  
میری امی میرے پاس بیٹھی اخبار پڑھ رہی ہیں۔ ماشاء اللہ  
میری امی بھی گھر میں چلتی پھرتی ہیں۔ میڑھیاں چڑھ گئی  
ہیں۔ پانچ وقت کی نماز اور قرآن پاک پڑھتی ہیں۔  
انہوں نے ہندوستان کے اسکول سے پانچ  
جماعتیں پڑھی ہوئی ہیں۔ ہم جالندھر کے آرائیں ہیں  
پاکستان بننے کے بعد یہاں آئے تھے اب اگر میں آپ کو  
یہ کہوں کہ ہمارے گھر میں ساس بھوکا کوئی مسئلہ نہیں ہے تو  
شاید کوئی یقین نہ کرے میں نے بھی نہیں سوچا کہ اب  
میری بھوئی میرا ناشتہ بنائے گی جب بھی وہ جلدی اٹھ  
جائے تو وہ بھی بنا دیتی ہے اگر اسے بھی کہیں جانا پڑ  
جائے۔ مثلاً بچوں کے اسکول یا کسی اور جگہ تو کھانا بھی بناتی  
ہوں روٹی چاول سب کچھ بناتی ہوں۔ ہمارے گھر کا ماحول  
بہت خوش گوار ہے۔ شکر ہے اللہ کا کہ سنے عزت کرتے ہیں۔  
رات میں نے ذرا سکندر کا ساگ پڑھا تو میں نے  
سوچا کہ میں بھی لکھوں کیونکہ مجھے تو خود ساگ بہت پسند  
ہے۔ ہمارے ساتھ والا گھر میری ممانی کا ہے، وہ تو فوت  
ہو چکی ہیں، آج سے دو بیٹے پہلے ممانی کی بیٹی نے ساگ  
بھیجا، بہت خوش ہوئی اب شام کے وقت میں نے ساگ  
کھا یا رات کو میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ میرا بیٹا  
کہنے لگا چلیں امی میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں،  
ہمارے ابدالی چوک میں ڈاکٹر نعیم ہیں شکر ہے، وہ اس  
وقت بیٹھے تھے پوچھنے لگے۔  
”کیا کھایا تھا میں نے کہا ساگ“ اب بیٹا کہنے لگا  
”ڈاکٹر صاحب بھلا ساگ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے میں  
سب کچھ کھاؤں گا ڈاکٹر صاحب کہیں گے ساگ تو سردیوں کا  
کھانا ہے، خون پیدا کرتا ہے اور اس کے ذائقہ بتائیں  
میں کہن وہ کہنے لگے کہ ساگ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔  
اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وہ سب کچھ پیدا نہیں کیا کہ وہ  
سب چیزوں والی چیز ختم کر سکے اگر اللہ تعالیٰ انسان کے اندر  
وہ سب کچھ پیدا کرتا تو انسان نے درختوں کے پتے بھی  
کھا جانے تھے (میں بھلا یہ کیا بات ہوئی) میری بھوئی بھی  
ایسے ہی کرتی ہے ساگ پکا کر فریز کر لیتی ہے اور دوپہر اور  
دشہرہ کی کھانائی ہے۔“

انکشن لگے شکر ہے میں ٹھیک ہو گئی اب آپ یہ نہ سمجھیں کہ  
میں نے ساگ کھانا چھوڑ دیا ہے جی نہیں میں نے دو دن پہلے  
پکایا ہے ہماری کام والی کھتوں سے تو کر لائی تھی لیسن، اور گ  
اور پیاز کا بھجوار، مگر ماگرم ساگ اور اس کے اوپر لیسن اور  
ساتھ ہی کی روٹی، اگر مزہ نہ آئے تو پیسے واپس۔۔۔۔۔  
زندگی کی داستان تو بہت لمبی ہے لیکن اب سب کچھ  
بھول چکی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے اس نے بہت نوازا ہے۔  
یہ نہیں کہ دولت بہت ہے بلکہ یہ کہ سکون ہے۔  
ج: پیاری شہناز! آپ نے ساگ کی اتنی تعریف  
کی ہے کہ ہمارا بھی ساگ کھانے کو دل چاہنے لگا ہے۔  
چھوٹا سا افسانہ قارئین کو اتنا متاثر کرے گا ہمیں اندازہ نہ  
تھا۔ اس افسانہ کی وجہ سے ہی آپ نے ہمیں خط لکھا۔  
بہت دلچسپ خط لکھا ہے آپ نے۔ آپ ہماری اتنی پرانی  
قاری ہیں، ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے ہمیں پہلے  
خط کیوں نہیں لکھا۔ آپ کا خط پڑھ کر میں لگا جیسے سامنے  
بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ اب ہمیں خط لکھتی رہیے گا۔ آپ کے  
خط کے منتظر رہیں گے۔  
رد انور نے لاڑکانہ سے لکھا ہے  
”بن پانچی“ واہ بھی فرح آپ آئی آپ نے تو ہمیں  
جنگل گھاڈالا اس کے لیے بہت شکر ہے اور بات ہو جائے  
”خواب شیشے کا“ بس اس کے لیے اتنا کہوں گی زبردست،  
چھوٹ مندی میں نے یہ کہانی دل سے پڑھی ہے، بہت  
اچھی لگی۔ ”دل سے نکلی دعا“ کے بارے میں بتا دیجیے کہ  
شائع ہونے کے لائق ہے یا نہیں۔  
ج: پیاری ردا! آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں اس  
لیے ان کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں لیکن  
آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کئی احوال آپ کی کہانیاں  
لکھنے کے بجائے کہانیاں پڑھنے پر توجہ دیں۔  
رباب علی خاقان کوٹ پنڈی داس ضلع شیخوپورہ سے  
شریک محفل ہیں  
آپنی میری امی ہمارے بچپن میں ہی انتقال کر گئی  
تھیں تب سے آج تک شعاع، خواتین اور کرن ان کے قدم  
پایا۔ بہت دفعہ دل کی الجھنوں کو ان تحریروں نے کھلایا  
ہے۔ آج صبح کی رات رز کی بات کروں تو ریا کو کوڑہ میں بند

کرنے والی بات ہے۔ میرا حمید اور مرزا احمد کے لیے تو دل  
سے دعا نکلتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ رضا، صائمہ اکرم  
چوہدری، عیسرہ احمد، مصباح نوشین، ام طیفور اور بہت سی  
رائزرز جو اپنی تجارت پر اصلاح کا کام کر رہی ہیں۔  
ج: پیاری رباب! شعاع کی محفل میں خوش  
آمدید۔ جب مجھ سے ملنا جوڑا ہے کے سلسلے میں شرکت  
کے لیے آپ سوالات بھی ساتھ لکھیں۔  
افسانہ یا ناول آپ خط والے لفافے میں بھی بھیج  
سکتی ہیں۔ صفحات زیادہ ہوں تو سادہ خاکہ لفافہ میں ڈال  
کر بھی بھیج سکتی ہیں۔ لفافہ پر پتہ ایڈریس ضرور لکھیں۔  
لائب طارن نے بغبان پورہ لاہور سے لکھا ہے  
میرا نام لائب طارن ہے میں باغیوں کلاس میں پڑھتی  
ہوں۔ ابھی میں چھوٹی ہوں اس لیے ماما مجھے رسالے  
پڑھنے نہیں دیتیں۔ جب میں بڑی ہوں گی تو سارے  
رسالے پڑھوں گی۔ ابھی میں ماما کے لیے پاپا کے ساتھ چا  
کر رسالے لاتی ہوں اور خط پوسٹ کرنے بھی جاتی  
ہوں۔ ماما کہتی ہیں کہ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو پھر بڑی ہو کر  
رسالے پڑھنا۔ ابھی ماما کو نہیں پتا کہ میں نے بھی خط لکھا  
ہے۔ ماما کو بتا چلے گا جب یہ شائع ہوگا۔  
ج: لائب! پیاری گڑیا، بہت سارا پیار۔ آپ نے  
خط لکھا، ہمیں بہت اچھا لگا باغیوں کلاس کی طالبہ ہیں اور  
اتنا پیارا خط لکھا ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ بڑی ہو کر آپ  
بہت کچھ لکھنے والی ہیں۔  
نوزیہ شربت ہانیہ عمران، آمنہ رئیس گجرات  
پیاری سی ماڈل کے ہاتھوں۔ میں۔ بے تاج  
بادشاہ غلاب پسند آئے۔  
حمودت پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ اب تو ہانیہ عمران بھی  
ان کو بہت شوق سے پڑھتی ہے پیاری باتیں۔ بے شک  
ہمیں اسے دے دیں گے کہ شکر کرنا نہیں آتا۔  
دوست میں اب دیکھ خدا کیا کرتا ہے کی ہیر وین کو  
لائسن۔ گورے سال کی بات ہے۔ ہر کسی کی شیرنگ اچھی  
تھی۔ کوڑھ پڑھ رہی ہیں۔ لگتا ہے کوئی جادوئی چراغ  
ان کے پاس ہے اسے ڈھیروں ڈھیر کام کسے کر لیتی ہیں۔  
جہاں سب کے جوابات اچھے لگے نیم کوڑ کی باتیں ابھن



میں ڈال گئیں۔ تجھ سے تانا جوڑا۔ کیا میں اپنی امی کی شادی کا احوال بھیج سکتی ہوں۔

صائمہ اکرم انف..... اتنی جلدی تاول کو سمیٹ دیا ہے۔ اس کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔

”شام کی حویلی“ میں بھی اب کچھ کچھ اچھا لگ رہا ہے، کشف تو اتنا تھوڑے مودے کے پیچھے پڑی ہے۔ ”آس پاس“ دل میں گھر کر گئی سارے کردار۔ ہمارے ارد گرد ہی ہمیں رہ رہے ہیں۔ لیکن بھی یوریت کا احساس نہیں ہوا۔

محبت مجزہ ہے۔ دل کو چھو گئی۔ منشا حسن علی کی تحریروں نے بھی مایوس نہیں کیا۔ ہمارا آشیانہ بھی بیٹ رہا۔ ایسے لگا اپنے محلے کی کوئی عورت اپنے محلے کی داستان شادی ہے۔

افسانے اچھے تھے۔ یار دل دار اس قسط کا موضوع اچھا لگا۔ تیسرا افسانہ ساگ لگتا ہے زرقا سکندر نے وہ ساگ والے لطیفے سے انسپاز ہو کر افسانہ لکھ دیا۔ آئیڈیا پسند آیا ہے۔ غزلوں میں اظہر فرار کی غزل کا یہ مصرع اچھا لگا۔ تیری شرطوں پہ ہی گرتا ہے اگر تجھ کو قبول۔ مگر انہیں ذرا بھی مسکراہٹ نہ لائیں۔

”خط آپ کے“ ہر مہینہ میں محفل خوب سنائی جاتی ہے۔ میں حیران ہوتی ہوں اس میں بھی بہت غور سے تمام شعاع پڑھتی ہوں مگر تمام قارئین ہمیشہ اتنا اچھا لکھتی ہیں اور ایسے پوائنٹ نوٹ کر کے ان پہ تبصرہ کرتی ہیں کہ دل سے داو دیتی ہوں۔ شازیہ طارق کے متعلق جان دلی افسوس ہوا۔

دل سے دعا کی کہ اللہ پاک شازیہ جی کی نینیاں دور فرمائے۔ (آمین)

آج کل مصروفیت بہت ہے امی جی کی ذمہ داری پھر گیس کی لوڈ شیڈنگ آدھے گھنٹے کا کام دو دو گھنٹے میں ہوتا ہے۔ ہمارے پنجاب میں سر دی لکا کے بڑھتی ہے۔ ہمارے ملک کے معصوم وزیراعظم ہا نہیں کہاں اور کس کس کو ایک ایک نوکر اور چار چار سرخیاں دے رہے ہیں۔ اگر آپ کی طرف آئیں تو ہمارا بھی ایڈریس ان کو دے دیتا۔

ویسے بھی جو کچھ نہیں کرتے، وہ کمال کرتے ہیں اور

جو کمال کرتے ہیں، ان کو پتا ہے کمال کیسے دھال کرتا ہے۔ ج: پیاری فوزیہ! عوام لائے یا کوئی اور ”تبدیلی“ تو آچکی ہے۔ اب ہمیں صبر سے اسے برداشت کرنا ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ میں شاید کچھ کی واقع ہو جائے کیونکہ شاید خاقان عباسی نے این ایل جی کا جو معاہدہ کیا تھا، نئی حکومت نے پہلے اس کی پشنت واپس کر دی تھی۔ اور کہا تھا کہ اس میں گرپشن ہوئی ہے اب حسب روایت ایک اچھا یوٹرن لے لیا ہے۔ این ایل جی اب اسی معاہدہ کے تحت منکوار ہے ہیں۔ شاید عوام کی شکایت میں کی واقع ہو۔ تبصرہ تو آپ ہمیشہ ہی تفصیلی اور بہت اچھا کرتی ہیں۔ اس بار بھی بہت خوب ہے۔

فرحانہ مہناز نے جو گھر سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں سال نو کا پیار سا نکل ہاتھ میں، حمد و نعت سے ساعت کو دل افروز سکون میسر ہوا۔ اس کے بعد بڑے شہزاد کی طرف کیونکہ اولاد از گولڈ۔ یہ کہانی آغاز سے ہی دلچسپ ہو گئی تھی۔ ”گماں سے یقین تک“ پڑھنے میں مصروف تھی کہ ایسا نے بتایا۔ ممدودہ اہل رہا ہے تو بھائی بچن کی طرف تین گلوں سے ایک گلو پچا، کم جنوری کی ٹھٹھری صبح بچن بھی دھونا پڑا یہ تھا۔ کہانی پر مجزہ۔ ”محبت اک مجزہ“ بھی اچھی تھی۔ ”آس پاس“ نعیم ناز کا انداز بیان بھی آس رزاقی جیسا ہے۔ گھریلو کہانی کو روانی دی۔ ویسے کہانی تھی دلچسپ۔ ہمارا آشیانہ بھی پسند آئی۔

افسانوں میں یار دل دار بیٹ تھا۔ اور آپی معذرت کے ساتھ ”ساگ“ افسانہ شعاع میں شائع ہو گیا۔ یہ شعاع کا معیار نہیں۔ پلیز مائنڈ نہ کیجیے گا۔ اس ماہ دستک دستک کچھ خاص نہیں لگا۔

ج: پیاری فرحانہ! ساگ افسانہ ہماری تقریباً سب قارئین نے بے حد پسند کیا ہے آپ کو شعاع کے معیار سے کمتر لگا۔ ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ دودھ کے ضیاع کا ہمیں بھی افسوس ہے۔ پھر جنوری کی ٹھٹھری صبح میں بچن دھونا بھی آسان نہیں، اب کیا کہیں، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ شوق کی کوئی نہ کوئی قیمت تو دینی ہی پڑتی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

کراچی سے نسیم کوثر شریک محفل ہیں ایسا لگتا ہے جیسے شعاع کمزور مطلب کچھ زیادہ ہی سلم ہوتا جا رہا ہے اس کی قیمت بڑھادی جائے تاکہ کچھ تو فریہ ہو جائے۔ اس دفعہ شعاع میں سب سے بہترین ناول نعیم ناز سلطان کا ”آس پاس“ لگا خوب صورت اور مزیدار کہانی نے دل خوش کر دیا۔ مصنفہ کو بہت بہت مبارک باد۔ اسی طرح ہمارا آشیانہ نمبرین دلی نے بھی بہت خوب لکھا۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے علاوہ منشا حسن علی کا محبت مجزہ بھی بہتر رہا۔ مگر صائمہ اکرم کے شہزاد کی تو کیا بات ہے۔ رخسانہ گارعد خان بھی شام کی حویلی اچھے انداز سے لے کر چل رہی ہیں۔ افسانوں میں زرقا سکندر کے ساگ نے خوب مزہ دیا ہمارے ہاں بھی ساگ شوق سے کھانا تو جاتا ہے مگر بچوں کا وہی انداز ہوتا ہے جو کہانی میں بیان کیا گیا اور جناب انہیں قسم کے یار دل دار کی بات ہی نہ مانی ہے ان کی اسٹوری میں تو حوازی مزہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ منشا شری نے آئینہ دل و حل گیا، اچھا لکھا ہے۔ گزرتے سال کی بات ”اس پر مروتے اچھا رہا مگر کائی تم بہنوں کے سروے تھے اور اس دفعہ تجھ سے تانا جوڑا میں اربند شاپین کی دکھ بھری داستان پڑھ کر بہت افسوس ہوا اللہ تعالیٰ اس لڑکی کی پریشانیاں دور کرے۔

ج: پیاری نسیم! آپ نے درست کہا، کاغذ کی قیمت میں اضافہ کا تقاضا یہی ہے کہ پرچے کی قیمت میں اضافہ کر دیا جائے لیکن قیمت میں اضافہ ہماری کچھ قارئین کے لیے گراں ثابت ہو گا۔ اس لیے جب تک ادارہ برداشت کر سکتا ہے۔ ہم قیمت برقرار رکھے ہوئے ہیں ورنہ کاغذ کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور ”تبدیلی“ کے خوفناک اثرات نے روپے کا جو حشر کیا ہے، اس کے بعد موجودہ قیمت برقرار رکھنا ہمارے لیے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تھوڑے دل سے شکریہ۔ نعیم ناز بہت اچھی مصنف ہیں۔ ہم ان تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ ثانیہ صدیقی نے ریال خورد، ادا کاڑھ سے لکھا ہے سب سے پہلے شہزاد پڑھا۔ ہادی اور در شہوار اک ساتھ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اچھا لگا۔ ارتضیٰ کے لیے برا لگا لیکن بھی کیا کر سکتے ہیں۔ ہم نے تو شروع سے ہی شہزاد کا رشتہ ہم زاد کے ساتھ پکا کیا ہوا ہے۔ پر اک بات پوچھنی تھی کہ جب لڑکی کا نکاح اس کے ولی کے بغیر نہیں ہو

سکتا تو کہانیوں میں کیوں ہو جاتا ہے۔ مکمل ناؤز دونوں ہی زبردست تھے۔ ”آس پاس“ اچھی تحریر لیکن غصے والی دادیوں کے بارے میں پڑھ کے مجھے ہمیشہ اپنی بے بے (دادی) یاد آتی ہیں میں ان کی محبت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی مگر اپنے سب پوتے پوتیوں سے زیادہ انہوں نے مجھے اپنے پاس رکھا (گرمیوں کی چٹھوں میں) اور گڑوں میں گزرتے میرے بچپن کے دن بس دادی ہو تو میری بے بے جیسی۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین

”گماں سے یقین تک“ بھی اچھا ناول تھا پر کیا واقعی اس کے تھوڑا سا بھی آس پاس رٹل لائف میں ہوتا ہے مطلب چلو چھوڑو جی۔

ناولت بھی دونوں اچھے تھے۔ ”محبت مجزہ ہے“ اچھا تھا مگر ایک لائن اوپر والا ہی کمٹ۔ ”ہمارا آشیانہ“ زبردست۔ خاص کر یہ فقرہ پڑھ کے بہت حرا آیا ”پلیز ابھی اندر مت جا کیں اندر میرے اور.....“ اور ”آس پاس“ کو پسند کرتا ہوں۔

”یار دل دار“ پورے شعاع کی جان۔ دوتی زندہ باد۔ یار دل دار پڑھ کے تو میں آپ کی فین ہو گئی ہوں ”افشین“۔ ”ساگ“ سعد کو تو پھر بھی بس ناشتے، دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے میں ساگ نظر آتا ہوگا۔ ہمیں دیکھو کہ گھر سے نظر آتا بند ہوا نہیں تھا کہ شعاع میں بھی فہرست پر نظر دوڑانے پر ساگ اف..... ساگ..... میرا بس چلے تو ایک دفعہ میں ہی دنیا کا سارا ساگ پکا کر ان سب کی دعوت کر ڈالوں جن کو ساگ پسند ہے تاکہ روز روز سے تو جان چھوٹے۔ (اف تو بہ ساگ اور سردیاں ایسے جڑی ہیں جیسے ”تجھ سے تانا جوڑا ہے“ اور دکھ)

جب تجھ سے تانا جوڑا ہے اس دفعہ تو پڑھ کے دل کانپ کانپ گیا۔ اللہ نے ضرور آپ کے لیے کچھ بہترین رکھا ہوگا اس لیے تو ایسے لوگوں سے جان چھرائی۔







پہلے بھی ایک شادی تھی انہوں نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا  
گیارہ بجے شیطانی آواز گانے شروع ہوتے رات دو تین  
بجے تک نذر حرام نماز پڑھنا عذاب۔ جنوری کا شمار ہیر و کن  
کا بس گلدستہ سی دیکھا کیونکہ پھولوں سے ہمیں عشق ہے لیکن  
اکیسویں صدی اور ریٹ کے دور نے پھولوں اور پودوں کی  
کاشت ہی مانو! ختم کر دی ہے۔ چارے جیسے خوابوں خیالوں  
میں پھول پودے دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ شام کی حویلی  
رخسانہ نگار کا تو نام ہی کافی ہے۔ ”شہر زاد“ منسی خیز موڑ پر  
پہنچ چکا۔ ساگ پڑھ کے سردیوں کا مزہ آ گیا۔ ہمارے ایک  
بھائی کا بھی یہی حال ہے۔ ساگ دیکھ کے کہتا ہے یہ چارہ تم  
کیسے کھاتے ہو۔ ساگ مجھے ہضم نہیں ہوتا لیکن کھانا نہیں  
چھوڑتی۔ سردیوں کا مزہ تو ساگ، سہاگنا، مالے، موگ، پھلی،  
گجیر، ملا، سوسن، طوہ میں ہے کبل، رضائی میں گھس کے مطالعہ  
کرنا اور ساتھ میں کشمیری چائے یا کافی واہ! کیا مزہ ہے۔  
رائز ڈسمبر کو اداس قرار دیتی ہیں لیکن ڈسمبر کا بھی اپنا مزہ ہے۔  
مجھے تو خزاں کا موسم بھی بہت اڑیکٹ کرتا ہے ٹنڈ منڈ  
درخت، پیلے پتے دھند کا موسم۔ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ہر  
موسم سے نوازا ہے۔ ہمارے ماموں کراچی میں رہتے ہیں۔  
ان کے بیٹے کی شادی ہے اگر کراچی آنا ہوا تو آپ کے  
دولت خانے پر ضرور حاضری دیں گے۔

ج: بنت مریم! آپ کے خط ہمیں موصول ہی نہیں  
ہوئے تو جواب کیسا؟ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے خط ہم  
تک نہ پہنچ سکے اور آپ کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

سائرہ رضا مذہب سے بہت قریب ہیں اور ان کی  
شخصیت اور تحریروں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ صرف میوزک  
کے بارے میں ان کے خیالات جان کر رائے قائم نہ کریں۔  
کراچی میں تو موسم کے رنگ کی ہی نظر آتے ہیں  
لیکن ہمیں بھی سارے ہی موسم اچھے لگتے ہیں۔

آپ سردیوں سے لطف اندوز ہوں۔ کراچی میں تو  
سردی بس جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔  
کراچی آئیں تو ضرور تشریف لائیں۔ ہمیں آپ  
سے مل کر خوشی ہوگی۔

شاز یہ ہاشم سواتی کھڈیاں خاص قصور سے شریک محفل

ہیں، لکھا ہے

پہلی شماع کو پڑھا۔ آپ نے حقیقت بیان کر  
دی۔ لوزن ب بہنا، آپ کی محبت میں ڈوبے الفاظ والی حمد  
شائع ہوگئی۔ بہت پیاری، اب تو خوش ہو جاؤ! جو ماہر  
القادری کی یہ نعت لکھی تھی ہے کیا یہ۔ الطاف حسین  
حالی کی نہیں ہے؟ بہر حال نعت مبارکہ پڑھتے ہوئے  
پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں پڑھ کر  
رب تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرتے ہوئے فوراً  
چھٹانگ لگائی شہر زاد کی طرف..... ہادی کے دل میں  
سوٹ کارنر پیدا ہوئی گیا درہواری کے لیے..... ہادی کا  
تعلق کہیں خاقان فیلی سے تو نہیں؟ چلیے دیکھتے ہیں

”شام کی حویلی میں“ اچھا جا رہا ہے۔ کیا حیدر زنب سے  
محبت کرتا ہے اور کشف پنا نہیں کیا گل کھلانے کی؟ ”محبت  
اک مجرہ ہے“ زبردست پارائیند بہت اچھا ہوا۔ منشا حسن  
علی کی تحریر بہت اچھی ہوتی ہے اور ہیلے کے کیا کہنے تھے۔  
”آس پاس“ نعیدہ آئی! انٹر سٹنگ اینڈ ونڈر فل۔ خاص  
طور پر رحمت اور بلال کی نوک جھونک اور ان کی دادی کا  
پیار، میری دادی اتنی اچھی تھیں کہ میں الفاظ میں ان کی  
تعریف نہیں کر سکتی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ خط آپ  
کے بہت اچھا لگا، خاص طور پر ارجمند کا۔

ج: پیاری شاز یہ! بہت خوشی ہوئی کہ شماع آپ کو  
پسند آیا۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ  
معنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ جنوری کے شمارے میں نعت  
الطاف حسین حالی کی نہیں ماہر القادری کی ہی ہے۔

ثناء ذوالفقار، نورے والی رحیم یار خان سے لکھتی ہیں  
ناگنل پیارا تھا۔ ہاتھ میں پھول لیے ماڈل پیاری  
لگ رہی تھی۔ حمد اور نعت پڑھنے کے بعد احادیث  
پڑھیں۔ ”رسک“ میں فائزہ حسن کو پہلے پڑھا۔ ویسے  
انہیں کبھی ہی دی میں نہیں دیکھا۔ جیسی جھٹری سے ملاقات  
اچھی تھی لیکن بہت مختصر تھی۔

”گزرے سال کی بات“ سروے میں سب کے  
جواب اچھے لگے، کوثر خالد نے آخر میں جو اشعار لکھے، وہ  
بہت پسند آئے۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ ارجمند کا ناتا  
پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔

منشا حسن علی کا کافی عرصے سے انتظار تھا سال کے  
شروع میں منشا حسن علی کی تحریر بھی آخر کار شائع ہوئی تھی۔  
منشا حسن پھولوں، خوشبوؤں کی رائٹر ہیں۔  
”آس پاس“ بھی سادہ سی اچھی تحریر تھی۔ رحمت  
پکانے کی شوقین نعت اور کھانے کا شوقین بلال ان کی  
جوڑی تو بنی بنائی تھی۔ باقی جوڑیاں بھی اچھی تھیں۔  
”گمان سے یقین تک“ صدف ربیعان نے بہت  
اچھی لکھی۔ ”ساگ“ یہ تو ہمارے ہی گھر کی کہانی لگتی ہے۔  
ہمارے گھر بھی ہر دوسرے دن ساگ پکنا ہے جو میں  
بالکل بھی نہیں کھاتی لیکن باقی گھر والے جو کہ بہن امی اور  
ابو ہیں، وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں اور ایک دوسرے  
کے گھر تو ساگ ایسے بھیجا جاتا ہے جیسے قورمہ ہو۔  
”آئینہ دھل گیا“ اور ”یار دل واڑ“ بھی اچھے  
افسانے تھے۔ ”شماع کے ساتھ“ سلسلہ تھوڑے عرصے  
بعد کہاں غائب ہو جاتا ہے۔

ج: پیاری شاز! ساگ مختصر سا افسانہ ہماری قارئین  
کو بہت اچھا لگا شاید اسی لیے کہ یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔  
شماع کی پسندیدگی کا جان کر خوشی ہوئی۔ آئندہ بھی خط لکھ  
کر اپنی رائے کا اظہار کیجیے گا۔

رفعت امین، مظفر کو لونی، انگریزیاں نوالہ (جھنگ) سے  
ماہرینڈیر نے بھاگنا نوالہ سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں  
ناگنل بہت عمدہ تھا۔ ہاتھوں پر ہندی بہت اچھی لگ رہی تھی۔  
”حمد“ اور نعت سے فیض یاب ہوئے۔ زنب پور  
مبارک ہو چکی۔ آپ کی ”حمد“ دیکھ کر بھائی کو کتنے والٹ کا  
کرنت لگا؟ ہا ہا ہا۔

”پیارے نبی کی پیاری باتیں“ پسندیدہ سلسلہ  
ہے۔ ”دستک“ فائزہ اور منی سے مل کر اچھا لگا۔

سروے میں سب بہنوں کے جوابات شان دار  
تھے۔ میں نے تو سروے بھیجا ہی نہیں مگر اک سوال کا  
جواب دے دتی ہوں کہ پچھلے سال کی جو تحریر مجھے سب

سے زیادہ اچھی لگی دو تھی ”شب تاب“ مہوش افتخار ف  
سیف علی جنگ کی آنکھیں اور ”بن یا کچی“ بھی۔ ان  
دونوں رائز ڈسمبر کی طرف سے بہت بہت تعریف۔  
بات ہو جائے سلسلہ وار ناول کی تو ”شہر زاد“ بہت  
اچھا ناول ہے۔

”شام کی حویلی“ بہت مزے کا ناول ہے۔  
”شہر زاد“ ختم ہو رہا ہے تو پلیز فرزانہ کھل یا  
میرا حمید سے ناول لکھوا لیں تا پلیز پلیز پلیز۔  
”آئینہ دھل گیا“ حنا بشری اچھا لگا۔

”ساگ“ زرقا سکندر، ہا ہا میری اماں جان کو بھی ساگ  
بہت پسند ہے۔ سعد تیرے غم میں، میں برابر کی شریک ہوں  
میرے بھائی، کیا کریں اب سردیوں کی سوغات جو ہوئی۔  
”محبت ایک مجرہ ہے“ منشا حسن ناگس۔

ج: پیاری ماہر! آپ نے پورا شماع پڑھ کر ہمیں  
تفصیلی خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت اچھا خط لکھا  
ہے۔ افسوس کہ نعت کی کمی کے باعث شائع نہ کر سکے۔  
کران میں ”مقابل ہے آئینہ“ کے لیے آپ دوبارہ نہ  
بھجوائیں باری آنے پر آپ کا سلسلہ شامل ہو جائے گا۔

فرح صبغت اللہ علوی اور سندس صبغت اللہ علوی نے چاہ  
حکیم ضلع پاک پتن

2018ء میں مسلسل تعلقات جینے کے بعد مسلسل ہی ناکامی  
کا سامنا ہوتا آپ کو ہماری کیفیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔  
ہم نے سوچا کہ اگر ہم کراچی میں ہوتے تو سائرہ  
رضا کی طرح آپ کے آفس میں خود ہی آ جاتے۔ کیا  
ہماری کہانیاں موصول ہوگئی ہیں؟

ج: فرح اور سندس اشعار کی محفل میں خوش آمدید۔  
آپ کی کہانیاں موصول ہوگئی ہیں۔ ابھی پڑھی نہیں گئیں۔



ماہنامہ خواجین، ڈائجسٹ اور ادارہ خواجین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچن ماہنامہ شماع اور ماہنامہ کران میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے  
حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی قسم کی کاپی یا ڈیجیٹل یا فوٹو یا اور ایسی شکل  
اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لانا ضروری ہے۔ صورت دیگر ادارہ یا فوٹو یا ڈیجیٹل یا فوٹو یا اور ایسی شکل



# جب تجھ سے اتنا جوتا ہے

عارف عثمان

(1) ”شادی کب ہوئی؟“

”میری شادی ستمبر 2013ء کو عید کے روز اہل گویا ہو گئی، پھر تو جیسے سادہ سی زندگی نے گویا بہاروں رنگ اوڑھ لیے۔“

(2) ”شادی سے پہلے مشاغل دو لچپیاں؟“

”میری شادی، تیس برس کی عمر میں ہوئی تو تب تعلیم کے علاوہ سارے مشاغل دو لچپیاں پچکانے ہی ہوا کرتی تھیں۔ میں بہنوں میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہوا کرتی، تو کسی قسم کی روک ٹوک یا پابندی نہ تھی، بس بے فکری تھی، ہاں جانوروں سے لگاؤ کے سبب شادی سے پہلے چکور پالنا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا، تاہم شادی کے بعد مصروفیات بڑھنے کے باوجود مور اور دوسرے پرندے پال کر اپنا یہ شوق پورا کرتی ہوں۔“

(3) ”رشتے میں مرضی شامل تھی یا بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟“

”خیر مرضی کے بغیر تو یہ ممکن نہ تھا ہاں درحقیقت یہ بڑوں کا فیصلہ تھا جس پر ہم نے خاموشی سے سر جھکا کر رضامندی دے دی۔ جوڑ کی اپنی پسند کا ایک عدد جوڑا، اپنے کلاس کے بچکٹ تک بڑوں کی رائے کے بغیر نہ دیا۔ زندگی کا انتقال ہم فیصلہ کیے بغیر نہ کرتے۔“

(4) ”ہاں، سسرال والے؟“

”ہاں، سسرال والے۔ سسرال والے کا خیال تھا کہ میں تو سسرال کی عورت ہوں، اس لیے وہاں کے رواج اور رسم و رواج سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔“

(5) ”سسرال والے؟“

”سسرال والے کا خیال تھا کہ میں تو سسرال کی عورت ہوں، اس لیے وہاں کے رواج اور رسم و رواج سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔“

بدلنے پر ملک و قوم پر رونما ہوتی ہیں۔ وہی شادی کے بعد پھر چاہے لڑکی ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے میں ہی بیاہ کر چلی جائے بہر حال تبدیلی تو آئی جانی ہے۔ تو سمر وقاعت (جو کہ پہلے بھی شخصیت کا خاصا

تھی) اب ایک ننھراؤ، مزاج میں فرق کے باوجود ایک فیملی اور ان کی ویلوز کو ایک کسپٹ کرنا، اپنے مزاج اور سوچ کی تبدیلی سے لے کر ماں بننے کے بعد، بھی تبدیلیاں ہی تبدیلیاں، تبدیلی تو انسانی فطرت ہے۔ ورنہ ساکن تو جمیل بھی جو ہر بن جانی ہے۔“

(11) ”شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟“

”کچھ پکانی کے رسم کے فوراً بعد ہی، فیملی کی بڑی بہو ہونے کے ناتے فوراً ہی میزبانی کے سونپ دی گئی اور پھر مہمان کی تربیت اور سسرال والوں کے تعاون کے سبب تمام مراحل خوش اسلوبی سے ہو گئے۔“

(12) ”میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟“

”کھانے پکانے کے انداز، ذائقے سب ہی تقریباً مختلف تھے، ہم مری ہیں اور مری بنیادی طور پر مکروہوں کے شوقین ہوا کرتے ہیں۔ جبکہ میرے میکے (میرے میکے سسرال دونوں مری ہیں) میں یہ اہمیت و اہمیت میٹ کو حاصل ہے۔ تو بھی بہت فرق ہے، وہ سادہ کھانے پکانے اور کھانے کے عادی اور ہم ایسا کسی کے شوقین، تو اس حساب سے کافی مختلف پایا۔“

(13) ”سسرال سے وابستہ توقعات؟“

”نا بابا تا سسرال سے کوئی توقعات وابستہ نہیں کیں اور نہ ہی کرنا چاہئیں بلکہ کسی بھی انسان کو کسی دوسرے سے توقعات رکھنی ہی نہیں چاہئیں بس اللہ پر توکل رکھنا چاہیے۔ وہی بہترین کار ساز ہے۔“

(14) ”بچوں کی پیدائش؟“

”شادی کے ایک سال بعد مقہوم کی پیدائش،

گویا قدرت کا بہترین تحفہ تھی۔ تخلیق کا عمل اور بچوں کی پیدائش ایک ننھن مرحلہ ہے اور اس مرحلے سے گزر کر ہی تو عورت اس اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتی ہے۔“

(15) ”جوائنٹ فیملی سسٹم یا علیحدہ رہنا؟“

”جوائنٹ فیملی سسٹم، اور شروع سے ہی ہر لڑکی کی طرح میری بھی یہی خواہش تھی کہ بھرپور سسرال اور بے تحاشا محبت کرنے والے رشتے میں۔ تاہم وقت کے ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ اپنے بچوں کی تربیت اور انہیں ایک ان ڈیپنڈنٹ زندگی گزارنے کے لیے بھیجی بھی انسان کو بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ایک ایسا ماحول جہاں وہ اپنی غلطیوں سے سیکھے، اپنے حوصلے اور لگن سے ہر رکاوٹ عبور کر کے اپنی منزل پالے۔“

تو یہ کہنا کہ وقت کے ساتھ انسان بدل جاتا ہے یا اس کی ترجیحات تو بے جا نہ ہوگا۔

(16) ”سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کی؟“

”تبدیلی وقت کا خاصا ہے تو جی مجھے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آخر میں حالات سے انسان کو گھبراتا نہیں چاہیے، کیونکہ گپ اندھیرے کے بعد ہی سورا ہوتا ہے۔ اور مشکلات کا کیا ہے یہ تو حالات سے نہیں بلکہ خیالات سے پیدا ہوتی ہیں تو مثبت سوچیں۔ کسی کی کا دل نہ دکھائیں اور ہمیشہ خوش رہیں۔“

☆

دستِ مہیا

گہیمیا

تہ 400 روپے

شمارہ نمبر 37 - 32735021 فون نمبر



## جب تجھ سے تانا بھرتا ہے

سب سے پہلے تو میں گزارش کرتی ہوں کہ اس انٹرویو کو ضرور چھاپے گا اور جلد میری بیٹی انیلا طالب مجھ سے پوچھ پوچھ کر بڑے اصرار سے لکھ رہی ہے حالانکہ وہ بہت بیمار ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ابھی رات کو اسے ڈرپ لگی تھی۔

میں نے اس سے کہا ”پتا نہیں شائع ہوگا یا نہیں؟ پھر کیوں تم اتنی محنت کر رہی ہو؟“

اس نے بہت یقین اور اعتماد سے جواب دیا امی جی، شعاع دوسروں سے بہت مختلف ہے وہ ضرور شائع کرے گا اور آپ دیکھ لینا کیا پتا اگلے مہینے ہی آجائے۔“

اب دیکھیں شائع ہوتا ہے کہ نہیں۔

س: ”شادی کب ہوئی؟“

ج: ”23 مارچ 1997ء۔“

س: ”شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے۔ شادی کے بعد کیا تبدیلی آئی؟“

ج: ”شادی سے پہلے میں فلمیں ڈرامے اور ڈائجسٹ کی بہت شوقین تھی، اخبار جہاں وغیرہ میں یا کہیں بھی گچی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتی۔ والد کے ریڈیو پر سونگ دھری اور ترجمان پروگرام سننا بہن بھائیوں سے شرارتیں کرنا میرے مشاغل تھے۔ شادی کے بعد سب ہی تبدیل ہو گئے بلکہ رہے ہی نا۔“

س: ”کیا شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی؟“

ج: ”جی بالکل، میرے والد نے انتہائی مذہبی ہونے کے باوجود سب بچوں سے مرضی پوچھی پھر بیابا..... اس لیے میری مرضی جان کے ہی شادی ہوئی۔“

س: ”جیون سماجی کے حوالے سے تصور؟“

ج: ”سچ پوچھیں تو اتنی اچان عمر تھی تب ہی تو اثنا اندازہ نہیں تھا ویسے خواہش تھی کہ میرا جیون سماجی پینٹ کوٹ میں لمبوس ہاتھ میں بریف کیس تھا ہے

آفس جانے والا ہوں اچھا ہوں آفس جانے والا تو نہیں ملا لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ عزت پانے مل گیا جس کے لیے میں رب کی شکر گزار ہوں۔“

س: ”معتنی کتنا عرصہ رہی؟“

ج: ”تقریباً ایک برس۔“

س: ”شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟“

ج: ”نہیں جی بالکل کچھ نہیں، بہت عمدگی و عافیت سے انجام پائی۔“

س: ”شادی کی رسموں کے دوران لین دین کوئی جھگڑا؟“

ج: ”شکراً الحمد للہ..... ایسا کچھ نہیں ہوا کہ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“

س: ”شادی کے بعد شوہر نے پہلی بار دیکھا کیا کہا؟“

ج: ”میرے سر تاج اتنے سادہ ہیں کہ جن کے لیے یہ بی کہا جاسکتا ہے۔“

س: ”اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا انہوں نے بھائیوں کے کاروبار کا پوچھا اور کہ پاپا کیا کرتے ہیں۔“

س: ”شادی کے بعد سسرال والوں کا رویہ کیا تھا؟“

ج: ”اچھا تھا مگر سسرال سسرال ہوتا ہے وہاں میکے والا رویہ تو نہیں ہوتا نا..... پھر بھی محنت کی دل برداشتہ نہ ہوئی اور آہستہ آہستہ کچھ بہتر ہو گیا۔“

س: ”شادی کے کتنے عرصے بعد کا سنبھالا؟“

ج: ”ڈیڑھ مہینے بعد میں نے کام سنبھالا۔“

س: ”معاظے میں میں اتنا ڈیڑھی گھر یعنی میکے بڑی باجی اور بھابھیاں تھیں۔ میں نے تو ایف اے کتائیں ابھی لی ہی تھیں کہ شادی ہو گئی، کاموں کے

## اب ہر دن خوبصورت

## مکمل تحفظ مکمل تازگی



GIRL  
TALK

f facebook.com/GirlTalk.by.Butterfly

BREATHABLES





نعیمہ ناز

## سے ستر سکا

مخل کے گاؤں سے فیک لگائے انہوں نے ابھی آنکھیں موندی ہی تھیں کہ ماریہ آ کر دم سے تخت پر بیٹھی۔ انہوں نے چونک کر ایک دم آنکھیں کھولیں۔  
 ”کیا آفت ٹوٹ پڑی جو یوں بھاکم بھاگ آ رہی ہیں شہزادی؟“ یہ ان کا مخصوص طنز یہ انداز تھا۔ جو فقط سب سے چھوٹی اور سب سے زیادہ لاڈلی پونی کے لیے مخصوص تھا۔  
 ”وادی! شہزادی یہ برا وقت آنے والا ہے۔“ ماریہ بے چارگی کی محسوس تصویر بن گئی۔  
 ”کس کے دامن کے ہیرے موتی چرا لیے؟“ وادی سیدھی ہوئیں۔  
 ”اس سے بھی زیادہ قیمتی۔“ وہ وادی کے نزدیک ہوئیں۔  
 ”جئے کی دال کا حلوہ تھانا، آخری دوپٹے بچے تھے، مانی بھائی کے لیے، امی نے رکھے تھے، وہ میں نے کھا لیے۔“ ماریہ کے آخری جملے میں پوری بات کا نچوڑ تھا۔



”آہا، گلے پر نہیں پڑتی تو بھی پڑ۔ موا زبان کا چٹا راسی ختم نہیں ہوتا۔ ماں دو چار باتیں سنائے گی۔ اب بیٹھ کر سننا۔“ دادی نے تنبیہ لگا ہوں سے اسے دیکھا۔

”امی نے مانی بھائی کے لیے وہ حلوہ منگوایا ہے مجھ سے۔ ماریہ نے بیچ لائن اب بیان کی تھی  
”ماں کو بتا دیجی کہ میں نے پیٹ میں ڈال لیا وہ حلوہ۔“

”بتانا آسان ہوتا تو کیا بات تھی۔ آپ کو معلوم تو ہے کہ وہ مانی بھائی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی ماں ہیں۔ ہر اچھی چیز میں سے ذیل حصہ ان کے لیے نکالتی ہیں۔“ اور اکثر اپنے منہ کا بھی انہیں ہی کھلا دیجی ہیں۔ اگلوٹا ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اولاد کے ناجائز لاڈ اٹھائے جائیں، کیوں دادی۔“ ماریہ نے ایک جذباتی مگر مختصر تقریر کی

”اللہ جانے بیٹا، یہ تمہاری ماں کے ہی چو نچلے ہیں، بیٹے کو اگلوٹا، اگلوٹا کر کے، ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا ہے۔ ہمارا بھائی، سات بہنوں کا ایک بھائی تھا۔ تمہارا باپ بھی تین بہنوں کا ایک بھائی، ہمارے والدین نے یا ہم نے تو بھی ایسے چو نچلے نہ کئے بیٹے کے۔ نہ ایسے اللہ آمین کر کے پالے۔“ دادی سیدھی ہو بیٹھیں۔

”نانا نے اپنی بیٹی کو یہ نہیں سکھایا کہ ساری اولاد کے حقوق برابر ہوتے ہیں اور سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھنا چاہیے اور ایک ہی لاشی سے ہانکنا چاہیے، یہ تھوڑی کہ ایک کے لیے تحمل کی چٹری، دوسرے کے لیے نرم کی۔

”تو بی بی اس میں تمہارے نانا بے چارے کا کیا قصور۔ اللہ بخشے وہ مرحوم تو نہ تین میں نہ تیرہ میں، یہ تربیت کرنا تو ہماری جنت مکانی بھوج کا کام تھا۔“ دادی کو اپنے بھائی کی شان میں پوتی کا تبصرہ کچھ ناگوار گزرا۔  
”ماریہ، ماریہ۔“ ماریہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ امی کی آواز آئی جو اسے ہی پکار رہی تھیں۔ اس نے فوراً لب سمجھ لیے اور مدد طلب نظروں سے دادی کی طرف دیکھا۔

”مانی کے لیے جو حلوہ رکھا تھا، وہ کہاں ہے۔“ انہوں نے دادی کی تقریباً گود میں گھسی بیٹی کو گھورا، بیٹی کے چنور پن سے خوب واقف تھیں۔

”وہ مانی کے لیے رکھا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی، میں نے کہا۔“ دادی بڑی مصومیت سے فوراً پوتی کی آڑ میں گئیں جیسے کہ وہ ہمیشہ اسے بچاتی تھیں۔ آخر وہ اتنی امیدیں لے کر دادی کے پاس آئی تھی۔

”آپ کا بھی جواب نہیں ہے اماں! پرسوں ذرا سا کھڑا کھایا تھا تو پیٹ خراب ہو گیا اور اب پورے دوپہر کھالے۔ طبیعت خراب ہوئی تو آپ کے بیٹے میری جان کھاتے ہیں کہ میں لا روائی دکھائی ہوں، آپ کو پرہیز نہیں کراتی، کھانے پینے کا دھیان نہیں رکھتی۔“ بہو صلبہ جو خیر سے ان کی سگی بیٹی تھیں، جھنجھلا گئیں۔

”اب مانی بیٹا انتظار کر رہا ہے۔ اس کا موڈ خراب ہوگا۔“ دادی، پوتی کی معنی خیز خاموشی پر وہ کچھ خفگی سے بڑبڑائیں۔

”تمہارے تو یاسیں ہاتھ کا کھیل ہے یہ حلوے مانڈے بنانا، اور بنالینا، جس کے نصیب کا رزق تھا اس کے پیٹ میں گیا، بس ختم کرو معاملے کو۔“

”بھی تھا یاسیں ہاتھ کا کھیل اماں، اب نہ وہ عمر رہی نہ صحت، اب کی بار حلوہ بنایا تو بھونٹے بھونٹے بازو اور کندھے شل ہو گئے، جنہ سے باقی کام کروایا ابھی تک درو گیا تھوڑی۔“ وہ بولتی ہوئی تخت پر ٹک گئیں۔

”تو کچھ دوا درو کرتیں، تم تو شروع سے ہی لا پرواہ ہو اپنی صحت کے معاملے میں، جب کہ بزرگوں کا کہنا ہے کہ جان ہے تو جہاں ہے۔ صحت اچھی ہو تو سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ انسان پوری دنیا کا بوجھ بھی اپنے کاندھوں پہ

اٹھالے، ذرا سی کوئی تکلیف ہو تو اپنے آپ سے بھی سچے زاری ہونے لگتی ہے، تم ٹھیک ہو گی تو گھر اور گھر والوں کا دھیان رکھو گی نا۔ ساس کے لہجے میں اپنی عزیز از جان بیٹی، بہو کے لیے حد درجہ تشویش تھی جو وہ اکثر ظاہر کرتی تھیں

”تم ذرا جا کر مانی کو بتادو کہ حلوہ ختم ہو گیا ہے، وہ وہاں بیٹھا انتظار میں سوکھ رہا ہے۔“ امی، ماریہ سے مخاطب ہوئیں

”میں نہیں جا رہی، وہ تو فوراً مجھے ہی بلیم کریں گے کہ تم نے ہی کھایا ہوگا۔“ ماریہ ہنوز دادی کے گھٹنے سے لگی بیٹھی تھی۔

”اگر وہ ایسا کچھ کہے گا تو غلط نہیں ہوگا، دونوں دادی پوتی کو اچھی طرح سمجھتی ہوں میں۔“ امی نے جتنی ہوئی نظروں سے دونوں کو دیکھا، دادی کے چہرے پر بے ساختہ سکر ایٹ سی پھیل گئی، ماریہ کھسیانی ہو گئی۔

”بیٹھے، یہ یہاں ہیں، ہم وہاں دیدہ و زبان فرش راہ کیے بیٹھے ہیں اور آپ یہاں آ کر بیٹھ گئیں۔“ مانی انہیں ڈھونڈتا جھپٹے برآمدے میں ٹھیک جگہ آیا تھا۔

”دادی حضور یہ آپ کا تخت ہے یا کوہِ ندا، جو یہاں آتا ہے پھر واپس نہیں جاتا، یہیں کا ہو رہتا ہے۔“ مانی بڑے مزے سے بولتا ہوا خود بھی ان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔

”ماشاء اللہ حیران ہوں سن کر، ہماری نئی تانہی (سل) کوہِ ندا سے واقف ہے۔“ دادی مسکرائیں۔

”جس کی آپ جیسی دادی ہو، وہ ان سب سے واقف کیوں نہیں ہوگا، ہمارا تو بچپن ہی کہانیاں سننے گزرا ہے۔“ ہفتے کے سات دن، سات قسم کی کہانیاں، ایک دن اسلامی، ایک دن الف لیلہ ٹاپ کی کوئی کلاسک، ایک دن جانوروں کی، ایک دن پرندوں کی۔

”ایک دن فلمیں بھی تو سنتے تھے۔“ ماریہ نے لقمہ دیا۔

”تم بہن بھائیوں کی شرافت تھی بیٹا جو آرام سے بیٹھ کر وہ سب سنتے تھے، اب تو ہم کسی بچے کو کہانی سنائیں تو اول تو نچلے بیٹھے ہی نہیں، بیٹھ بھی جائیں تو کہتے ہیں، موبائل پہ کہانیاں سنائیں، اس میں تصویر بھی آتی ہے ہم تو بھی اب اپنا سامنے لے کر رہ جاتے ہیں۔

”امی! میرا حلوہ۔“ مانی نے دہائی دی۔

”حلوہ ختم ہو گیا۔“ امی نے نرم لہجے میں مختصر اُبتایا۔

”ختم ہو گیا کر دیا، اس بیٹی نے کھایا ہوگا، میری جان کی دشمن، میری صحت کی دشمن۔“ مانی نے اس کی گھسی، چھوٹی سی پوتی نیل بیٹھی۔

”میں کیوں ہوئی، تمہاری جان کی دشمن، تم خود سب سے بڑے دشمن ہو اپنی صحت کے اور جان کے، نہ کھانے سے اتنے لوگ نہیں مرتے جتنے زیادہ کھانے سے مرتے ہیں، پیٹ، سدا کا بھوکا۔“ ماریہ نے ترنت حساب بے باق کیا۔

”یاسیں ہائیں بیٹا! یہ کیا زبان استعمال کی، بھلا اس طرح بات کی جاتی ہے۔ مانی بیٹا، تم بھی ذرا شرافت دامن ہاتھ سے نہ ہی جانے دو تو بہتر ہے۔“ دادی نے دونوں کو تنبیہ کی۔

”اب تم دونوں یہاں سے اٹھو، مجھے اماں سے کچھ بات کرنی ہے۔“ امی نے دونوں کو وہاں سے بے دخلی کا نوٹس جاری کیا۔ خلاف توقع بڑی شرافت سے اٹھ کر دونوں چل دیے۔

”جنم کے لیے جو رشتہ ہم لوگ دیکھ کر آئے تھے، اسی کے بارے میں بات کرنی تھی۔“ وہ اپنی ساس سے



مخاطب ہوئیں۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں آپ کے لیے کچھڑی بنا دوں گی۔“ عالیہ بیگم نرمی سے ہامی بھرتے ہوئے چل دیں۔

ٹوکری میں آخری تین آلو بچے تھے۔ انہیں ہی ابا نے کورکھ کر وہ کچن سے باہر آ گئیں۔ کچن بھی کیا تھا بس برآمدے کے ایک کونے میں ایک سلیب لگا کر چولہا فٹ کر دیا تھا اور دھیلیف جس میں سے پلاسٹک کے کچھ برتن، بھانڈے، کپ، پیالے اور المونیم کی دو چار پتیلیاں تھیں۔ دل خوش کرنے یا بہلانے کو اس کونے کا نام کچن رکھ دیا گیا تھا۔

عائشہ کرسی پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ گھٹنوں پر سر ٹکا کر کتنی دیر جگہ جگہ سے اکھڑے فرش کو دیکھنے کے بعد اس کی نظریں اپنے پیروں پر جا گئیں۔ چھٹی رنگت کے سترے بے داغ پاؤں، اس کی سہیلیاں تو اس کے پیر دیکھ کر کبھی فدا ہوئی رہتی تھیں۔

”اللہ عائشہ تمہارے پیر کتنے خوب صورت۔“ ہیں۔ کیا مینی کیور، پیڈی کیور کرواتی ہو۔“  
”پیر کیا، عائشہ تو خود ہی مجسم خوب صورت ہے۔ چہرہ دیکھو، ہاتھ دیکھو۔“ دوسری تبصرہ کرنی۔  
”عائشہ کے تو سارے کزن اسی پر مرتے ہوں گے، کیوں عائشہ۔“ یہ نہرہ تھی جسے کزن فوبیا تھا۔  
”نہن..... نہیں..... پتا نہیں میرے کوئی کزن ہیں ہی نہیں۔“ عائشہ کچھ بوکھلا کر وضاحت دیتی۔  
”کیا مطلب۔ تمہارے کوئی کزن ہیں ہی نہیں۔“ وہ سب حیرت سے چلا آئیں۔

”پچھا، تاپا، خالہ، ماموں، چھوچی، کیا سب بے اولاد ہیں خدا نخواستہ۔“  
”میری صرف ایک ہی خالہ ہیں اور ان کے دو بچے، فہد بھائی کا صرف نام سنا ہے یا تصویریں دیکھی ہیں، وہ بہت چھوٹے تھے جب اپنے پاپا کے ساتھ امریکا چلے گئے تھے۔ ایک، دو بار شاید آئے تھے پاکستان، مگر ہمارے گھر بھی نہیں آئے اور عزیز ہے خالہ کی چھوٹی بیٹی، بس یہ ہی دو کزن ہیں میرے۔“ کاج میں بننے والی اپنی بیٹی سہیلیوں کے سامنے وہ دھیرے سے اپنی کتاب زندگی کا کوئی ورق پلٹ دیتی۔ سادہ مزاج، معصوم سی عائشہ، دھیسے سے بولتی تو اور بھی دل میں اترتی چلی جاتی۔

”تو تمہارے کوئی رشتے دار ہی نہیں ہیں۔“ سمیرا کی آنکھیں حیرت سے بچھنے کے قریب ہو جاتیں۔ وہ خود جس تین منزلہ گھر میں رہتی تھی وہاں جوائنٹ میبل سسٹم تھا۔ کل ملا کر ماشاء اللہ پچیس افراد تھے گھر کے۔ وہ چھوٹی سی مٹی تو یہ ہی تھی کہ ہر گھر کی آبادی اتنی ہی ہوتی ہے۔

ایک بار ایک رشتے دار کے گھر گئی، جہاں میاں، بیوی اور دو بچوں پر مشتمل خوش حال گھرانہ تھا تو کافی دیر

ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس نے بڑی معصومیت سے سوال کیا کہ.....  
”گھر کے باقی سب لوگ کہاں ہیں۔“ اب خیر سے محترمہ کاج میں پہنچ گئی تھیں مگر عقل اب تک وہیں کہیں بچپن کے کسی جھروکے میں ہی کھڑی ہوئی تھی۔

”اللہ عائشہ! تم کتنی لگی ہو۔ اکیلے گھر میں بڑے مزے سے رہتی ہوگی۔“

”مزے۔“ عائشہ نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔ یہ تو وہی جانتی تھی کہ وہ کتنے مزے میں تھی۔

”عائشہ! منزہ آٹنی کا سوٹ دے آتیں بیٹا، اور ان سے سلائی کے پیسے بھی لے آنا۔“ امی نے اس کا ارٹکاز ڈرا۔

”بھیا کو بیچ دیجیے گا امی! میں نہیں چاہتی ان کے گھر۔“ عائشہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

”کیوں۔“ امی نے چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں، کیا ہوا؟ سوچا پھر۔“ دادی متوجہ ہوئیں۔

”دہلی سے بڑے بھائی صاحب کا فون آیا تھا، انہوں نے چھان بین کروائی تھی، پیچھے سے یہ لوگ ہیں تو دہلی کے ہی مگر ایسے کوئی خاندانی بھی نہیں، جیسا کہ بیان کر رہے تھے۔ ضیاء الدین صاحب کی دادی کی بہن خیارن تھیں، ٹوکر اسر پر اٹھائے گھر گھر چوڑیاں پہنتی تھیں، پاکستان آ کر تعلیم اور روپے پیسے کا منہ دیکھا۔“

”پھر کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ دادی نے ایک گہری سانس لے کر یوں ہی پوچھ لیا، ورنہ یہ بیگم کے مزاج سے تو خوب واقف تھیں کہ اب تو صاف انکار ہی ہوتا ہے۔

اس دور میں جب لوگوں کی اکثریت اولاد کے لیے بڑھوٹے وقت دولت مندی اور صاحب حیثیت ہونے کو ترجیح دیتے تھے، عالیہ بیگم صرف اور صرف خاندانی ہونے کی شرط لگائے بیٹھی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ آج کل دولت مند لوگ زیادہ ہیں اور خاندانی کم، پیسہ آنے سے ذات نہیں بدل جاتی، وہ تو اپنے بزرگوں کے کہنے پر دل و جان سے یقین رکھتی تھیں کہ اصل سے خطا نہیں، کم اصل سے وفا نہیں۔

وہ بڑی بیٹی حمنہ کے لیے رشتے دیکھ رہی تھیں، بے شک غریب ہوں مگر ہوں خاندانی، پیسہ کمایا جاسکتا ہے، خاندان اور ذات نہیں، عالیہ بیگم مغرور نہیں تھیں، نہ ہی خاندانی برتری یا بڑائی کے زعم میں مبتلا تھیں، بس ان کا مزاج اور سوچ کچھ اس قسم کی تھی کہ وہ سب سے پہلے خاندانی شرافت کو معیار بناتے ہوئے تھیں۔  
”میرا تو دل نہیں ٹھکتا، بچی بات ہے۔ آپ کے بیٹے صاحب نے، آپ پہ اور مجھ پہ معاملہ چھوڑ دیا ہے۔“ عالیہ بیگم کہنے لگیں۔

”بھئی دلہن بیگم! تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ شروع سے ہی ہمارے کیا اصول رہے ہیں، جن پر ہم کار بند ہیں۔ اپنی اولاد کے ہر معاملے میں تم میاں بیوی خود مختار ہو، جو چاہے فیصلہ کرو، ہم تو بس ان کی اچھی تربیت میں تمہارے معاون و مددگار ہیں اور اگر کوئی مشورہ چاہیے تو حاضر ہیں۔ رشتوں ناتوں کے معاملے میں ہمارا مشورہ تو یہی ہے کہ دین داری اور شرافت کو ترجیح دو، باقی سب فروعات ہیں۔“

”اماں بی! ہم بھی یہی چاہتے ہیں، نجابت اور شرافت کے لیے ہی اچھے خاندانی گھرانوں کی تلاش میں ہیں جہاں تک دین داری کا معاملہ ہے، تو اللہ معاف کرے، بعض طبقوں نے دین، دین داری اور مٹی افراد کو اتنا متنازع اور بدنام کر دیا ہے کہ کچھ مجھ میں نہیں آتا، کون صحیح ہے، کون غلط، اتنے فرتے، اتنے مسلک، ہر ایک نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد قائم کی ہوئی ہے اور پھر اصرار کہ فقط ہم صحیح ہیں، دوسرے غلط ہیں، کس کی دین داری پہ شک کریں، کس کی دین داری پر یقین کریں ہم تو بری طرح کنفیوز ہیں۔“ عالیہ بیگم نے یہ سچائی بیان کی۔

”بیٹا، حالات جتنے بھی برے ہوں، کہیں نہ کہیں روشنی کی کرن ضرور موجود ہوتی ہے، اپنا دل صاف ہونا چاہیے۔ نیت صاف منزل آسان، ان شاء اللہ اللہ خیر کرے گا، جس رشتے پہ تمہارا دل ٹھکے، استخارہ کر کے فیصلہ

کر لیتا۔“

”جی اماں! ایسا ہی کروں گی۔“ عالیہ بیگم ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں ذرا شام کے کھانے کا دیکھ لوں۔“

”بھئی جو بھی پکاؤ، ہمارے لیے تھوڑی سی مونگ کی دال کی کچھڑی بنا دینا، دو پھر مار یہی باتوں میں آ کر ایک پانی پوری کھالی، اوپر سے کھٹا پانی آتیل مجھے مارا فوہ! جب سے ہی پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی ہے، مرج مسالے والا کوئی سالن تو ہم سے ہرگز نہ کھانا جائے گا۔“



”بس بونہی، سلائی کے پیسوں پہ اتنی بحث کرتی ہیں، اتنے لے لو، اتنے لے لو، جب ایک بار ریٹ بتا دیے ہیں تو پھر بار بار کم کروانے کی کیا تک ہے اتنی ڈیزاننگ کروانی ہیں کپڑوں میں اور جتنا معاوضہ ہمیں تین سوٹوں کا دیتی ہیں، درزی تو اس رقم میں ان کا ایک ہی سوٹ سیسے گا۔“

”لوگ اس کو مارتے ہیں عائشہ! جو پہلے سے ادھ موا ہو، بہت سے لوگوں کا یہی دتیرہ ہوتا ہے، دوسرے کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا۔ ہماری محنت اور ایمان داری اللہ دیکھ رہا ہے، رائیگاں نہیں جائے گی، احمد تورات گئے گھر واپس آئے گا۔ اس وقت کسی کے گھر بھیجنا مناسب نہیں، تم ہی چلی جاؤ، کچھ رقم ہاتھ آ جائے تو احمد کے آنے پر سودا سلف مشکاواوں، سارداراشن ختم ہے اور ہاتھ بالکل خالی۔“ امی نے آخری جملوں میں جیسے خود کلامی کی۔ ”اچھا، چلی جاتی ہوں۔“ عائشہ ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی، کالی چادر سر پہ اچھی طرح جھا کر خود کو لپیٹا اور دو گھر چھوڑ کر منزہ آئی کے گھر پر دستک دے کر کھڑی ہو گئی۔

”اللہ کرے، ان کا بیٹا گھر پر نہ ہو۔“ اس نے دل ہی دل میں دعا کی، مگر یہ وقت قبولیت نہیں تھا۔ دروازہ اسی ”اصل وجہ“ نے کھولا جس کی وجہ سے وہ یہاں آنے سے گریزاں تھی۔ منزہ آئی کا بیٹا ایاز، بظاہر وہ کہتا نہیں تھا مگر اس کی نظریں۔ عائشہ کو جیسے اندر تک دیکھ لینے کی خواہش مند تھیں۔

”آئی کو بلوادیں۔“ عائشہ نے اپنا منہ نیچے کر لیا۔

”اندر آ جائیں۔“ وہ دروازہ کھلا چھوڑ کر ایک طرف ہو گیا۔

”نہیں۔ آپ آئی کو بلوادیں۔“ عائشہ ایک انچ آگے نہ بڑھی، وہیں ڈٹی رہی، امی کے پڑھائے ہوئے بہت سے اسباق میں سے ایک سبق یہ بھی تھا کہ جب تک خاتون خانہ کی گھر پر موجودگی کا کچھ نہ ہو، کسی کے گھر کے اندر داخل مت ہو، وہ اپنے بچپن سے محلے کے کئی گھروں میں کپڑے دینے آ رہی تھی اور اسی اصول پر کاربند تھی۔

”کیا بات ہے۔ کون ہے۔“ منزہ آئی خود ہی دروازے پر آ گئیں۔

”السلام علیکم آئی، امی نے آپ کے کپڑے بھجوائے ہیں اور پیسے منگوائے ہیں۔“ عائشہ سنجیدگی سے ان سے مخاطب ہوئی۔

”اچھا!“ انہوں نے کپڑوں کا شمار اس کے ہاتھ سے لیا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

”نہیں آئی شکر یہ۔ میں جلدی میں ہوں۔“

”اچھا، کو، میں پیسے لاتی ہوں۔“ وہ شاپر لے کر مڑیں اور بیٹے سے ٹکرا گئیں جو کسی بت کی مانند ابھی تک وہیں ایستادہ تھا۔

”تم تو اندر جاؤ، یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔“ وہ بیٹے پہ جھنجھلائیں۔

وہ خفیف سا ہو کر اندر کی جانب بڑھا اور پیچھے پیچھے منزہ آئی، واپس آ کر پانچ سو کا نوٹ انہوں نے عائشہ کے ہاتھ میں تھمایا۔

”امی سے کہنا، ابھی یہ رکھ لیں، باقی حساب بعد میں کر دوں گی۔“

”کروٹے کی ٹوپی سر پر ٹھیک کرتے ہوئے وہ مسجد کے دروازے سے نکل رہے تھے۔ ساتھ ساتھ عالمگیر صاحب تھے۔“

”سید صاحب! آپ نے کچھ خبر سنی کمیٹی والوں کی۔“ وہ مسجد کمیٹی کے بارے میں استفسار کر رہے تھے

”کیسی خبر۔“ تسلیج کے کرتے ہوئے دانے ایک لمحے کو رکے۔

”اڑنی اڑنی سنی ہے کہ اس بار صدارت کا منصب آپ کو دینے کا سوچا جا رہا ہے۔“ انہوں نے خبر بریک کی۔

”میں؟ مسجد کمیٹی کا صدر۔ اللہ اکبر! بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔“ سید صاحب نے عالمگیر صاحب کو دیکھا

”ہاں بھئی! ہے تو کائناتوں کا تاج مگر پھر بھی کوئی یہ تاج پہننے سے انکار نہیں کرتا۔“ وہ ہنس کر گویا ہوئے

سید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے تسلیج پڑھتے رہے، یہاں تک کہ گھر آ گیا۔ کریم کلر کا عین بجاتے ہوئے ان کا ذہن مسجد کمیٹی اور صدارت کے منصب کے بارے میں ہی سوچا رہا۔

دروازہ ٹائلز نے کھولا، وہ شادی شدہ تھی۔ شوہر سے لڑ جھگڑ کر میکے آئی ہوئی تھی۔ اس نے کھانے کا پوچھا۔

”نہیں، ابھی نہیں۔ بعد میں کھاؤں گا۔“ انہوں نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

وہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر تھی، وہی صاف ستھری رنگت، دلکش نقوش، دل آویز سراپا وہ جب بھی ٹائلز کو دیکھتے جانے کیا کیا کچھ یاد آ کر رہ جاتا۔

”سرمد کافون آیا؟“ انہوں نے ٹائلز کے شوہر کی بابت پوچھا۔

”ہاں، آیا تھا فون، شام میں آنے کا کہہ رہا تھا میں نے منج کر دیا۔“

ٹائلز کا ٹھکانہ انداز بھی انہیں اپنی بیوی کی یاد دلاتا تھا۔ وہ بھی اسی طرح بات کرتی تھی کہ بس میری بات ہی حرف آخر ہے۔ وہی عادت، مزاج ٹائلز کے تھے۔

”کیوں منج کر دیا۔“ چشمہ اتار کر انہوں نے دونوں آنکھیں مسلیں۔

”کم سے کم آپ تو یہ سوال مت پوچھیں۔ اس شخص کے پاس ہے ہی کیا، نہ ڈھنگ کا کھانا پینا ہے نہ پہننا اوڑھنا، اپنے جیسے مولوی سے بیاہ دیا۔ ہر وقت صبر اور قناعت کی چادر اوڑھے رہو۔“ وہ جھنجھلا کر باپ پر ہی برس پڑی۔

”لڑکا خنثی ہے، آج آمدنی کم ہے، کل زیادہ ہو جائے گی، کچھ عرصے برداشت کر لو اگر کوئی کمیٹی ہے تو۔“ سید صاحب محل سے گویا ہوئے۔

”مجھ سے نہیں ہوتا برداشت و رداشت۔ اس سے کہہ دیں، جب آمدنی زیادہ ہو جائے تو آ کر لے جائے مجھے۔ موجودہ تنخواہ میں گزارا نہیں ہے میرا۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ تو گھر کے کرائے اور بجلی، گیس کے بلوں میں چلی جاتی ہے، بچتا کیا ہے، خاک۔ اسی کو بچاؤ لو اسی کو بچاؤ لو، ٹائلز تنہائی ہوئی اندر چلی گئی۔

”غلطی شاید مجھ سے ہی ہو گئی، لڑکے کی شرافت دیکھ کر رشتہ کر دیا۔ بانی معاملات نظر انداز کر دیے۔“ انہوں نے تاسف سے سوچا۔

ادھر بیٹی تھی، اپنی خواہشات اور تمناؤں پر سمجھوتا نہ کرنے والی، شادی کو چھ ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے، جس میں سرمد سے زیادہ ہاتھ ٹائلز کا تھا۔

اس بار بھی اسے پورے دو ہفتے ہو گئے تھے گھر آئے ہوئے، سرمد لینے آتا، فون کرتا، مگر وہ کسی طور جانے پہ



راضی نہ تھی۔

”دنیا کما کھار ہی ہے، عیش کر رہی ہے، یہ بھی کوئی ڈھنگ کا کام نہیں ڈھونڈ سکتا جس میں چار پیسے زیادہ ملیں۔“ باپ کے سمجھانے پر اس نے ان سے سوال کیا۔

”نوکریاں اور وہ بھی اچھی تنخواہوں والی نوکریاں درختوں پر نہیں اگتیں، بڑے پاؤں بیٹے پڑتے ہیں اس کے لیے۔“ سید صاحب نے کچھ غصے اور کچھ طنز میں جواب دیا تھا۔

”تو میں نے کہا تھا ایسے فقیر سے رشتہ کرنے کے لیے، کوئی اور کمانے کھانے والا نہ ملا۔“ نانکھہ بھی چٹخ چٹخ کر خوب دودھ جواب دیتی۔

وہ بھی بھلا کیا کرتی آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو وہ کہتا کہ اسے تو کسی ریاست کی راجکماری، کسی سلطنت کی ملکہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ تو معاشی دیو کے شکستے میں آن پھنسی تھی۔ باپ تول کے گن گن کے خرچ کرنا اس کے شایانہ مزاج کے لیے بہت سخت تازیانہ تھا۔ آئے دن میاں سے لڑ جھگڑ کر میسے کا رخ کر لیتی مگر مسئلہ بلکہ مسائل اپنی جگہ جوں کے توں تھے۔

اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر سید صاحب تسبیح کے دانے گراتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اپنی طرف سے تو بہت سنبھل سنبھل کر، احتیاد کے ساتھ دونوں بچوں کو پالا تھا۔ تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی مگر نانکھہ تو بچپن سے ہی جیسے چمکا کھڑی تھی، جو بھی اچھے اخلاق و آداب وہ سکھانے کی کوشش کرتے، بوند کی طرح اس کھڑے پر سے پھسل کر نیچے آن گرتے، سختی بھی کر کے دیکھتی اور نرمی بھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

اس کے لیے، انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر سرمد کا انتخاب کیا تھا۔ ان کے پڑوسی عالمگیر صاحب کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے، بہن بھائی کوئی نہ تھیں، کچھ رشتے دار تھے جو سرمد کی کم مائیگی کی وجہ سے کنارہ کشی کیے بیٹھے تھے، اپنے بل بوتے پر جیسے تیسے ان کے وہ کسی کمپنی میں ملازم تھا، عالمگیر صاحب کے توسط سے یہ رشتہ طے ہوا تھا۔ سرمد واقعی ایک شریف انفس اور کسی حد تک سیدھا سادہ انسان تھا۔ سید صاحب کو اپنی مزاج دار بیٹی کے لیے اس سے اچھا شوہر ملنا مشکل تھا۔

نانکھہ کے لیے رشتے بہت آئے تھے مگر وہ کسی بھرے پرے خاندان میں اسے بیاہنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اب انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی ساری کاوشیں بے کار نکلیں، خواہشات کا منہ زور دیا تھا جو ان کی بیٹی کو بہائے لے جا رہا تھا، زندگی کے اس موڑ پر اس کے قدم ٹک کر ہی نہیں دے رہے تھے۔

”پتا نہیں، لڑکی کیا کرے گی۔“ انہوں نے بے بسی سے سامنے دوچار پر لگے طغروں پر نظریں جمائیں۔

”یا اللہ تیرا ہی آسرا ہے۔“ انہیں لیا ایک بہت خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

جس ڈر کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے وہ جیسے اچانک ان کے سامنے آنے کی تیاری کر رہا تھا۔

☆☆☆

”لا تعدا و جھریوں بھرے چہرے والا وہ خیف و زہار و جوہر پر جیسے کسی لاش کی مانند بڑا ہوا تھا۔ جت حالت میں لیٹے ہوئے ان کی بڑی بڑی آنکھیں چھت تک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ویرانی تھی جیسی تھی اور انتظار بھی، برسوں گزر گئے تھے مگر ان ویران آنکھوں کا انتظار ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔

”اماں کچھڑی کھائی نہیں تم نے، ٹھنڈی ہوگئی یہ تو۔“ مہک — کمرے میں آئی تو جھنجھلا گئی۔ ان کے لیے

کچھڑی کی پلیٹ جیسے رکھ کر گئی تھی، ویسے ہی جوں کی توں رکھی تھی۔ ایک لقمہ بھی تو نہ لیا تھا انہوں نے۔

”میں تو آئی تھی دوائی دینے، مگر تم نے تو ابھی کھانا ہی نہیں کھایا، اللہ جانے یوں لیٹی لیٹی کیا سوچتی رہتی ہو۔

چلو اٹھو، دو چار نوالے تو کھا لو۔“

”بھوک نہیں لگ رہی۔“ وہ کزوری آواز میں بولیں۔

”تمہیں تو کچھ بھی نہیں لگتا، نہ بھوک نہ پیاس، نہ سردی، نہ گرمی، مگر ہمیں تو اور بھی کئی کام ہوتے ہیں کیا تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں ہر وقت۔“ مہک کی برہمی ہندرتج بد مزاجی میں ڈھل رہی تھی۔

”جاؤ، دفع ہو جاؤ، نہیں کھانی، نہ کچھڑی نہ دوائی۔“ بوڑھی عورت نے سر ہانے رکھی تپائی پر غصے میں ایک ہاتھ مارا، کچھڑی کی پلیٹ الٹ کر نیچے جا گری۔

”اولی ماں! پھر وہی حرکت، کچھ زیادہ ہی سٹھیا گئی ہے بڑھیا، وہ کینہ، سالا خود دفع ہو گیا یہاں سے، اپنی مصیبت ہمارے سر ڈال گیا، بلاتی ہوں خالہ کو وہی آ کر سنبھالیں گے تمہیں۔“ مہک غصے میں بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔

”کیا ہوا باجی! اتنے غصے میں کیوں ہو۔“ تارا نے اچانک ہی اس کا راستہ روکا تھا۔ جدید فیشن کا لباس، میک اپ سے لپا ہوا چہرہ، ٹھہری ہوئی زلفیں، اپنے پچھلے لیوں کو وہ اور بھی لچکا کر، مہک سے مخاطب تھا۔

”پرے ہٹ مرن جوگا، جب دیکھو، راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔“ مہک جان نے ایک ہاتھ مار کر اسے ایک طرف کیا۔

”اللہ قسم باجی! پرس بالکل خالی پڑا ہے، ایک سو کا نوٹ دے دو، کل پرسوں واپس کر دوں گی۔“ وہ بڑی لجاجت سے مہک سے مخاطب ہوا۔

”تیری، نہ کل بھی آئی ہے، نہ پرسوں، جیسے میں جانتی نہیں ہوں تجھے۔“ مہک نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”تمہاری جان کی قسم باجی! دو دن سے اس بڑھیا کے ہاتھ کے بنے بد ذائقہ کھانے کھا رہی ہوں، پتلے شوربے کھا کھا کر میری اپنی حالت پتلی ہوگئی ہے۔ وہ بے بنیاد سو خور نہیں کا، اس نے بھی بریانی ادھا دینے سے منع کر دیا، کہنے لگا جب جیب میں پیسے ہوں تب ادھر کا رخ کرنا۔ ہاں۔“ تارا نے منہ بسور بسور کے داستان غم سنائی۔

”ویسے تو بے بڑا کمینہ، جیب سے پیسے نکلا کر ہی دم لیتا ہے۔“ مہک جان کا ہاتھ اپنے گریبان کی طرف بڑھا، ہاتھ واپس آیا تو اس میں سیاہ رنگ کا بوٹا تھا۔ وہ بوٹا کھول رہی تھی، تارا کی لپٹائی ہوئی نظریں بوٹے پر تھیں اور زبان فراتے سے شروع ہوگئی۔

”اللہ تجھے خوش رکھے۔ باجی، تیرے بچے جیتے رہیں، تیرا سہاگ سلامت رہے، تاقیامت رہے، اللہ تجھے۔“

”بکواس بند کرے گا یا نہیں۔“ سہاگ کے تاقیام سلامت رہنے کی دعا سن کر مہک جان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”ہونہ، سہاگ، جوتے کھانے لائق سہاگ۔“ اس کے منہ میں جیسے کڑواڑ بگھل گیا۔

”اچھا، اچھا، معاف کر دے باجی! میری تو بس یہی دعا ہے کہ اللہ تیری ہر مراد پوری کرے۔“ تارا اس کے خراب موڈ سے سہم کر فوراً لجاجت سے مخاطب ہوا۔

”اچھا بات سن! خالہ کے پاس جا، ان سے کہنا کہ بڑی بی نے کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھ لیں انہیں اور وہ بیٹا



کماری سے بول، بڑی بی کا کمرہ صاف کر دے، میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں۔“

مہک جان اسے ہدایات دے کر چلتی بنی۔

کارینڈور کے آخری سرے پر بڑا سال تھا، فل آواز میں میوزک سسٹم آن تھا، لڑکیاں ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھیں، وہ اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر لڑکیوں کا جائزہ لیتی رہی، خاص طور پر سوتی کا پھر بالا خر اسے آواز دے ہی ڈالی۔

”ادھر آ سؤنی!“ اس کی آواز اتنی بلند اور پاٹ دار تھی کہ میوزک کے بے پناہ شور میں بھی سب تک بخوبی پہنچ گئی۔

”جی ہاجی۔“ اس نے چہرہ سامنے کیا، وہ کچھ ہانپ رہی تھی، گوری رنگت، جتنا تاجہ رہ۔

”ہر تودن بدن سوہتی کیوں جاری ہے۔“ ہاجی نے سر سے پاؤں تک اسے گھورا۔

”ٹھیک تو ہوں، کہاں سے سوکھ رہی ہوں۔“ سوتی نے لاپرواہی سے کندھے اُچکائے۔

”کیا خاک ٹھیک ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کسی فیشن شو یا فیشن میگزین میں ماڈلنگ کرے گی ادھر سے ہڈیاں نکلی ہوئیں، ادھر سے ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ موتی عقل کی باس، یہاں لوگ آتے ہیں نا، انہیں لڑکی چاہیے ہوتی ہے لکڑی نہیں۔ میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ روزانہ کیلے اور سیب کھا کر دودھ پیا کر۔“ مہک جان کڑے تیوروں کے ساتھ اس سے مخاطب تھی۔

”پھل تو کھا لیتی ہوں ہاجی! مگر دودھ نہیں پیا جاتا مجھ سے، اچھا نہیں لگتا الٹی آتی ہے۔“ سوتی نے ٹھٹک کر کہا۔

”ابھی کرواؤں تجھ سے الٹیاں۔ بہت پرکھل رہے ہیں تیرے۔“ مہک نے اسی طرح پاٹ دار آواز میں اسے گھر کا۔ قریب موجود رقص کرتی لڑکیاں بھی کھی کھی کرنے لگیں، سوتی کھیالی ہو گئی۔

”ناک بند کر کے دودھ کا گلاس چڑھا جایا کر، ناغہ نہیں ہونا چاہیے، ورنہ پھر جاتی ہے تو مجھے۔“ مہک جان نے نرم لہجے میں بولتے ہوئے دھمکی بھی دے ڈالی۔

”چل جا، کام کر اپنا۔“ سوتی واپس جا کر دوبارہ لڑکیوں کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

”چنبیلی نظر نہیں آ رہی۔“ مہک جان نے ساری لڑکیوں کو باری باری غور سے دیکھا۔

”لو، وہ آگئی۔“ کسی کے جواب دینے سے پہلے ہی چنبیلی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”تو کہاں تھی؟“

”بہری بوا کے ساتھ ایٹن بنوا رہی تھی اپنے لیے۔“ چنبیلی آ کر مہک جان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اپنی اسکن کے معاملے میں بہت حساس تھی۔

”بہری بوا برسوں سے یہاں کی عورتوں، لڑکیوں کے لیے ایٹن بنا رہی تھیں، اب پچھلے چند سالوں سے یہ رواج کچھ کم ہوا تھا کہ نئی نسل نئی ایپورنڈ کریبوں اور لوشنوں سے ہی اپنا کام چلا رہی تھی مگر چنبیلی اپنی اسکن کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتی تھی، اس نے خاص طور پر بہری بوا سے فرمائش کر کے ایٹن کا لٹے لکھوایا، تمام اشیاء منگوا کر اسے خود بیٹھ کر ان کے ساتھ بنوایا۔ تب ہی وہ آج اپنی ڈانس پریکٹس میں بھی لیٹ ہو گئی تھی۔

”ایٹن۔“ بیگم جان نے اپنے مخصوص انداز میں امرو چڑھا کر اس نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ”کیا بارات چڑھ رہی ہے چنبیلی بیگم کی۔“

”دوہلا تو روز آتے ہیں یہاں، مگر باراتیں ہمارے نصیب میں کہاں۔“ چنبیلی کی ہنسی میں بڑا کرب چھپا

تھا۔ مہک جان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ ڈانس کے لیے کھڑی ہو گئی۔

امی جان بڑی بی کے کمرے میں موجود تھیں، مینا کماری نے نیچے گری ہوئی کچھڑی اٹھا کر فرش صاف کر دیا تھا، اب امی کے حکم کے مطابق دوبارہ کچھڑی گرم کر کے لائی تھی۔

”چلو! پانٹھو شہناش۔ دو چار نوالے تو کھاؤ، ایسے فاقے کر کے کیا اپنی جان دوگی۔“ انہوں نے بڑی بی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ اور نیچے پیچھے لگا کر آرام سے بٹھا دیا اور پھر ایک ایک چھچھڑی اپنے ہاتھ سے انہیں کھلانے لگیں۔

”بھوک نہیں لگتی مجھے۔“ بڑی بی نے دو چار نوالے کھا کر جیسے بے بسی سے اظہار کیا۔

”ڈاکٹر صاحب سے بھوک لگانے کا شربت لکھوا کر منگوا لوں گی، وہ پینا پھر خوب بھوک لگے گی۔“ انہوں نے دو چار اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے پلیٹ صاف کرادی۔ پانی پلایا اور خالی برتن مینا کماری کے حوالے کیے۔

”کچھ پتا چلا۔“ پچھلے پندرہ سال سے روزانہ وہ یہی ایک سوال کرتی تھیں اور پچھلے پندرہ سالوں سے ہر بار اس کا جواب سن کر وہ گہری چپ سادھ لیتی تھیں۔

”پتا چل جاتا تو اتھ پائوں بندھوا کر، سیدھا تمہارے سامنے لا کر ڈال دیتی۔“ امی جان کی عرفیت سے مشہور ملا نیگم ان کی چھوٹی بہن تھیں۔ کڑوے لہجے میں جواب دے کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اب کمرے میں بڑی بی اپنی خاموشی اور کھلی آنکھوں کے انتظار کے ساتھ تھیں۔

☆☆☆

پرانے وقتوں کا بنا ہوا مضبوط گھراب نئے پرانے ڈیزائن کا امتزاج تھا۔ گھر کے صحن کے ٹائلز اب تک وہی تھے سفید و سیاہ، شطرنج کے خانوں جیسے جبکہ کچن اور ہاتھ رومز وغیرہ کو تزو کر ڈرا اور کشادہ کر کے انہیں نئے ٹائلز اور جدید کھولتوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔

دادی اپنے کمرے میں تھیں۔ شیشم کی لکڑی کی بنی پرانے طرز کی بڑی بھاری مسہری، دیوار گیر وارڈروب، ایک طرف کی خالی دیوار کے ساتھ چار کرسیاں رکھی تھیں۔ مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے جوان کے کمرے میں ہی تشریف لے جاتے تھے، مگر زیادہ تر مہمان اور ملاقاتی بڑی بے تکلفی سے ان کی جہازی سائز مسہری پر ہی ایندھتے تھے۔

اس وقت بھی ان کی بہن شاہ جہاں بیگم کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ پچھلے دس برسوں سے امریکا میں اپنے بیٹے بہو کے پاس مقیم تھیں۔ دو تین سال میں، دو تین ماہ کے لیے آتیں اور پاکستان بھر کے مختلف شہروں میں پھیلے اپنے سارے رشتے داروں سے ملاقاتیں کر کے جاتیں۔ آج کل اسلام آباد سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ دودن کے لیے یہاں رکی تھیں۔ آج پہلا دن اور دوسرا آٹھ گھنٹہ تھا انہیں آئے ہوئے۔ اپنی بہن اور بچپن کی ہم جونی کے ساتھ بیٹی پرانی یادوں اور بیٹے دنوں کی یاد تازہ کر رہی تھیں۔

”بہن! یاد ہے زہرہ! تانا بابا کی لکھنوالی کوٹھی میں کتنا کنبہ آباد تھا۔ ماٹو ایک چھوٹا سا گاؤں، ایک دن میں یوں ہی بیٹھی بیٹھی افراد کا حساب لگا رہی تھی۔ یا شاء اللہ ساتھ سے زائد افراد تھے وہاں، پھر مہمانوں کا تانتا بھی بندھا رہا تھا۔ ایسی چہل پہل، ایسی رونق ہوئی تھی وہاں۔“ شاہ جہاں بیگم کی بوڑھی آنکھوں میں اب تک وہ سماں ٹھہرا ہوا تھا شاید۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ بھی ایک دور تھا، اب تو سب کچھ خواب، خیال ہو گیا جیسے، کیسا بڑا بانغ تھا، آم، امرود، انار، سنگترے، لیموں کے درخت تو آج تک مجھے بھی یاد ہیں اور پھلکاری کا کیا کہنا۔ برسات کے بعد تو لگتا تھا جنت کا کوئی ٹکڑا زمین پر آ گیا۔“ زہرہ جہیں نے یادوں کی اہم میں سب کچھ نقوش تازہ کیے۔



”آمدنی کے سرسرا ہے۔ تانا بابا کی بھی کیا آن بان شان تھی۔ کیا بائگن تھا اس دور میں۔ پوتروں کے ریکس یوں ہی تو نہیں کھلاتے تھے۔ ان کے بعد تو بس پائیکس کیا ہوا۔ جیسے کوئی آندھی آن کے پل کے پل میں صفایا کر دے ہر شے کا۔ اشفاق ماموں نے تو پورے گھر ان کی لٹیائی ڈبودی، کسی نے ان کو پسر نوح کا نام دے دیا۔ کسی نے پاگل، دیوانہ کہہ کر ہر الزام سے بری کر دیا۔“

”کہاں کے پاگل، کہاں کے دیوانے تھے وہ۔“ دیوانہ بکار آید ہوشیار (دیوانہ اپنے مطلب کے لیے ہوشیار ہوتا ہے۔) ”زہرہ جینی چمک کر بولیں۔“ خود تو انہوں نے کوئی غم پالا نہیں، غم نہ دنیا، غم نہ آخرت، عجب بے فکری اور لالباہی پن سے زندگی گزار دی اور اللہ دوسروں کے لیے مسئلہ بن جاتے تھے بھی۔ دیوانہ باش تاہم تو دیگران خورد (ایسا بے فکرا جس کی فکر دوسروں کو کرنی پڑنی ہے۔) اب اشفاق ماموں تو ان سے بہت ہی چھوٹے تھے۔ وہ سب سے بڑے، یہ سب سے چھوٹے، درمیان میں چندہ سال کا وقفہ، جب تک وہ کچھ کرنے کے قابل ہوئے، بڑے ماموں اچھا خاصا بکاڑ پیدا کر چکے تھے۔ بے چاروں نے بہتر اسنہانے کی کوشش کی، مگر وہ بھی کیا کرتے، مہاجنوں کے سودور سودور خضوں نے بالآخر وہ کوٹھی، وہ باغات سب ہی کچھ ہڑپ کر لیے۔ تانا بابا کو فٹنس اور وہ خاص ہاتھی ”جیل“ سنا ہے سب بیلام ہو گئے تھے۔ ”زہرہ جینی کو بڑے عرصے بعد کوئی ہم نوا اٹھا تھا۔ وہ تو بس ایسی شروع ہوئیں کہ اللہ دے اور بندہ لے۔“

”کہاں تانا بابا، کہاں اشفاق ماموں، وہاں تو وہ حساب تھا کہ سپدوں کے سپدوں اور کپوتوں کے سپدوں۔“ ”ارے زہرہ! تمہاری فارسی تو ابھی تک بڑی چست ہے۔ ہمیں تو بچ بھی یاد بھی نہیں رہتا کہ ہم نے آمدن نامہ، گلستان، بوستان سے ابتدائی فارسی سیکھی تھی۔ ابامیاں نے بھی ہم بہن بھائیوں پہ بڑی جان ماری زبانیں سکھانے کے لیے۔“ شاہ جہاں بیگم نے ایک خوش گوار مسکراہٹ کے ساتھ بہن کی طرف دیکھا۔

”یہاں کون سمجھ رہا ہے ہماری فارسی، ایک وہ اللہ رکھے تو بہن سے ملاقات ہو جاتی ہے، انہیں بھی ذرا شدہ بد ہے فارسی کی، پھر ان کے میاں بھی مشہد کے، تو بھی، ان ہی سے مل کر یہ شوق پورا ہو جاتا ہے ہمارا بھی کبھار ہمارے بیٹے صاحب کوئی فقرہ چست کر دیتے ہیں تو بھی ہم بھی شروع ہو جاتے ہیں، ویسے ہم بھی انہیں طنز کر دیتے ہیں کہ میاں آپ کو فارسی پڑھانے کا کوئی فائدہ ہمیں تو ہوا نہیں، بولتے ہی نہیں، اب تو خیر بہت کچھ بھول بھال گئے۔“

”ہماری پوتی کا حال سنئے، وہاں انہوں نے پہلی بار ہماری زبان سے فرخ کے چند الفاظ سنے تو بقول ان کے، بے ہوش ہوتے ہوئے پچیں، کیوں بھئی! کیا جاہل جٹ سمجھ رکھا ہے ہمیں، ہم نے بتایا کہ ہمارے ابامیاں نے عربی، فارسی، اردو خود پڑھا لی تھی ہمیں اور انگریزی اور فرخ کے لیے ایک اتالیق مقرر تھے جو ہمیں روزانہ پڑھانے آتے تھے۔ پوتی صاحبہ فرمانے لگیں۔“

”کیا اس زمانے میں تعلیم کا رواج تھا۔ لوگوں کے پاس دولت تھی۔ خوش حالی تھی۔“ ”ارے بھئی کیوں نہیں کوئی پورا برصغیر جاہل، غریب، ننگا بھوکا تھوڑا ہی تھا۔ ہمارے ابامیاں نے انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں علی گڑھ سے گریجوٹ کیا تھا۔ پھر آگے بھی مزید تعلیم حاصل کی۔ روپے پیسے کا منہ بھی دیکھا اور ماشاء اللہ خوب دیکھا، کیوں زہرہ۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مگر آج کل کی نسل کو یہ سب باتیں کہانیاں لگتی ہیں۔ یہاں پوتے، پوتیاں ہی ہماری باتیں سن سن کر حیران ہوتے ہیں۔“ وہ مسکرائیں۔

”وادی حضور! کھانا کھانے کا ارادہ ہے۔“ حمنہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”تھوڑی دیر میں کھائیں گے بیٹا! آدھ کھٹے بعد لگانا دسترخوان۔“ شاہ جہاں بیگم نے جواب دیا، پھر وہ اپنی

بہن سے مخاطب ہوئیں۔

”جہیں بھوک لگ رہی ہے تو ابھی کھالیں۔“

”بھوک تو لگ رہی ہے۔“ انہوں نے اعتراف کیا۔

”چلو بیٹا! پھر ایسا کرو کہ دسترخوان لگا لو۔“ انہوں نے دوبارہ حمنہ کو مخاطب کیا جو ابھی تک منتظر کھڑی تھی۔

”جی اچھا۔“ وہ تابعداری سے کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ماریہ اور مانی چکن میں حمنہ کے ساتھ تھے۔ کھانا لگوانے میں مدد بھی کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان کی باتیں بھی جاری تھیں۔

”پوتڑھے! فردا جب مل بیٹھے ہیں تو زیادہ تر اپنے مامی کو کیوں یاد کرتے رہتے ہیں۔“ مانی نے سوال کیا۔

”شاید اس لیے کہ وہ اپنی عمر تقریباً گزاری چکے ہوتے ہیں۔ مستقبل کا کوئی خواب، کوئی پلان ان کے پاس نہیں ہوتا، اسی لیے وہ بیٹھے بیٹھے مامی کی یادوں میں کھوئے رہتے ہیں۔“ ماریہ نے سوچ سوچ کر جواب دیا۔

”یہ انسانی فطرت ہے شاید اور تقریباً ہر انسان جو بڑھاپے کو پہنچتا ہے وہ اپنے بچپن، اپنے مامی کو ضرور دہراتا ہے۔ ایک بے ضرر سا مشغلہ، جس سے ان لوگوں کو خوشی ملتی ہے، تسکین ملتی ہے۔ حمنہ نے رمان سے جواب دیا۔“ ”میں کوئی اعتراض نہیں کر رہا۔ ویسے ہی ایک بات کہہ رہا ہوں۔“ مانی نے مسکرا کر اپنی پیاری آپی جان کو دیکھا اور سلا دمیں سے کھیرے کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ماریہ نے اس کا ارادہ پہلے ہی بھانپ کر فوراً پلیٹ اس کے آگے سے اٹھالی۔ اور چکن سے باہر چل دی۔

”اے..... رکو..... ایک کھیرے کا ٹکڑا ہی تو تھا ظالم۔“ مانی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔

☆☆☆

گلے کی پٹی یہ فیوزنگ جما کر اس نے گرم گرم استری پھیری۔ ابھی وہ استری ہٹا کر جائزہ لے رہی تھی کہ بجلی اچانک ہی چلی گئی۔ اچانک یوں کہ وہ لوڈ شیڈنگ ٹائم نہیں تھا، مگر بجلی کا کیا ہے، وہ تو بھی کسی بھی وقت، کتنی ہی دیر کے لیے غائب ہو سکتی تھی۔

”اف.....“ عائشہ کے منہ سے بے اختیار نکلا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے کلمہ شکر ادا کیا۔

”شکر ہے کہ فیوزنگ لگالی، اب بیٹھ کر کھانا تو بنا ہی لوں گی۔“ مشین ہاتھ کی تھی، وہ ابھی عصر کی نماز پڑھ کر آئی تھی۔ مغرب ہونے تک اس کا اچھا خاصا کام ہو جاتا۔ وہ آٹھویں جماعت میں بھی جب سے سلائی کے کام میں اپنی امی کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ نویں جماعت تک وہ کافی کچھ سیکھ چکی تھی اور میٹرک کر کے وہ کالج گئی تو سلائی میں مہارت حاصل کر چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صفائی تھی۔ نفاس تھی اور کچھ قدرتی ہنر تھا اس میں، وہ ڈیزائننگ، کلر مینیشن بہت اچھے کرتی تھی۔ سلائی کا آدھ سے زیادہ کام اب وہی پنپاتی تھی۔

امی کی ایک آنکھ میں موتی آتر آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے آپریشن بتایا تھا۔ عائشہ اب حتی الامکان کوشش کرتی کہ انہیں مشین پر نہ بیٹھنے دے، مگر پھر بھی وہ جب کالج میں ہوتی تو امی کچھ نہ کچھ سلائی کرتی لیتیں۔ عائشہ کالج سے آئی تو ان پر خفا ہوئی وہ مسکرا کر اسے نال دیتیں۔

”امی! آپ فریڈہ آفٹی کے کپڑے مت لیا کریں۔“ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے وہ ماں سے مخاطب ہوئی۔

”کیوں۔“

”اسنے کم پیسے اور ڈھیروں ڈھیر خرچے، مجھے تو بہت غصہ آتا ہے ان کے کپڑے کی کر۔“



”بیٹا بہت پرانی کسٹمر ہیں ہماری، ایسے کیسے صاف جواب دے دوں انہیں۔“ امی نے مجبوری کا اظہار کیا۔  
 ”پرانا کسٹمر ہو یا نیا، جو محنت کے مطابق معاوضہ دے، اس کا کام کریں، باقیوں کو گڈ بائے۔ پرانا ہونے کا  
 یہ مطلب ٹھوڑی ہے کہ جو معاوضہ دس سال پہلے وہ دیا کرتی تھیں، آج بھی وہی دیں، مہنگائی دیکھیں کہاں سے  
 کہاں پہنچ گئی ہے۔“ عائشہ نے ان کے عذر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔  
 ”اتنا جذباتی ہو کر فیصلے نہیں کرتے۔ سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں۔ جب ہمارے پاس کوئی متبادل انتظام  
 ہو جائے گا تو آہستہ آہستہ ایسے سارے کسٹمرز سے جان چھڑا لیں گے۔ ابھی تو ہماری مجبوری ہے، تاہم ہاں تو  
 ہے حق حلال کی روزی ٹھوڑی بھی ہو تو اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔“ امی نے آرام سے اسے سمجھایا۔  
 ”بات کم از کم زیادہ روزی کی نہیں امی! ہماری محنت کے مطابق صلہ نہیں ملتا تو دل دکھتا ہے۔“ عائشہ کی دھیمی  
 آواز اب مشین کی گھر، گھر میں اور دب رہی تھی۔

کانچ میں آکر اس میں بہت سے ایسے احساس پیدا ہوئے تھے جن کو اس نے اب تک کوئی خاص توجہ اور  
 اہمیت نہیں دی تھی، مگر اب جب عمر اور شعور نے کچھ آگے سفر کیا تو اس کے خیالات اور اعتراضات کو زبان مل گئی۔  
 کانچ جاتے ہوئے اسے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے۔ اب وہ پہلے جیسی ڈری سبکی، ڈار سے چھڑی کونج کی طرح  
 حیران پریشان نہیں رہتی تھی۔ بہت جلد اس نے اعتماد کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔  
 وہ جس نئی دنیا سے روشناس ہو رہی تھی۔ اس کے نت نئے دل بھاتے رنگوں کی طرف وہ کچھ ایسی ملتفت  
 نہیں تھی کہ ماں کی تربیت کی بنیادیں بہت مضبوط تھیں۔ ہر دل فریب، چمکتے دھتکے منظر سے بے نیاز نہ گزر جاتا  
 اس کی فطرت اور تربیت کا خاصا تھا، مگر اپنی اور اپنی ماں کی محنت کے حوالے سے ہونے والی حق تلفی اور استحصال  
 اسے اب بری طرح ٹھٹھنے لگا تھا۔ اکثر پرجوش ہو کر ایک چھوٹی سی تقریر جھاڑ دیتی اور امی اور احمد اس کے زور  
 خطابت اور جذباتیت پر فقط مسکرا کر داد دے دیتے۔

”عائشہ.....“ امی نے کچھ یاد آتے ہی اسے مخاطب کیا۔ ”بجلی کا بل اور بارہ سو روپے، ایک ساتھ کر کے  
 شوکیں یہ رکھ دینا، احمد صبح جاتے ہوئے لے جائے گا۔ آخری تاریخ پہ تو بہت رش ہو جاتا ہے۔ بل پہلے ہی بھر  
 جائے تو بہتر ہے۔“  
 ”بجلی تو عموماً ہوتی ہی نہیں ہے۔ لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ بڑھتا ہی جا رہا ہے اور بل میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہتا  
 ہے۔“ عائشہ بڑبڑاتی۔

”امی! آپ بھی بھائی سے کہہ کر کنڈا لگوالیں۔ سوائے ایک آدھ گھر کے، سب ہی کے گھروں میں کنڈا لگا  
 ہوا ہے۔ ہم لگالیں گے تو کیا قیامت آجائے گی۔ ایک سیور اور ایک پٹکھا ہی تو چلتا ہے ہمارا اور ایک چھوٹا سا  
 فریج، روز، روزا سڑی بھی نہیں ہوتی کپڑوں پر، نہ کئی گھنٹی کی چلتا ہے اور تو کوئی خاص الیکٹریٹس کی شے  
 ہمارے گھر میں ہے نہیں۔ پھر بھی اتنا اتنا بل بھیج دیتے ہیں اٹھا کر۔“ عائشہ سلائی کے ساتھ ساتھ بولتی بھی جاری  
 تھی۔

”کنڈا لگانے سے کسی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، بلکہ اور بڑھ جاتا ہے۔ آئے دن چھاپے پڑتے ہیں اور پھر  
 ہزاروں روپوں کا بل بنا کر دوبارہ بھیج دیتے ہیں۔ کنڈا لگراتی بچت نہیں ہوتی جتنی رقم جرمانوں میں چلی جاتی  
 ہے، پھر ایسے کام کر کے ہم کسی اور کو نقصان نہیں پہنچاتے، خود اپنے آپ کو پہنچاتے ہیں۔“  
 ”امی حضور! آج کل کے دور میں ایمان داری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بل صراط پہ چلنا ہے گویا۔ مجموعی طور  
 پر کرپٹ معاشرے میں، انفرادی ایمان داری اور راست بازی سے نہ خود کو کوئی فائدہ ہوتا ہے، نہ دوسروں کو۔“  
 عائشہ یوں باغیانہ لب و لہجہ عموماً اختیار نہیں کرتی تھی، مگر ابھی اس کا دل بے حد دکھ سے بھر جاتا تھا۔ بیانیہ دل

چھلکتا تو کچھ بھی بول کر بھڑاس نکال لیتی۔  
 ہر مہینے بجلی کے بل کی مد میں اچھی خاصی رقم نکل جاتی تھی۔ ورنہ امی کے آپریشن کے لیے رقم جمع کرنے کا  
 مشن اتنا سست رفتار نہ ہوتا۔  
 ”ہاں..... کبھی کبھار کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر.....“ امی ایک لمحے کو رکیں۔ ”چڑیاں کی چونچ میں دبے پانی  
 کے دو قطرے سے بے شک آگ نہیں بجھتی، مگر اس کا خلوص نیت ریکارڈ پر آ جاتا ہے۔ وہ ضائع نہیں جاتا،  
 کرپشن کے سمندر میں چاہے پورا معاشرہ غرق ہو رہا ہو، مگر ایمان داری کا چھوٹا سا جزیرہ بھی انسان کو ڈوبنے سے  
 محفوظ رکھتا ہے۔“  
 ”ڈرگ گتے جزیروں پر قدم جمانا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔“ عائشہ نے ایک لمحے کے لیے مشین پہ جھک کر  
 اٹھایا۔

”اسی لیے تو اللہ تعالیٰ سے ہدایت کے ساتھ ساتھ استقامت کی دعا بھی مانگتے ہیں۔“ امی نے پاک کاٹ  
 کر ایک طرف رکھی اور آلو چھیلنے لگیں۔  
 ”پتا ہے امی! جب میں اپنے گھر پر ہوتی ہوں تو جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوتی ہوں اور گھر سے باہر کی دنیا  
 بالکل الگ، بالکل مختلف ہے۔ جیسے..... جیسے کوئی اپنی کنیٹ سے نکل کر کسی جادوگری میں آجائے۔“ عائشہ دیرے  
 سے مسکرائی۔

”اس جادوگری میں جاؤ، چلو پھرو، ہر شے دیکھو، خوب دیکھو اور بس دیکھ کر گزرتے جاؤ، جہاں قدم رکے،  
 وہیں انسان کی منزل کھولی اور راستہ کم ہو جاتا ہے۔“  
 ”پتا ہے، میں نے اپنی سہیلیوں کو آپ کے بارے میں بتایا ہے کہ میں نے آج تک اپنی امی کو کتنا میں  
 پڑھتے نہیں دیکھا، مگر وہ ایک کچی فلاسفر ہیں۔“ عائشہ مسکرائی۔  
 ”فلاسفر بننے کے لیے ڈھیروں ڈھیر کتنا میں پڑھنا ضروری نہیں۔ بعض لوگوں کو، زندگی اور دوسرے لوگ  
 بھی فلسفہ سکھا دیتے ہیں۔“

امی نے سادہ سے انداز میں جواب دیا اور سر جھکا کر پھر سے آلو کاٹنے میں مگن ہو گئیں۔ ان کے چہرے پہ  
 جو سکون تھا وہ ان کے صبر اور قناعت کی گواہی تھا۔

☆☆☆

”السلام علیکم بھابھی! میں جمال بات کر رہا ہوں سر مدد دوست۔“  
 ”وعلیکم السلام! کیا حال ہے جمال بھائی۔“ نائلہ نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ سر مدد کا بہت قریبی  
 دوست تھا اور ان کے گھر اس کا بے تکلفانہ آنا جانا تھا۔  
 ”میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، مگر آپ کے شوہر نامدار بے چارے کا فی پریشان ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے  
 سے میرے پاس آ، آ کر تین کر رہے ہیں کہ آپ سے بات کروں۔“  
 جمال بہت ریلیکس ہو کر بات کر رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی دو تین بار دونوں کی صلح کروا چکا تھا، بلکہ دونوں  
 کی صلح کیا، سر مدد بے چارہ تو مرخان مرن انسان تھا۔ یہ نائلہ ہی تھی اکڑ فوں، جسے منانے کے جتن کیے جاتے  
 تھے۔ جمال اپنے دوست کی دکالت، بخوبی کر لیتا تھا اور مزے کی بات کہ نائلہ اس کے سمجھانے اور منانے سے  
 مان بھی جاتی تھی۔

”جمال بھائی! میں اس شخص کے جھوٹے دلاسلوں سے تنگ آ چکی ہوں۔ ہر بار مجھ سے یہ ہی کہتا ہے کہ  
 اس بار یہ گھٹیا نوکری چھوڑ کر کوئی بہتر کام دیکھو گا اور ہر بار پھر وہی راگ لگی نوکری کو یوں چھوڑنا ٹھیک



نہیں، یہ مسئلہ، وہ مسئلہ، آخر میں کب تک صبر اور برداشت سے کام لیتی رہوں۔“ نائلہ یوں پھٹ پڑی جیسے اس کی شادی کو کچھ مہینے نہیں بلکہ دس بارہ سال ہو گئے ہوں۔  
 ”بھابھی..... بھابھی..... دھیرج رہیں۔ میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ کچھ عرصے میں اس کا اپنا کام ایسے سیٹ کرادوں گا کہ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی لائف بھی سیٹ ہو جائے گی۔“ جمال نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”رہنے دیں جمال بھائی! آپ بھی اپنے دوست کی طرح سبز باغ دکھانے میں ماہر ہیں۔“ نائلہ نے ٹھنک کر کہا۔

”ارے..... رے..... رے..... سبز باغ.....“ جمال ہنسا۔ ”بخدا جو کچھ کہا ہے، دل سے کہا ہے اور سچ کہا ہے، بھلا ہم یہ برداشت کریں گے کہ ہماری اتنی پیاری بھابھی اپنی پسندیدہ چیزوں کے بغیر ترس ترس کر زندگی گزاریں۔“

جمال کو لکھے دار باتیں بنانی خوب آتی تھیں اور نائلہ کو یہ انداز گفتگو بڑا اچھا تھا۔ سرمد تو اس کے رعب حسن کے آگے بس ٹھکھیا کر یا منہ مٹا کر رہ جاتا۔ نائلہ کی طبیعت بھی کبھار تو بری طرح ادب جاتی تھی سرمد کے انداز سے۔

”بولے نا بھابھی! میں نے تو سرمد کو یقین دلادیا تھا کہ آپ کو گھر ضرور لے آؤں گا۔ پلیز، اب میری بات کا مان تو رکھ دیجیے گا۔“ جمال کا لہجہ خود بخود التجائیہ ہو گیا۔

”جمال بھائی! آپ کی بات بھلا میں ٹال سکتی ہوں۔“ نائلہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”مگر یاد رہے، آپ ضمانت لے رہے ہیں اپنے دوست کی، کوئی گڑبڑ ہوئی تو آپ ہی بھگتیں گے پھر۔“ نائلہ نے بڑی اداسے اسے متنبہ کیا۔

”ارے بھابھی جان! ہم خوشی خوشی بھگت لیں گے۔ آپ گھر آنے کی ہاں تو کریں۔“ جمال کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”بتا دیجیے گا پھر ہمارے شوہر نامدار کو، آکر لے جائیں، لیکن اگر آپ نے جلد از جلد ان کا کام سیٹ نہیں کر دیا تو آپ ذمے دار ہوں گے۔ آپ کے کہنے سے جاری ہوں میں۔“ نائلہ نے اسے بتایا۔

”ٹھیک ہے بھابھی! آپ بے شک ساری ذمہ داری میرے کاندھوں پہ ڈال دیجیے گا۔ میں اف نہیں کرنے والا۔“ جمال نے پھر ہنس کر یقین دلایا۔

نائلہ کے الفاظ، انداز میں جو غریب اور حوصلہ افزائی تھی۔ وہ جمال جیسے شخص کی پیش قدمی کے لیے کافی تھی۔

سرمد سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ سرمد نے اپنے گھر اور گھر کیلئے معاملات میں اسے انوالو کیا تو وہ ابتدا میں ہی نائلہ کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ٹھنک گیا تھا۔ مگر اس کا یہ ٹھنکنا محض سوچ بچار کی غرض سے تھا کہ وہ ایسی عورت سے فائدہ اٹھانے کے لیے اگلا قدم کب اور کیسے اٹھائے، اسے کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ وہ اپنا کھیل بہت سست روی اور آرام سے کھیل رہا تھا۔

ساننے دوسری تو حریف تھے۔ ایک بے وقوفی کی حد تک سیدھا سادا جسے وہ یوں ہی جیت کر سلکتا تھا۔ دوسری مد مقابل، لالچ، ہوس اور خواہشات کی ماری، جو خود ہی شکست کے پاتال میں گرنے کو تیار تھی۔ بظاہر سب کچھ آسان لگ رہا تھا، مگر پھر بھی وہ بڑی ہنرمندی اور چابک دستی کے ساتھ دونوں کے گرد اپنا جال بن رہا تھا۔

کمرہ بہت زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر آرام دہ اور پرسکون تھا۔ ایک طرف بیڈ جس پر پچھلیں پھولوں کی دیدہ زیب چادر اور اس کے ساتھ کے تنکے تھے۔ اسی کے ہم رنگ، دو گاؤں تنکے بھی سائڈوں میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بڑے کھڑکیوں پہ گرے ہوئے تھے۔ قالین نیا اور دیز تھا۔ الماری دیوار گیر تھی اور سنگھار میز، خوب صورت اور انشاکش، میک اپ کے دیگر لوازمات کے ساتھ اس پر ایک شے بہت نمایاں اور زیادہ تعداد میں تھی۔ بھانت بھانت کے پرفیوم۔

مختلف انداز و ڈیزائن کی بوتلیں، انواع و اقسام کی خوشبوئیں، وہ دیوانی تھی، خوشبو کی۔

”کیا ضرورت ہے اتنے پرفیوم لگانے کی، تم مجسم خوشبو ہو، سرپا پھول ہو۔“ طلال شیخ نے ایک گہری سانس لے کر اس کے وجود سے اٹھی دل فریب میک اپ سے انداز تاری۔

”میرا شوق ہے۔“ چنبیلی مسکرائی، شہر رنگ بالوں کی ایک لمبی سی لٹ اس کی سر میں گردن کو چوم رہی تھی۔ ”آپ کہیں تو آپ کے سارے شوق پورے کر دیں۔“ طلال نے اس کی گردن کو چومتی زلفوں کو سمیٹ کر

ایک طرف کیا۔ اس نے آج کی نہیں تھی، مگر بن سے ہی مدہوش ہو رہا تھا۔  
 ”دو چار دن کے شوق تو کوئی بھی پورے کر سکتا ہے شیخ جی! عمر بھر کے جو نچلے کون پورے کرتا ہے۔“

”اور اگر کوئی ہو پورا کرنے والا تو۔“  
 ”ایسے دعوے کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ ان پر عمل کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے۔“ چنبیلی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”بندہ بہت جی دار ہے جان! آزما کر دیکھ لو۔“ طلال جوش میں آ کر اٹھ بیٹھا۔  
 ”ہم کسی کو آزما تے نہیں ہیں، توقع پوری نہ ہو تو تکلیف ہوتی ہے۔“ چنبیلی نے آہستہ سے بولتے ہوئے

آکھیں بند کیں۔  
 کمرے میں زبرد پار کی نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دیوار پر لگے وال کلاک نے سریلہ ساز بجانا شروع کیا اور پھر ٹن، دو گھنٹے بجتے کا سیدھا سا مطلب دونوں چکے تھے۔

”کبھی کبھی کوئی آزمائش پر پورا اتر بھی جاتا ہے۔“ طلال دوبارہ اس پر جھک گیا۔ ”ہمیں آزما کر تو دیکھو۔“ اس نے چنبیلی کے کان میں سرگوشی کی۔

”آزمائش یا تو دوستی کے بل پر ہوتی ہے یا محبت کے، ہم کس بھروسے پہ آزمائیں آپ کو؟“  
 ”محبت کے بھروسے پہ۔“ جلال نے بغیر کسی توقف اور تذبذب کے جواب دیا۔

”اتنا بڑا دعوہ۔“  
 ”صرف دعوائی نہیں وعدہ بھی ہے اسے نبھانے کا۔“ طلال بے خود ہو کر اس میں گم ہو رہا تھا۔

”ایسے خواب نہ دکھائیں شیخ جی! میں تو مر ہی جاؤں گی۔“  
 ”شوق سے مر، مگر صرف مجھ پر۔“

”وہ تو کب کی مرنے لگی ہوں۔“ چنبیلی نے بے ساختہ ہی اعتراف کیا۔  
 ”پہلے کیوں نہیں بتایا۔“

”تکلیف کرنی بتا کر۔“ دکان دار اپنی چیز کے دام لے کر گایک کو رخصت کر دیتے ہیں۔ اس سے محبت کرنا تھوڑی شروع کر دیتے ہیں۔“ چنبیلی کے لہجے میں معمولی سی چھین تھی۔

”اور جو گا کب ہی دام الفت میں گرفتار ہو جائے۔“  
 ”دکان دار کی خوش نصیبی ہے، کوئی بے مایہ شے اٹھول ہو جائے۔“



”ایسی باتیں نہ کرو جو میرے سر پر سے گزریں، اتنے پیار سے بات کرتی ہو تو پیار کی بات ہی کیا کرو۔“ طلال نے اس کی مہکتی زلفوں میں منہ گھسایا۔  
 ”پیار کی بات آپ کی طرف سے ہو تو دل کی خوشی کا عالم کچھ اور ہی ہوتا ہے۔“  
 ”بھلا میں یہ گستاخی کر سکتا ہوں کہ حسن کی بارگاہ میں پیار کے علاوہ کچھ اور بات کروں۔“ طلال کی باتیں والہانہ رویہ، خوشی سے اس کا دل دھڑکار رہے تھے۔  
 وہ آٹھ مہینے پہلے یہاں آیا تھا پہلی بار، اس کے بعد اس کے آئے دن کے چکر لگنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا سپوت تھا اور اس چوہارے میں چٹیلی کی زلف کا سیر ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کالج قدیم تھا اور نیم کا وہ درخت بھی اتنا ہی پرانا۔ اس کی گھٹی سرسبز چھاؤں کالج ٹائم میں کبھی خالی نہیں رہتی تھی۔ کوئی نہ کوئی ٹولی اس کے نیچے براجمان ہی رہتی تھی۔ اس وقت بھی ماریہ اینڈ گروپ نے وہاں قبضہ جما لیا ہوا تھا۔ گروپ کے تین ارکان تو کینٹین کا رخ کر چکے تھے۔ باقی دو افراد بچے تھے جو یہیں بیٹھے جانے والوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔  
 ”تم کیا روزہ رکھ کر آتی ہو یا پرہیز کرتی ہو باہر کی چیزوں سے۔“ ماریہ نے اپنی فطری بے تکلفی اور بے ساختگی سے عائشہ کو مخاطب کیا۔

فرسٹ ایر — اب ختم ہونے کو تھا۔ دونوں کی دوستی کو بھی تقریباً اتنی ہی عرصہ ہو چکا تھا۔

”باہر کی چیزیں زیادہ کھالوں تو میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، ہضم نہیں ہوتا۔“ عائشہ نے بہانہ بنایا۔  
 حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا جب خرچ بہت محدود تھا۔ اس نے خود ہی محدود کیا ہوا تھا۔ اسی تو اسے روز کی اتنی رقم دیتی تھیں کہ اس کا کرایہ اور کالج کینٹین سے کچھ کھانا پینا ہو سکے، مگر اس نے باہر کی چیزوں کی لت نہیں لگائی تھی خود کو، گھر میں رات میں اکثر آلو، وال یا کوئی بھی سبزی بیتی، اس میں سے تھوڑی سی، صبح خشک کر کے اس کا پراٹھا بنا لیتی، کبھی چٹنی، کبھی اچار کی بھانک رکھ کر رو ل کر کے لے جاتی، بریک میں اس کے ساتھ ساتھ سہیلیاں بھی لٹے، دو لٹے لے لیتیں اور پھر چپٹیں۔

”اللہ عائشہ! کتنے مزے کا ہے، تم خود صبح صبح پراٹھا بناتی ہو۔“ ان میں سے کوئی حیران ہو کر آنکھیں پھاڑتی۔ جنہیں صبح اپنے لیے ایک کپ چائے بنانا بھی پہاڑ لگتا تھا۔

عائشہ متانت کے ساتھ مسکراتی۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے بھائی کا پراٹھا اور ای کی سادہ روٹی لپکا کر کالج آتی تھی۔ یہ بتا کر وہ اپنی اوٹ پٹا نگر مختلف دوستوں کو مزید حیران نہیں کرنا چاہتی تھی جو پہلے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چٹیں مار کر حیران ہونے کا عالمی ریکارڈ بنانے کا تمہیر کئے بیٹھی تھیں۔

”تم آج اپنے بچے کے لیے بھی کچھ نہیں لائیں گھر سے، کینٹین سے کچھ لے لو۔“ ماریہ نے اسے ٹھوکا دیا۔  
 ”موڈ نہیں ہے۔“ عائشہ نے ٹٹی میں سر ہلایا۔ اس کے پاس اکو تاس کا نوٹ تھا جو گھر واپسی کرانے کے لیے تھا۔

”کھانے پینے کا کام موڈ سے نہیں بھوک سے ہوتا ہے۔“ ماریہ نے جتایا۔  
 ”پھر سمجھ لو کہ بھوک نہیں ہے۔“ عائشہ مسکرائی۔

”کیا کھایا تھا تم۔“ ماریہ کی جرح بدستور جاری تھی۔  
 ”افوہ.....“ عائشہ نے انکار کر اسے دیکھا۔ ”کتنی لپٹیش کرتی ہو، ویمن پولیس میں بھرتی ہونے کا ارادہ تو

نہیں ہے تمہارا۔“

”دراصل مجھے حیرت ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر۔“ ماریہ نے غلج ہو کر اسے دیکھا اور ادھوری بات چھوڑ کر

سپنس پھیلایا۔

”کیوں بھئی! کیا میرے سر پر سیگنٹ لپ پیچھے کوئی دم وغیرہ ہے۔“ عائشہ نے مصنوعی انداز میں منہ بنایا۔  
 ”جانتا ہے، ایک میرے بھائی ہیں، جن کا دنیا میں آنے اور جینے کا فہم ایک ہی مقصد ہے، کھانا، کھانا، بس کھانا۔ ہر وقت کھانا اور کھاتے ہی چلے جانا، ہر دس، پندرہ منٹ بعد انہیں منہ چلانے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے اور ہر آدھ گھنٹے بعد بھوک مٹانے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو یہ ہی سوچتی رہتی ہوں کہ یا اللہ یہ لڑکی بغیر کچھ کھائے ہے آدھا دن کیسے نکال لیتی ہے۔“ ماریہ مزاحیہ انداز میں اتنی بے ساختگی کے ساتھ بتا رہی تھی کہ بے اختیار عائشہ کی ٹیسی نکل گئی۔

”مبالغہ آرائی خوب کرتی ہو، تم لکھاری بن سکتی ہو، ٹرائی کرو کبھی۔“  
 ”یہ بتاؤ میرے لیے تو کیریر بڑے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہی ہو، کبھی ویمن پولیس، کبھی لکھاری، اپنے لیے کیا سوچا ہے۔“ ماریہ نے اسے گھور کے دیکھا۔

”مستقبل کی ڈریس ڈیزائنر، وہ بھی اعلا پائے کی۔“ عائشہ نے فرضی کارلار کڑائے۔  
 ”اعلا پائے تو بس جینس کے ہوتے ہیں۔ واہ واہ! کیا ہڈی ہوئی ہے، کیا بوٹی۔“ ماریہ نے آنکھیں بند کر کے جھوم کر سہلایا۔

عائشہ خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ جس نے عائشہ کی بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔  
 ”بھئی، مجھے یوں اپنی نظروں سے شہید مت کرو۔ میرے بھائی کا قول ہے جو میں نے ابھی تمہیں سنایا ہے۔“ ماریہ نے اپنے بچاؤ کے لیے جلدی سے صفائی پیش کی۔

عائشہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ کینٹین جانے والا ٹولا واپس آتا دکھائی دیا۔  
 ”یہ لو..... وہ آگئیں معرکہ سر کر کے۔“ عائشہ نے ان لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ بریک ٹائم میں کینٹین میں اتنا رشت ہوتا کہ وہاں سے کچھ خریدنا معرکہ سر کرنے کے برابر ہی تھا۔

”اف! ڈیو تینوں دھم سے کرنے کے انداز میں بیٹھ گئیں۔ ماریہ نے اپنے لیے برگر منگوایا تھا اور جوس، سنیچہ اور اینٹلے اپنے اپنے رول کھانا شروع کر دیے، مگر عائشہ کو آفر کرنے کے بعد، یسری نے اپنے دوسو سے چپس کا پیکٹ اور کوئلڈ ڈرنک عائشہ کے سامنے رکھے۔

”عائشہ! یہ تم کھالو۔“ اس نے گہری آہ بھر کے کہا۔

”کیا ہوا۔“ ماریہ اور عائشہ دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔ جس کے چہرہ پر بارہ بج رہے تھے۔ سنیچہ اور اینٹلے کیوں یہ پہلے مسکراہٹ آئی، پھر ایک ایک دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔

یسری کا گول مٹول، بھولا بھالا سامنہ اور بھی گول گیا ہو گیا۔ ماریہ اور عائشہ کی حیرانی ہنوز برقرار تھی۔  
 ”یسری کی خالہ امی، یعنی ہونے والی ساس امی کا ٹھم بلکہ دارنگ آئی ہے کہ موجودہ وزن کو تا صرف کم کیا جائے بلکہ اگر اس میں ایک پاؤ کا بھی اضافہ ہوا تو شادی کینسل بلکہ معنی ہی ختم۔“ اینٹلے نے ہنسی کے دوران بتایا۔

”اب محترمہ نے عادت کے مطابق اپنا بچ خرید لیا، ڈھیروں ڈھیر کیلوریز والا، مگر عین کھانے کے وقت خالہ کی دارنگ یاد آئی اور یہ بھی یاد آیا کہ محترمہ گھر سے گھبرا کر لائی تھیں اپنے بیک میں، آج وہی تناول فرمائیں گی۔“ اس بار ہنسی میں اینٹلہ اور سنیچہ کے ساتھ ساتھ عائشہ اور ماریہ بھی شریک تھیں۔

”اڑاؤ مذاق، نف ہے ایسی دوستوں پر۔“ یسری بچ رو ہنسی ہو رہی تھی۔ ”مٹکی یا شادی کینسل ہونے کا ڈرنکس تھا، کھانے پینے سے محرومی اور ڈانٹنگ کا دکھ زیادہ بڑا اور شدید تھا۔“

”لو بھئی عائشہ! پہلے تو تم موج اڑاؤ، تمہارے لیے غیب سے من و سلوٹی کا انتظام کیا ہے اللہ تعالیٰ



نے۔“ ماریہ اس سے مخاطب ہوئی۔

”میں اس کے پیسے کل.....“ عائشہ نے کہنے کی کوشش کی۔

”ارے ہاٹھ میں گئے پیسے، تم کھانی کر ختم کرو اسے۔“ یسری اپنے بیک میں ہاتھ گھسیڑتے ہوئے

دھاڑی۔ ہاتھ واپس آیا اس میں ایک عدد سالم کھیر ادا ہوا تھا۔

”کھیر اچھا ویرسری! ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ گنگنائی۔

یسری لی بی بی غم دھنے کے برابر تاسب کے ساتھ کھیرایوں چبا رہی تھیں جیسے اس کے ساتھ ساتھ اپنی ماس ای کی وارننگ بھی ہڑپ کر رہی ہوں۔

☆☆☆

سوئی میں دھاگا ڈال کر وہ بڑی مہارت سے پینٹ میں بن ٹانگ رہا تھا۔

”مشین سے ٹانگ لیتا بیٹا۔“ رسول بخش چاچا کا وہ سب سے چھپتا کاری گر تھا۔ ہنرمند، محنتی اور فرماں

بردار، ان ہی تین خوبیوں نے اسے چاچا کی آنکھ کا تار بنا دیا تھا۔

”جلی آنے میں زیادہ ٹانم تھوڑی ہے۔“ وہ دوبارہ بولے۔

”مشینوں کی مدد سے کام جلدی ہو جاتا ہے چاچا!“ وہ سر جھکا کر بدستور بن ٹانگ رہا۔

”ہاں یہ ہی تو فائدہ ہے مشینوں کا۔“ چاچا نے نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھا۔

”یہ ہی تو خرابی ہے مشینوں میں، کام جلدی ختم کر کے بندہ فارغ بیٹھ جاتا ہے۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”یہ تو اچھی بات ہے جھلے، ہر کوئی یہ ہی چاہتا ہے کہ کام جلدی جلدی نینا کر فارغ ہو کر آرام سے بیٹھے۔“

”مجھے مصروفیت اچھی لگتی ہے چاچا۔“ وہ ایک گہری سانس لے کر ٹانگ مضبوط کرنے لگا۔

”کیوں۔ تیرا دل نہیں چاہتا کہ ٹھکن سے جو بدن کو کچھ آرام دے، پاروں، دوستوں کے ساتھ موج

مستی کرے، میلہ کرے، تفریح کرے، یوں آدم بے زاد، سب سے الگ تھلگ، کیسی زندگی گزار رہا ہے یا تو!“

چاچا نے ذرا محبت اور بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”میں کہاں زندگی گزار رہا ہوں، یہ تو زندگی ہے جو مجھے گزار رہی ہے۔“ اس نے پینٹ ایک طرف رکھتے

ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

”کل سارے لڑکے بالے کلفٹن جا رہے ہیں، تو بھی چلا جا سب کے ساتھ، ذرا دل بہل جائے گا۔“ اسے

خاموش دیکھ کر چاچا نے صلاح دی۔

”میرا دل یہاں بھی بہل جاتا ہے چاچا!“ اس نے آرام سے انہیں جواب دیا۔

”اللہ جانے کیسا لڑکا ہے، ایک کوٹنے میں سر جھکا کر کام کرتے ہوئے ساری زندگی گزار دے گا۔“ اس

کے بے نیازی اور لاپرواہی سے کہنے پر چاچا بڑبڑائے۔

”یہ گوشہ عافیت بھی غنیمت ہے میرے لیے۔“ شاہ میر کی آنکھوں کو حزن و ملال کے سائے گھیر گئے۔

”خوش رہا کر بیٹے! اتنی سی عمر میں یہ خاموشی، یہ اداسی اچھی نہیں لگتی۔“ چاچا کا انداز اس کے ساتھ ہمیشہ

مشفقانہ ہی ہوتا تھا۔

یہ سچ ٹانم تھا۔ سارے کاری گر کھانا کھانے باہر تھے۔ بس ایک وہی تھا جو ہمیشہ کی طرح اکیلا یہاں بیٹھا

تھا۔ اب تو چاچا نے بھی اسے پہلے کی طرح ہر وقت سمجھانے اور نصیحتیں کرنا کم کر دیا تھا۔ کسی حد تک اس کی خاموشی،

نتہائی اور اداسی کے ساتھ وہ بھی بھجھوتا کر چکے تھے، مگر پھر بھی کبھی کبھی بقول چاچا کے بھینس کے آگے بین بجائی

دیتا ہوں، حالانکہ نتیجہ معلوم ہے۔

”چاچا! تم تو کھانا کھا لو۔“ شاہ میر کو اچانک ہی خیال آیا، اس نے ندامت سے چاچا کو دیکھا۔

اس کے اکیلے پن کی وجہ سے وہ وہیں اس کے پاس ہی بیٹھے اس سے دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ شام کا اخبار جو تین بجے انہیں مل جاتا تھا۔ اس کی ساری خبریں جب تک شاہ میر کو سنا نہیں دیتے تھے، انہیں

کون نہیں ملتا تھا۔

”چاچا..... پورا اخبار شاہ میر کو یوں سناتا ہے جیسے وہ سچ سچ چاچا کو سن رہا ہو۔“ حسن چاچا کو چھیڑتا۔

”سنتا ہے، وہ میری ہر بات غور سے سنتا ہے۔ تم لوگوں کی طرح نہیں ہے، سارے بدمعاش۔“ چاچا حسب

توقع اس پر گرم ہوتے اور شاہ میر پر مہربان۔

”میرا بیٹا ہے وہ۔“ دن میں ایک آدھ بار تو سارے لڑکوں کو یہ بات ضرور جتانے، جو اس بات سے بھی حظ

اٹھاتے تھے۔

”چاچا! اگر تو اپنی ساری جائیداد میرے نام لگا دے تو میں آج، ابھی سے تیرا بیٹا بننے کو تیار ہوں۔“ یہ حفیظ

تھا، ایک بچہ جو کران سے دل لگی کر تا اور پھر دیر تک ان کی صلواتیں سنتا۔

”تو اپنے گے باپ کی اولاد نہ بنا ٹھیک سے، نا فرمان، تو میرا بیٹا کیا خاک بنے گا۔ لالچی گدھ۔ یہ جو میرا

ہے نا جسے میں نے بیٹا بنایا ہے، تم جیسے چھچھوروں سے الگ ہے۔ اسے میری کیا، کسی کی بھی جائیداد ہے، روپے

پیسے سے کوئی مطلب نہیں، یہ بے چارہ تو اپنی مزدوری بھی میرے پاس ہی رکھوا دیتا ہے، اسے کیا لالچ کی چیز کیا

روپے پیسے کا..... تو بڑا آیا بیٹا بننے والا، جائیداد کی اولاد۔“

”چاچا! شاہ میر اسے سارے پیسے تمہارے پاس رکھواتا ہے نا۔“

”ہاں تو۔“ چاچا نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتے۔

”تو یہ کہ آج سے شاہ میر میرا بیٹا ہے۔“ حفیظ کے بولتے ہی سب کے منہ سے ایک زوردار تہقہہ نکلتا اور

چاچا کی ایسی ہنسی کہ جب تک حفیظ ان کی نظروں کے سامنے سے ناٹ جاتا، ان کے منہ سے اس کے لیے

مغفلت کی بارش ہوتی رہتی۔ شاہ میر کی آنکھوں کے سامنے روزانہ یہ سب تماشے ہوتے رہتے اور وہ یوں بے

نیازی سے سب کچھ دیکھتا، سنتا، لاتعلقی بنا رہتا جیسے اس کے نہیں کسی اور کے متعلق باتیں ہو رہی ہوں۔

چاچا اکیلا تھا، اس نے شادی نہیں کی تھی، جس گھر کے نیچے اس کی ٹیلرنگ شاپ تھی۔ اس کی تیسری منزل پر

ایک کڑا چھڈ ہاتھ تھا جو ان کے اور شاہ میر کے تصرف میں تھا۔ برسوں سے وہ یہاں کے کرایہ دار تھے، شاہ میر کا

بچپن، لڑپن اور اب جوانی سب یہیں گزرے اور گزر رہے تھے۔

رات کو وہ سونے لیتا تو خیالات کی ایک ختم نہ ہونے والی زنجیر، اس کے وجود کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتی

رہتی، دن بھر کی ٹھکن کے باوجود اسے بہت دیر میں نیند آتی تھی۔ تکلیف دہ خیالات کی زنجیر سے خود کو آزاد کرنے

کی کوشش میں وہ کروٹ پہ کروٹ لیے جاتا اور رات کے کسی پہر نیند اپنی مہربان آغوش میں اسے لے لی

☆☆☆

نیلے رنگ کے جارجٹ کے سوٹ میں وہ میرے کی طرح دمک رہی تھی۔ جدید انداز کا بے حد فٹنگ کا

سوٹ، اس کا دو پٹا بار بار پھسل پھسل کر، دعوتِ نظارہ دیتے حسن سے، دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ کر رہا تھا، اور

ویسے بھی نگاہیں بھی کون سی زیادہ تھیں۔ کل چار نظر یہ تھیں۔ دو اس کے شوہر سرد کی، جن میں بے وقوفی کی حد

تک سادگی اور بیوی کے بے پناہ حسن سے بے نیازی تھی۔ دوسری دو نگاہیں اس کے دوست جمال کی تھیں، ان

آنکھوں میں وہ سب کچھ تھا جو اس کے دل میں تھا، لالچ، ہوس، عیاری، مکاری اس کے ناپاک غلیظ جذبات اس

کی آنکھوں سے جھلکتے تھے مگر سردان سب سے مکر عاقل تھا۔



”میں نے سوچا، بھابھی گھر آگئی ہیں، کیوں نا اس خوشی میں ٹریٹ ہو جائے۔ یہ لیس بھابھی! جلدی نہیں پلٹوں میں نکال لیں، بڑے زوروں کی جھوک لگ رہی ہے۔“ جمال نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے بڑے بڑے شاپر زنا مکہ کی طرف بڑھائے جنہیں کھولے بغیر ہی ان سے انواع و اقسام کی خوشبوئیں آرہی تھیں۔

”آپ نے کیوں زحمت کی جمال بھائی! ٹریٹ تو ہماری طرف سے ہونی چاہیے تھی۔“ نائلہ نے شاپر زنا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے رسما کہا۔

☆☆☆

”ان تکلفات کو چھوڑیں بھابھی! ٹریٹ آپ کی طرف سے ہو یا میری طرف سے ایک ہی بات ہے۔“ جمال نے گویا ناک پر سے بھی کواڑ لایا۔

”ایک ہی بات کیسے ہے۔ ہماری طرف سے ٹریٹ ہوتی تو زیادہ سے زیادہ آلو گوشت سے آپ کی تو ہنر ہو جاتی۔ آپ تو ماشاء اللہ دل کے بھی تخی، ہاتھ کے بھی تخی، کتنا چراپوں ہی کر ڈالتے ہیں۔“ نائلہ نے تیز جھوٹے ہوئے شوہر کی کم مائیگی کو جتایا۔

سرمد محض پہلو بدل کر رہ گیا۔ اور جمال نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”جب وقت آئے گا تو آپ بھی اپنے خزانوں کے منہ کھول دیتا۔ ابھی تو بس ہماری سخاوت سے فائدہ اٹھائیں۔“ اس نے انتہائی معنی خیز انداز میں کہا۔

نائلہ نے شاپر زحکول کر ایک ایک کر کے چیزیں نکالنی شروع کیں۔ مٹن بریانی، فرائی فش، چکن تکر چٹنیاں، رائیہ، سلاد اور میٹھے میں رس ملائی اور آکس کریم، اس نے باقی چیزیں نکال کر آکس کریم فریزر میں رکھ دی تاکہ پکھلنے سے بچے۔

دستر خوان لگا کر وہ کھانے بیٹھے ہی تھے کہ اچانک نائلہ کو کچھ خیال آیا۔

”سب کچھ تو جمال بھائی اپنی جیب سے لے ہی آئے، اب تم کم از کم کوئلڈ ریک ہی لے آؤ۔“ وہ آہستہ سے سرمد سے مخاطب ہوئی۔

”لے آتا ہوں۔“ وہ فرماں برداری سے سر ہلاتا ہوا کوئلڈ ریک لینے نکل گیا۔

”ایک منٹ جمال بھائی! میں گلاس لے آؤں، پھر بار بار اٹھنا پڑے گا۔“ نائلہ دسترخوان سے اٹھی، وہ کھڑی ہوئی اور اس کا دوپٹہ پھسل کر نیچے ڈھیر ہو گیا۔

”افوہ، ایک تو یہ آپ کا دوپٹہ بڑا تنگ کرتا ہے۔“ جمال وہیں بیٹھا تھا، اس کے دوپٹے کو ہاتھ میں لے کر نائلہ کے سینے کے کھڑ ہو گیا۔

”ایک طرف پھینک کیوں نہیں دیتیں اسے۔“ نائلہ کے سانچے میں ڈھلے انتہائی حسین پیکر کو اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”اللہ جمال بھائی، مذاق مت کریں دو پٹا دیں۔“ نائلہ کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کس حالت میں، کس کے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے لا پرواہی سے کہتے ہوئے دو پٹا جمال کے ہاتھ سے جھپٹا اور گلاس لینے چل دی۔

”سچ کی خوشی میں پہلوانوالہ میرے ہاتھ سے۔“ اس کے دسترخوان پر بیٹھے ہی جمال نے اسے مخاطب کیا۔

”ہمارے میاں کو تو توفیق نہ ہوئی تھی ایسی باتیں کرنے کی۔“ نائلہ نے منہ بنایا۔

”آپ کا شوہر تو بدھو ہے بالکل آپ کو تو کوئی قدر دان ملنا چاہیے تھا۔ ہیرے کی قدر تو جوہری ہی کر سکتا ہے۔“ جمال نے ایک نایدہ روئی تار اس کے گرد بنا۔

”کھاؤ نا بھئی! جمال نے بے تکلفی سے چکن تکر کھڑ اس کے منہ میں ٹھونکا۔

”اول۔ ہوں۔“ وہ بیک وقت کھا بھی رہی تھی اور نہس بھی۔

سرمد کوئلڈ ریک لے کر آیا تو جمال اپنے ہاتھوں سے اسے دو تین تکر کھلا چکا تھا۔ اس کے آنے پر دونوں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

جمال آج جیہاں سے رخصت ہوا تو وہ بہت خوش تھا۔ آج اکٹھے کی قدم آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی منزل کی طرف، گھر واپسی کا سفر اس نے بڑی سرخوشی کے عالم میں طے کیا تھا۔

صفائی ستھرائی عمومی مہمانوں کی آمد پر ڈرائنگ روم پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ پردے، صوفے، کشن، ٹالیچ، حجابی اشیاء سے — ہر ایک شے پہ ایک نیا جوبن، نئی بھاری۔

مہمانوں کے بارے میں یہ بتا تھا کہ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ عالیہ بیگم کی کسی جاننے والی کے محلے دار تھے تعریف اور تعارف تک بتایا گیا تھا کہ اچھے خاندانی لوگ ہیں، بولی فصیح اعظم گڑھ کے تھیں۔ لڑکے کے پردادادی وہاں بہت بڑی زمین داری تھی، قیام پاکستان سے قبل لڑکے کے دادا اپنے علاقے کے ایک مشہور اور قابل وکیل تھے۔

پاکستان بننے کے بعد وہ یہاں آ گئے۔ لڑکے کے والد ہیر سڑ تھے۔ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ آج اس فیملی کے افراد حصہ کوڈ کھینچے آ رہے تھے، عالیہ بیگم نے اپنی ساس صاحبہ کے حضور ساری تفصیلات گوش گزار کیں۔

مہمان مقررہ وقت سے ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہو گئے تھے۔ انتظار کر کر کے سب بے زار ہو گئے۔ حصہ کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ عالیہ بیگم بار بار اپنی جاننے والی کا نمبر ملا تیں اور رابطہ نہ ہونے پر مایوس ہو کر موبائل رکھ دیتیں۔ شوہر صاحب اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ باتیں کرتے رہے پھر وہ اونگھنے لگیں تو وہ بی۔ وی۔ لاؤنج میں اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ مانی اپنی پڑھائی میں مصروف تھا، بمبئی لیپ ٹاپ پر مصروف ہوئی۔ بیرون ملک مقیم دو چار گزرنے سے کمپیوٹر کے ذریعے بڑی اچھی دوستی ہو گئی تھی، اکثر ہی یہ لوگ آپس میں رابطے میں رہتے، ماریہ سب کی مصروفیات دیکھ دیکھ کر بور ہونے لگی تو آ کر دادی کے سر ہوئی۔

”دادی حضور۔“

”اوں۔“ وہ آنکھیں بند کیے کیے ہی بولیں۔

”آپ کے لیے چائے لاؤں۔“ ماریہ نے انہیں جگانے کا نسخہ سوچا، حالانکہ وہ کون سا چمچ سو رہی تھیں۔

”چائے۔ مہمان آ گئے کیا۔“ انہوں نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔

”اللہ جانے کب آئیں گے، ہم تو انتظار کر کر کے سوکھ گئے۔“ ماریہ نے منہ بنایا۔ گاؤں ٹکلیہ ٹھیک کیا اور ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔

”دادی! عرفانہ آئی ہیں نا برابر والی۔“

”ہوں۔“

”انہوں نے سمیر بھائی کی معافی ختم کر دی۔“

”کیوں۔“ ماریہ کی توقع کے عین مطابق دادی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”کہہ رہی ہیں کہ اسے ہم پلہ لوگ دیکھیں گے جو اپنی بیوی کو خوب سارا جھڑ اور دادا کو سلامی میں گاڑی دے سکے۔“

”تو پہلے ہی ڈھونڈ لیتی ایسا گھرانہ، پانچ سال پہلے کی معافی رکھنے کے بعد اب خیال آیا ہے۔“

”ہاں، دیکھیں ذرا، کتنی اچھی، کتنی پیاری تھیں نا سمیر بھائی کی منگیت، پھر ہیں بھی ان کی کزن۔ سنا ہے سمیر بھائی خوش نہیں ہیں اپنی معافی ختم ہونے سے۔“ ماریہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

”تمہاری عرفانہ آئی تو مجھے شروع سے ہی پسند نہیں ہے، اس کا تو وہ حساب ہے کہ آپ خود رہے آپ سرادے، چٹنی دیر بات کرو بس اس کے قصیدے سنتے رہو۔ نو دو لیتے کہیں کے۔ جب سے پیسہ گھر میں آیا ہے خود



کوشاخ زعفران سمجھنے لگی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ سگی بہن بھانجی کولات مار دی، وہ بھی چند ٹکوں کے پیچھے۔ ارے پیرے ہاتھ کا میل ہے، آج میرے پاس، کل تیرے پاس، شریفوں میں وضع داری ہوئی ہے، زبان کا، عہد کا پاس ہو ہے، دوسرے کی عزت کا خیال ہوتا ہے۔ یہ ٹھوڑی کہ گھائی کی میری، تولے کی تیری، خود غرض لاچی کہیں کی۔“ دادی نے عرفانہ آنٹی کے غائبانہ لٹے لٹے شروع کر دیے۔

”آج کل روزانہ لڑکیاں دیکھو دیکھ کر آ رہی ہیں۔“ ماریہ ایک ایک کر کے خرابی پٹاری سے نکال رہی تھی۔

”ہاں تو ڈھونڈ بھی لے گی کوئی اپنے مطلب کی، ہوشیار تو ہے ہی۔ آپ ڈال ڈال، میں پات پات پھر جب سے چار پیسے گھر میں آئے تو چار عقل اور آگئی۔“

”چار پیسے آنے سے چار عقل آتی ہے تو یہ جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں ان کی عقل کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ ہیں، دادی۔“

”محاورہ ہے بیٹی، لا چاری پر بت سے زیادہ بیماری ہتی ہے، اللہ تعالیٰ اتنا ضرور دے کہ عزت کے ساتھ ضروریات پوری ہوتی رہیں، چار پیسہ ہو تو چار عقل آتی ہے، پیسہ ہاتھ میں نہ ہو تو آئی عقل بھی چلی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ سب کی خیر رکھے۔“

”اور یہ تمہیں عرفانہ کے گھر کی خبریں کس نے دے دیں۔“ دادی کو اچانک خیال آیا۔

”ان کی بہن آئی تھیں کل امی کے پاس، آپ دوائی کھا کر سو رہی تھیں، اس لیے امی نے اٹھایا نہیں۔ دادی وہ رو رہی تھیں، کہہ رہی تھیں کہ سگی بہن سے ایسی مید نہیں تھی، پانچ سال مٹکی رہی اور پھر توڑ دی۔ لوگ باتیں بنارہے ہیں۔“

”اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ دادی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”بزرگ کہا کرتے تھے کہ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے، ارے بھئی ایک تو اپنوں کی مار، غیروں کی مار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے پھر مارنے کے بعد کوئی چھاؤں میں ڈالے یا دھوپ میں، کیا فرق پڑتا ہے۔“

”دادی! آپ کا وہ سچے موتیوں والا سیٹ ہے نا۔“ ماریہ نے اب اصل بات کی تمہید باندھی۔

”ہاں، تو۔“ دادی چونکی ہوئیں۔

”آپ نے کہا تھا وہ سیٹ آپ مجھے دے دیں گی۔“ ماریہ نے انہیں یاد دلایا۔

”حسنہ کی شادی ہے۔“ دادی نے مکمل ڈیل بیان کی جو ان دونوں میں ہوئی تھی۔

”ہاں تو آپ کی شادی پر ہی کہہ رہی ہوں۔ آج آ تو رہے ہیں مہمان، انہیں دیکھنے، رشتہ طے ہو جائے گا پھر شادی بھی ہو جائے گی۔“ ماریہ کا انداز بچوں والا تھا۔

”ماشاء اللہ، یوں پھٹلی پہ سروس نہیں جتنی بیٹا! مہمانوں کو آنے تو دو، پھر ہی کچھ پتا چلے گا، تم نے تو بیٹھے بیٹھے ہی محل کھڑا کر دیا۔“ دادی کو لگی آگئی۔

”ہائے دادی! سچ کا نہ سہی، خیالوں میں ہی محل کھڑا کر لیں۔“ ماریہ نے ایک آہ بھری۔

”تو بیٹا یہ محلوں میں رہنے والے سب ہی لوگ سہی ہوتے ہیں کیا۔ دل کی خوشی اطمینان اور قناعت کی دولت معمولی سے گھر میں بھی مل تو جائے تو مجھو بیڑا پار ہے، اللہ مغفرت کرے ہمارے ابا مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر چہ گیر یہ مختصر گیر یہ مطلب یہ کہ جو کچھ لو، تو خودی چیز پر قناعت کرو، زیادہ کی ہوس مت کرو۔“

”دادی حضور! پھر بچا غالب کیوں کہہ گئے کہ۔“ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“ ماریہ نے کتے اعتراض اٹھایا۔

”بھئی۔ وہ ٹھہرے شاعر! اپنے اشعار میں کچھ بھی مضمون باندھ سکتے ہیں، ہم کوئی غالب کے شارح تو

نہیں، نہ غالب کو زیادہ سمجھنے کا دعو ہے، مگر اس مصرعہ میں ہزاروں خواہشوں سے مراد زرو جواہر یا تو نگری کی خواہش نہیں ہے۔

”ہماری بچہ نے تو یہی بتایا تھا۔“

”اے ابا سے پوچھنا۔ اس معاملے میں ان کا علم اور مطالعہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔“

”ابا بچی دو گھنٹے کی کلاس کون لے۔“ ماریہ نے کاہلی اور سستی کے عالم میں آنکھیں بند کیں۔ عین اسی وقت بینک کی بیل بجی۔ ”مہمان آ گئے۔“ ماریہ کی ساری سستی، کاہلی اک دم غائب ہو گئی، وہ ایک چھلانگ مار کر تخت سے نیچے اترتی۔

”وہی جرج۔“ بیٹا اتنی جلدی کس بات کی ہے۔“ دادی نے اسے ٹوکا۔ ”دو بیٹا ٹھیک کرو۔“

”کر رہی ہوں دادی حضور! ایک منٹ۔“ ماریہ نے جلدی جلدی ہاتھوں سے کپڑوں کی نادیدہ شکنیں دور کیں دو بیٹا ٹھیک سے اوڑھا۔

”کیسی لگ رہی ہوں۔“ شفاف، بے ریا آنکھیں، بھولے بھالے چہرے پہ کم عمری کا پائین، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیوں نے چہرے کی آرائش کر رکھی تھی۔

”ماشاء اللہ، میری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔“ دادی کو جی بھر کے اپنی لاڈلی، معصوم پوتی پہ پیار آیا۔

”افو، کہیں ایسا نہ ہو کہ مہمانوں کو ہماری یہ پری پسند آ جائے۔“ انہیں شرارت سوچھی۔

”دادی۔“ ماریہ نے ٹھیک کر آنکھوں میں ناراضی بھر کے انہیں دیکھا۔ اس کے خواب ابھی صرف اور صرف پڑھائی اور اے کیریئر کے متعلق تھے۔

”چلو بھئی۔ ذرا مہمانوں کو بھی دیکھ لیں۔“ دادی آگے آگے ہو لیں پوتی پیچھے پیچھے۔

☆☆☆

کینٹی میں دودھ ڈال کر اس میں تپی چینی ڈالی اور اسے چولہے پر رکھ کر ابلنے کا انتظار کرنے لگی۔ قریشی صاحب اور فرمان صاحب کے ساتھ آج مختل جی تھی۔ مذہب، سیاست، معاشرہ کتنے ہی موضوعات تھے جن پر خیال آرائی کی گئی۔ اب سید صاحب اپنے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے بچن میں آ گئے تھے۔ گھر کے، خصوصاً ماہن کے بہت سے کام وہ بخوبی سرانجام دے لیتے تھے۔ حالات نے سب کچھ سکھا دیا تھا، ٹرے میں تین کپ چائے لے کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آ گئے۔

”بھئی سید صاحب! بیٹی کو رخصت کیا تھا تو ایک، بھو بھی گھر میں لے آتے، ہانڈی چولہے کی مشقت سے بچتے۔“ فرمان صاحب نے باؤں بلندگی بار کا دیا ہوا مشورہ آج پھر دیا۔

”ندیم راضی نہیں، کہتا ہے کچھ سنگینش ہو جاؤں، پھر شادی کروں گا۔ ویسے تو گھر کے کام کاج کا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جلدی دن میں آ کر سب کام کر جاتی ہیں۔ کھانا وغیرہ بھی پکا کر رکھ جاتی ہیں۔ ہر ماہ خواہ دے دیتے ہیں ان کو، تو فی الحال تو گزرا ہوا چل ہی رہا ہے مگر ہاں یہ ہے کہ گھر میں ایک عدد عورت کی موجودگی ضروری ہے۔ سو بکھرے ہوتے ہیں، سوا بگھنیں، ہم کہاں تک ان سے بچیں۔“

”تو کہیں رشتہ تو دیکھیں۔ بات چلائیں، رشتہ طے ہو جائے گا تو صاحبزادے ابھی رسد ترا کر بھاگ رہے ہیں آ کر خود ہی کھونٹے سے بندھ جائیں گے۔“ قریشی صاحب نے انہیں صلاح دے کر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”دیکھتے ہیں، آپ چائے تو لیں۔“ سید صاحب زیر لب مسکرائے۔

”آپ کہیں تو کسی سے ذکر کروں آگے بڑکی دیکھنے کے لیے۔“ فرمان صاحب نے ذرا آگے جھک کر راز دارانہ انداز میں کہا۔



کوشاخ زعفران سمجھنے لگی ہے۔ بھلا بتاؤ۔ سگی بہن بھانجی کولات مار دی، وہ بھی چند لگوں کے پیچھے۔ ارے ہاتھ کا میل ہے، آج میرے پاس، کل تیرے پاس، شریفوں میں وضع داری ہوتی ہے، زبان کا، عہد کا پاس ہے، دوسرے کی عزت کا خیال ہوتا ہے۔ یہ تھوڑی کہ گھائی کی میری، تو لے کی تیری، خود غرض لاجی کی۔“ دادی نے عرفانہ آنٹی کے غائبانہ لہجے میں شروع کر دی۔

”آج کل روزانہ لڑکیاں دیکھ کر آ رہی ہیں۔“ ماریہ ایک ایک کر کے خرابی پٹاری سے نکال رہی تھی ”ہاں تو ڈھونڈ بھی لے کی کوئی اپنے مطلب کی، ہوشیار تو ہے ہی۔ آپ ڈال ڈال، میں پات پات جب سے چار پیسے گھر میں آئے تو چار عقل اور آگئی۔“

”چار پیسے آنے سے چار عقل آتی ہے تو یہ جو کروڑ پتی اور ارب پتی ہیں ان کی عقل کا کیا ٹھکانا ہوگا۔“ دادی۔

”محاورہ ہے بیٹی، لا چاری پر بت سے زیادہ بھاری ہتی ہے، اللہ تعالیٰ اتنا ضرور دے کہ عزت کے ساتھ ضروریات پوری ہوتی رہیں، چار پیسہ ہو تو چار عقل آتی ہے، پیسہ ہاتھ میں نہ ہو تو آئی عقل بھی چلی جاتی ہے، تعالیٰ سب کی خیر رکھے۔“

”اور یہ تمہیں عرفانہ کے گھر کی خبریں کس نے دے دیں۔“ دادی کو اچانک خیال آیا۔

”ان کی بہن آئی تھیں کل امی کے پاس، آپ دوانی کیا کر سورتی تھیں، اس لیے امی نے اٹھایا نہیں۔“ دادی وہ رو رہی تھیں، کہہ رہی تھیں کہ سگی بہن سے ایسی میڈ نہیں تھی، پانچ سال منگنی رہی اور پھر توڑ دی۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔“

”اللہ بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ دادی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”بزرگ کہا کرتے تھے کہ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے، ارے بھی ایک تو اینوں کی مار، غیروں کی مار سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے پھر مارنے کے بعد کوئی چھاؤں میں ڈالے یا دھوپ میں، کیا فرق پڑتا ہے۔“ دادی! آپ کا وہ سچے موتیوں والا سیٹ ہے نا۔“ ماریہ نے اب اصل بات کی تمہید باندھی۔

”ہاں تو،“ دادی چونکی ہوئیں۔

”آپ نے کہا تھا وہ سیٹ آپ مجھے دے دیں گی۔“ ماریہ نے انہیں یاد دلایا۔

”حسنہ کی شادی ہے۔“ دادی نے مکمل ڈیل بیان کی جوان دونوں میں ہوئی تھی۔

”ہاں تو آپ کی شادی پر ہی کہہ رہی ہوں۔ آج آ تو رہے ہیں مہمان، انہیں دیکھنے، رشتہ طے ہو جائے گا پھر شادی بھی ہو جائے گی۔“ ماریہ کا انداز بچوں والا تھا۔

”ماشاء اللہ، یوں تھکی ہوئی ہیں، سوئیں، جی بیٹا! مہمانوں کو آنے تو دو، پھر ہی کچھ پتا چلے گا، تم نے تو بیٹھے بیٹھے ہی محل کھڑا کر دیا۔“ دادی گولی آ گئی۔

”ہائے دادی! اچانک کا نہ سہی، خیالوں میں ہی محل کھڑا کر لیں۔“ ماریہ نے ایک آہ بھری۔

”تو بیٹیا یہ محلوں میں رہنے والے سب ہی لوگ سکھی ہوتے ہیں کیا۔ دل کی خوشی اطمینان اور قناعت کی دولت معمولی سے گھر میں بھی مل تو جائے تو مجھو بیڑا پار ہے، اللہ مغفرت کرے ہمارے ابا مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہر چہ گیر یہ مختصر گیر یہ مطلب ہے کہ جو کچھ تو توڑا تو توڑی چیز پر قناعت کرو، زیادہ کی ہوس مت کرو۔“

”دادی حضور! پھر بچا غالب کیوں کہہ گئے کہ۔“ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔“ ماریہ نے کلمہ اعتراض اٹھایا۔

”بھئی۔“ وہ ٹھہرے شاعر! اپنے اشعار میں کچھ بھی مضمون باندھ سکتے ہیں، ہم کوئی غالب کے شارح تو

”ہماری سچر نے تو یہی بتایا تھا۔“

”انہیں اب اسے پوچھنا۔ اس معاملے میں ان کا علم اور مطالعہ ہم سے کہیں زیادہ ہے۔“

”ابا کی دو گھنٹے کی کلاس کون لے۔“ ماریہ نے کاہلی اور سستی کے عالم میں آنکھیں بند کیں۔ عین اسی وقت

بٹ کی بیل بجی۔ ”مہمان آ گئے۔“ ماریہ کی ساری سستی، کاہلی اک دم غائب ہو گئی، وہ ایک چملانگ مار کر سخت

بچے اترتی۔

”دھیرج۔ بیٹا! اتنی جلدی کس بات کی ہے۔“ دادی نے اسے ٹوکا۔ ”دو پٹا ٹھیک کرو۔“

”دیکھ رہی ہوں دادی حضور! ایک منٹ۔“ ماریہ نے جلدی جلدی ہاتھوں سے کپڑوں کی نادیہ شکنیں دور

کر دیں اور دو پٹا ٹھیک سے اوڑھا۔

”کیسی لگ رہی ہوں۔“ شفاف، بے ریا آنکھیں، بھولے بھالے چہرے پہ کم عمری کا بائکین، کانوں میں

ٹی چھوٹی بایلوں نے چہرے کی آرائش کر رکھی تھی۔

”ماشاء اللہ، میری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔“ دادی کو جی بھر کے اپنی لاڈلی، معصوم پوتی پہ پیار آیا۔

”افوہ، کہیں ایسا نہ ہو کہ مہمانوں کو ہماری یہ پری پسند آ جائے۔“ انہیں شرارت ہو گئی۔

”دادی۔“ ماریہ نے ٹھٹھک کر آنکھوں میں ناراضی بھر کے انہیں دیکھا۔ اس کے خواب ابھی صرف اور صرف

حاکمی اور اپنے کیریئر کے متعلق تھے۔

”چلو بھئی۔ ذرا مہمانوں کو بھی دیکھ لیں۔“ دادی آگے آگے ہوئیں پوتی پیچھے پیچھے۔

☆☆☆

کیتلی میں دو وہ ڈال کر اس میں بی بی چینی ڈالی اور اسے چولہے پر رکھ کر ایلنے کا انتظار کرنے لگی۔ قریشی

احب اور فرمان صاحب کے ساتھ آج مختل جی تھی۔ مذہب، سیاست، معاشرہ کتنے ہی موضوعات تھے جن پر

آل آرائی کی گئی۔ اب سید صاحب اپنے مہمانوں کی خاطر داری کے لیے کچن میں آ گئے تھے۔ گھر کے، خصوصاً

بچن کے بہت سے کام وہ بخوبی سرانجام دے لیتے تھے۔ حالات نے سب کچھ سکھا دیا تھا، ٹرے میں تین کپ

ہائے لے کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آ گئے۔

”بھئی سید صاحب! بیٹی کو رخصت کیا تھا تو ایک بہو بھی گھر میں لے آتے، ہانڈی چولہے کی مشقت سے بچتے۔“ فرمان صاحب نے با آواز بلند گئی بار کا دیا ہوا مشورہ آج پھر دیا۔

”مندیہم راضی نہیں، کہتا ہے کچھ اسٹیکش ہو جاؤں، پھر شادی کروں گا۔ ویسے تو گھر کے کام کاج کا اتنا بڑا

مسئلہ نہیں ہے جلد بی بی دن میں آ کر سب کام کر جاتی ہیں۔ کھانا وغیرہ بھی پکا کر رکھ جاتی ہیں۔ ہر ماہ خواہ دے

دیتے ہیں ان کو، تو فی الحال تو گزارہ چل ہی رہا ہے مگر ہاں یہ ہے کہ گھر میں ایک عدد عورت کی موجودگی ضروری

ہے۔ سو بکھیرے ہوتے ہیں، سوا بھینس، ہم کہاں تک ان سے تھیں۔“

”تو تمہیں رشتہ تو دیکھیں۔ بات چلا میں، رشتہ طے ہو جائے گا تو صاحب زادے ابھی رسہ ٹوا کر بھاگ رہے

ہیں آ کر خود ہی کھوٹے سے بندھ جائیں گے۔“ قریشی صاحب نے انہیں صلاح دے کر ایک زوردار تہقید لگایا۔

”دیکھتے ہیں، آپ چائے تو لیں۔“ سید صاحب زیر لب منسکرائے۔

”آپ کہیں تو کسی سے ذکر کروں آگے، لڑکی دیکھنے کے لیے۔“ فرمان صاحب نے ذرا آگے جھک کر راز

دارانہ انداز میں کہا۔



”لجئے ایہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔“ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھیں اور بتائیں سید صاحب کو تاکہ اسے اڑیل ٹوک کھوٹے سے باندھیں۔“ قریشی صاحب ذرا ہنسوز طبیعت کے تھے، خود تو ہنستے ہی تھے، دوسرے کو بھی ہنساتے تھے۔

”تو پھر سید صاحب! مسجد کمیٹی کی صدارت سے انکار کیوں کر دیا؟“ فرمان صاحب نے دیر سے نوکر زبان پر چلتا ہوا سوال پوچھ ہی لیا۔

”بس یونہی فرمان بھائی! خود کو اس قابل نہیں سمجھتا، اس لیے انکار کر دیا۔“ سید صاحب نے چائے کی چمکی لیتے ہوئے رمان سے جواب دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا، آپ جیسے نیک، معزز اور ایمان دار لوگ پیچھے رہیں گے تو کرپٹ افراد کو اپنی من مانی کرنے اور اگے آنے کا موقع ملے گا۔“ قریشی صاحب گویا تڑپ کر بولے۔

”بعد میں دیکھیں گے، ابھی تو شاید اعزاز صاحب کو یہ عہدہ تفویض کیا جا رہا ہے۔“ سید صاحب نے بات ہی ختم کر دی۔

☆ ☆ ☆  
گیارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ وہ کبھی گھڑی کی طرف دیکھتیں، کبھی دروازے کی طرف، احمد ابھی تک نہیں آیا تھا۔ انہیں تشویش ہو رہی تھی، بیٹا اس وقت تک تو گھر آ جاتا تھا، شہر کے حالات کے سبب ان کی تشویش، فکر اور پریشانی بے جا نہ تھی۔

آدھا دن احمد کاج میں ہوتا تھا، وہ بی کام کر رہا تھا۔ پھر شام چار بجے سے رات دس بجے تک ایک جنرل اسٹور میں پارٹ ٹائم ملازمت کرتا تھا۔ ساڑھے دس، پونے گیارہ تک وہ گھر ضرور پہنچ جاتا تھا مگر آج آدھ گھنٹہ اوپر ہو گیا تھا اور وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”فون ملا۔“ وہ بار بار بے چینی سے عانشہ سے پوچھ رہی تھیں، جو کئی بار احمد کا نمبر ٹرائی کر چکی تھی مگر حال اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

”نہیں امی! موبائل آف ہے شاید۔“ عانشہ نے نفی میں ہرلایا۔

”اللہ خیر کرے، نہ جانے کیا بات ہے، اگر دیر ہو بھی گئی تھی تو بتا دیتا نہ اس نے فون کیا، نہ یہاں سے کال جارہی ہے۔“ امی کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اندر آنکھوں میں خوف و خدشات کے سائے تھے۔

پریشان نہ ہوں امی! کیا پتا دکان پر دیر ہو گئی ہو، آرہے ہوں گے بھائی۔“ عانشہ نے ماں کو متشکر دیکھ کر تسلی دی حالانکہ اندر ہی اندر پریشان تو وہ بھی ہو رہی تھی مگر اس نے خود کو ماں کے سامنے پرسکون رکھا ہوا تھا۔

وہ زیر لب دعائیں پڑھ پڑھ کر احمد کی سلامتی اور عافیت کی دعائیں مانگ رہی تھیں، جب ساڑھے گیارہ بجے دروازے پر مانوس دستک ہوئی، یہ احمد ہی تھا ماں نے یہ مانوس دستک سن کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک گہرا سانس سکون کا لیا۔ عانشہ فوراً دروازہ کھولنے لگی۔

”السلام علیکم!“ احمد تھکا ہارا گھر میں داخل ہوا اور ماں کے پاس تخت پر لیٹ گیا۔

”بڑی دیر لگادی آج، میرا اتنی ہول رہا تھا کہ جانے کہاں رہ گیا، ابھی تک آیا کیوں نہیں۔“ امی نے بیٹے کو گھر پہنچنے کے ساتھ موجود پایا تو ان کی جان میں جان آئی، پھر بھی وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

”بھائی، پانی۔“ احمد کے جواب دینے سے قبل ہی عانشہ گلاس میں پانی لے آئی۔

”جزاک اللہ۔“ احمد نے اٹھ کپانی پیا، اور گلاس واپس عانشہ کو دیا۔

”ڈبل سواری پہ پابندی لگ گئی ہے نا۔ سرور بھائی لفٹ دے دیتے تھے گھر تک۔ اب آج ویگن سے آیا

ہوں۔ گھر کے قریب اترتا تو دو بیس بیلنی پڑتیں، ایک ہی ویگن میں آیا ہوں۔ ایک اسٹاپ پیدل چل کر گھر پہنچا ہوں۔ موبائل کی جارنگ ختم ہو گئی تھی، اس لیے کوئی رابطہ بھی نہیں کر سکا۔“ احمد بولتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا۔

”میں روٹیاں ڈال لوں، پھر کھانا لگاتی ہوں۔“ عانشہ کچن میں چلی گئی۔

”آج پھر کیس چلی گئی۔“ احمد مسکرایا، وطن عزیز کے باسی اپنے حالات پر کب تک روتے، اب کبھی مسکرا بھی رہتے، اور کبھی ہنس پڑتے۔

”ہاں بیٹا! اب تو معمول بننا جا رہا ہے، بجلی ہوتی ہے تب بھی گیس چلی جاتی ہے، اور بجلی نہ ہو تو گیس لازمی جاتی ہے۔“ وجہ یہ تھی کہ لوڈ شیڈنگ کے ٹائم میں لوگ جزیئر چلاتے اور پٹرول کی قیمت آسمان کو چھونے کے باعث تقریباً سب ہی جزیئر مالکان اپنے جزیئر گیس پر چلاتے تھے۔ ادھر محلے بھر کے کئی گھروں میں جزیئر اشارت ہوتے ادھر سب گھروں میں چولہوں کی آگ ختم ہو جاتی۔ اب جس کو چولہے پر کچھ پکانا ہو وہ ڈھائی تین گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ختم ہونے کا انتظار کرے۔

گھر میں احمد کے آنے پر تینوں ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ سو عانشہ بھائی کے آنے پر فائٹ روٹیاں پکاتی اور دھڑخان لگا دیتی، اب بھی اس نے پھرئی سے روٹیاں پکائیں اور کھانا چن دیا۔ ماش کی پھریری دال، مٹی ہوئی مرغیں اور اچار۔

”سرور بھائی اگلے مہینے سے دوسرو پے بڑھا دیں گے۔“ احمد نے کھانے کے دوران بتایا۔

”شکر ہے اللہ کا، وہ مسبب الاسباب ہے اور کچھ نہیں تو گیس کا بل بھرنے میں آسانی ہو جائے گی۔“ امی نے حسب عادت فوراً شکر ادا کیا۔

یہ شکر تو شایدا ان کی گھٹی میں پڑا تھا، اٹھے بیٹھے، دن بھر میں سینکڑوں بار وہ کتنی ہی باتوں پر کلمہ شکر منہ سے ادا کرتی رہتی تھیں، عانشہ اور احمد اپنے بچپن سے ہی ماں کے اس انداز کے عادی تھے، مگر کبھی کبھی وہ ایسی باتوں پر بھی شکر ادا کرتی تھیں کہ عانشہ حیران ہو کر بے اختیار سوال کر بیٹھتی تھی، سر میں درد ہو، بخار یا کوئی اور جسمانی تکلیف، وہ اس حال میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتیں۔ احمد عانشہ کی تکلیف سے دوچار ہوتے تو انہیں بھی شکر کی تلقین۔

”بیماری میں کس بات کا شکر، آپ ہی تو کہتی ہیں کہ شکر کرنے سے اللہ اور زیادہ دیتا ہے، بیماری کا شکر کریں تو بیماری بڑھے گی نہیں۔“ عانشہ چڑ جاتی۔

”شکر بیماری کا نہیں، اس بات کا ہے کہ اللہ نے اس سے بڑھ کر کسی اور تکلیف میں مبتلا نہیں کیا اور مومن کے لیے دکھ اور بیماری میں بھی اجر کمانے کا موقع ہے اگر صبر کرے تو پھر دنیا کی تکلیف ہے تم ہو ہی جائے گی اللہ آخرت میں ہر آفت اور دکھ درد سے محفوظ رکھے۔“

☆ ☆ ☆

ایک دو تین۔ اور خوش گوار دن اسے اختتام پر تھا، چاچا نے گھڑی کی سوئیوں پر نظر دوڑائی، مانچ بجنے کو تھے، اپنی بڑھی، تھکی ہوئی آنکھوں کو کچھ لمحوں کے لیے بند کر کے انہوں نے پپوٹوں کو سہلایا اور پھر آنکھیں کھول دیں۔

”السلام علیکم چاچا۔“ سانسے حسن کا ہنسا مسکراتا چہرہ تھا۔

”ارے تو کب آیا۔“ انہیں خوش گوار حیرت ہوئی۔

”بس ابھی ابھی، جب تم جانے کس کے خیالوں میں گم آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔“ وہ مسکرایا۔

”اب بڑھاپے میں کس کے خیال آئیں گے بیٹا اب تو روزانہ بس ایک ہی خیال آتا ہے کہ جانے کب موت کے فرشتے آئیں اور ہمیں لے جائیں۔“ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

”ارے چاچا! ہم تو تمہاری لمبی عمر کی دعائیں کرتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ کے علاوہ کسی اور کی سلامتی تو ہمیں



پسند ہی نہیں آتی۔

”بس بیٹا، ذرہ نوازی ہے آپ لوگوں کی۔“ وہ انکساری سے گویا ہوئے۔

”میرا سوٹ تیار ہے۔“

”بالکل تیار ہے۔“ چاچا نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے حنیف کو آواز لگائی۔

”حنیف! ایک ٹوپیں نکال دے حسن کا۔“

”آیا استاد۔“ حنیف فوراً ہی اس کا سوٹ لے کر حاضر ہو گیا۔

”چاچا! ہمارے دانیال صاحب کو ایک کار بیکر چاہیے، پارٹ ٹائم میں شام چھ سے دس بجے تک۔ دراصل

وہ اپنا نیا بوتیک شروع کر رہے ہیں، بہادر آباد میں۔“ حسن چاچا سے مخاطب ہوا۔

”کیوں بے حنیف! تو جائے گا، ویسے بھی تجھے آج کل پیسوں کی زیادہ ضرورت رہنے لگی ہے۔“ چاچا نے

حنیف سے پوچھا۔

”چلے جائیں گے چاچا، بس اماؤنٹ صحیح ملنا چاہیے۔“ حنیف کی ہانچیں کھل گئی تھیں جب سے اس کی منگنی ہوئی

تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ رقم جوڑنے پر لگا ہوا تھا تا کہ شادی دھوم دھام سے کر سکے۔

”اپنا نمبر دے دے حسن کو، جو بھی بات کرنی ہو کر لیتا۔“

”ہاں، اپنا نمبر بھی دے دو اور میرا بھی لے لو۔“ حسن نے اپنا موبائل جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فجر کی نماز کے بعد وہ معمول کے مطابق درود و خائف پڑھ رہی تھیں، عائنہ ناشتہ بنا کر فارغ ہو چکی تھی اور اب احمد کو آواز لگا رہی تھی۔

”آ رہا ہوں، بس ایک منٹ۔“ وہ جلدی جلدی شرٹ کے بٹن بند کرتا ہوا آیا اور ناشتا کرنے لگا۔

”لیٹ ہو گیا یار۔“ اس نے جلد ہی پراٹھے سے ہاتھ کھینچا۔ جانے کا کب منہ سے لگایا اور اپنا بیک لے کر

ماں کے آگے کھڑا ہو گیا۔ ان کا معمول تھا کہ دونوں بچوں کے باہر نکلنے سے پہلے آیت الکرسی اور دعائیں پڑھ کر

دم کرتی تھیں۔

”بیٹا! ناشتہ تو ٹھیک سے کر لیتے۔“ انہوں نے دم کر کے بیٹے کو فخر اور محبت سے دیکھا، ان کا سختی لائق اور

فرماں بردار بیٹا، دیکھتے ہی دیکھتے اتنا لمبا ہو گیا تھا۔ وہ تو اب اس کے کاندھے تک آتی تھیں۔

”کانٹ میں کچھ کھالوں گا امی! اس وقت تو بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے ہاتھ پہ بندھی گھڑی پہ نگاہ ڈالی

اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

اسٹاپ پہ کھڑا وہ بے چینی سے بس کا انتظار کر رہا تھا۔ روزانہ پڑوس کے کامران انکل اپنی بائیک پر اسے

لفٹ دے دیتے تھے، ان کے آفس کے رستے میں احمد کا کاج پڑتا تھا۔ ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے وہ اکثر

اس سہولت سے محروم ہو جاتا تھا۔ آج بھی وہ اسی لیے بس پر جا رہا تھا۔

بس آئی مگر کھینچ بھڑکی ہوئی۔ بس کی چھت پر بڑی مشکل سے آگے کوٹنے میں جکڑی اسی۔ ڈرائیور تیز رفتاری

کے ساتھ بس کو چلائیں بلکہ اڑا رہا تھا، ایک موڑ کاٹتے ہوئے اتنا زور کا جھٹکا لگا کہ چھت پہ بیٹھے کئی افراد ایک دوسرے

پر لڑھک گئے اور آگے کوٹنے میں بیٹھے احمد اور اس کے ساتھ بیٹھا ایک شخص دونوں فلا بازی کھاتے ہوئے چھت سے

نیچے آن گرے لوگوں کی چیخیں، اچانک لگنے والے بریکوں اور چرچراتے ٹائروں کی آوازیں فضا میں گونج اٹھیں۔

(باقی آئندہ ماہ انشاء اللہ)

”آ رہی تھی کا کیا مطلب ہے۔ اب کیا حیات  
مرگنی ہیں یا تاک نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔“ عادل  
نے کڑے تیروں سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

اس اس کی بات پر گڑبڑا گیا۔

”نہیں، وہ اصل میں جیسے ہی ہم لوگ گلی میں

داخل ہوئے چادلوں کی سونڈھی سونڈھی مہک نے ہمارا

دل خوش کر دیا تو بے اختیار ہی دل سے دعا نکلی تھی کہ

یا اللہ ان چادلوں کو ہمارا اچھی نصیب بنادے۔ اب یہ

گھر میں داخل ہوتے ہی انس اور حیدر کا  
استقبال بریائی کی اشتہا انگیز خوشبو نے کیا۔

عادل چولہے کے پاس بیٹھا بریائی کو غالباً فاسل

چاندے رہا تھا۔

”واؤ زبردست، یہ اس قدر دل بھانے والی

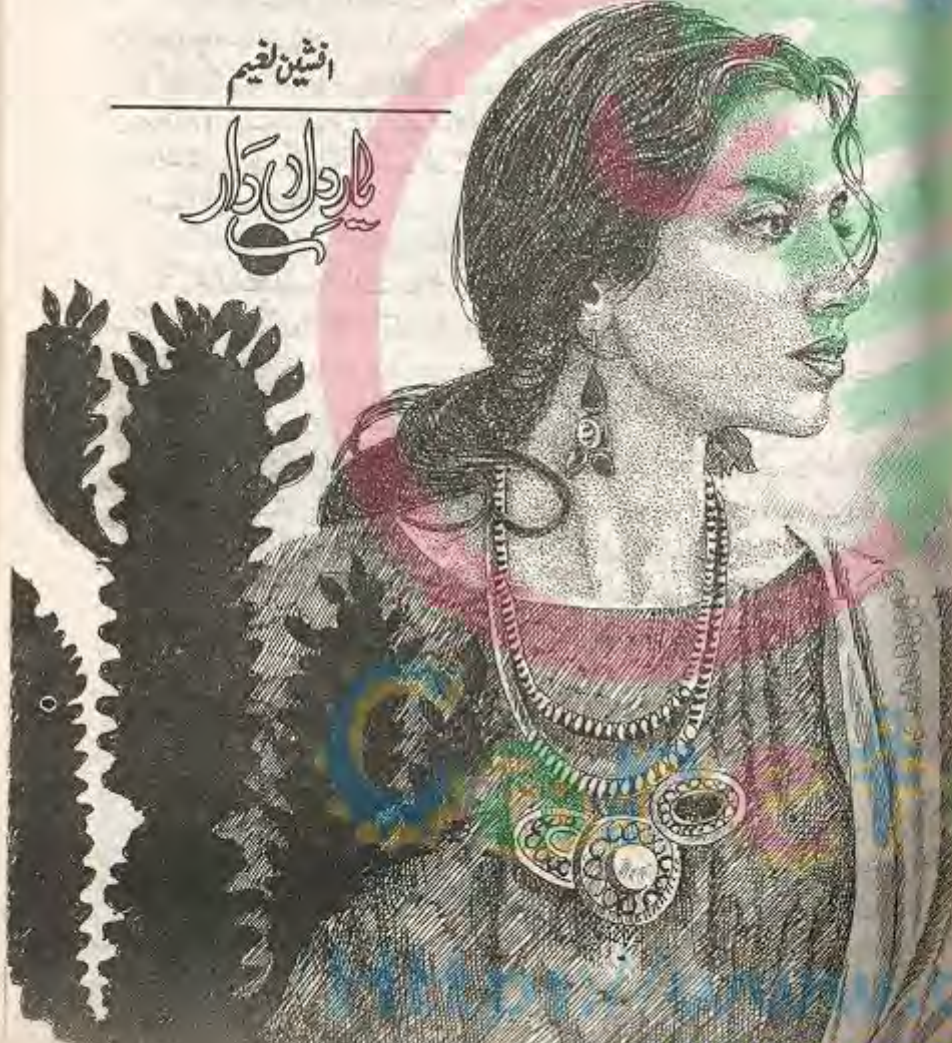
خوشبو ہمارے گھر سے آ رہی تھی۔ یقین نہیں آ رہا

بچھے۔“ انس نے بولے بے ساختہ انداز میں اپنے

جذبات کا اظہار کیا۔

افشین نعیم

دلدار





علم نہیں تھا کہ یہ ہمارا ہی نصیب نہیں گئے۔“ انس نے جلدی جلدی وضاحت پیش کی۔  
”اچھا تو یہ بات تھی۔“ عادل نے سر ہلایا (گویا وضاحت قبول کر لی تھی)۔

عادل سے سلام دعا کے بعد وہ اندر آئے تو احسن کو سلام کاٹتے پایا۔

”بھئی، یہ اتنا اہتمام کس خوشی میں ہو رہا ہے؟“ حیدر نے ایک حیرانگاہانہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو جب گھر آتا تھا تو جناب اعزت مآب عادل صاحب کو بریانی کی تیاری میں مشغول پایا۔

پوچھنے پر محض اتنا بتایا گیا کہ یہ ان کی طرف سے ایک سرپرائز پارٹی ہے۔ اب سرپرائز سے کس خوشی میں یہ وہ بعد میں بتائیں گے۔“ احسن نے کندھے اچکاتے ہوئے معلومات بہم پہنچائیں۔

”مولوی کدھر ہے؟“ حیدر کو محبت اللہ کا خیال آیا۔  
”دہی لینے گیا ہے۔ رائے کے بغیر مولوی کے حلق سے بریانی نہیں اترتی۔“ احسن نے سلام کاٹتے کاٹتے جواب دیا۔

اتنی دیر میں محبت اللہ دہی لے کر آ گیا۔  
”مجھے دیں، میں رائے بناتا ہوں۔“ انس نے اس کے ہاتھ سے دہی لے لیا۔

”بیچے حیدر بھائی! آپ ہم سب کو نکال کر دیں۔ آخر آپ ہم سب سے سینئر ہیں۔“ عادل نے بریانی کا دیگچہ حیدر کے سامنے رکھتے ہوئے ادب سے کہا۔

”اتنی عزت۔“ حیدر کا منہ کھل گیا بارے حیرت کے۔ عادل کی آنکھوں میں جھانکا۔ عادل نے آنکھیں پینپنا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ تو نے حیدر کو سینئر کس حساب سے کہا ہے؟“ احسن کو ایک ہی بات قابل گرفت نظر آئی۔  
”نکاح شدہ ہونے کے حساب سے۔“ عادل نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”ادھ اچھا۔“ حیدر نے سر ہلایا۔

پلیٹوں میں سب کو بریانی دینے کے بعد حیدر نے اپنی پلیٹ میں بریانی نکالی۔ پہلا چمچ منہ میں رکھا۔  
”واہ، بھئی واہ، کیا ذائقہ ہے۔“ حیدر نے تو صنی انداز میں عادل کو دیکھا۔

”اتنی شان دار بریانی بنائی تو نے کہاں سے سیکھی؟“ حیدر نے ایک اور چمچ منہ میں رکھا۔

”یہاں سے۔۔۔۔۔“ عادل نے ایک طرف پڑے بریانی سالے کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔

باقی تمام لوگ خاموشی سے بریانی سے انصاف کرنے میں مشغول تھے۔

”اب تو بتادے بھائی! یہ ٹریٹ ہے کس خوشی میں؟“ احسن نے عادل کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”اصل میں نا۔۔۔۔۔ مجھے ترس آ گیا تھا۔“ عادل نے بریانی کا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

”مجھے، ہم پر ایسا ترس آیا کہ بریانی کی دعوت کر ڈالی۔“ حیدر حیران ہوا۔

”اوہو، ایک تو تم لوگ پوری بات سنتے ہی ٹرے ہو۔ تم لوگوں پر ترس نہیں آیا۔ یہ کٹز پر جو چکن شاپ ہے نا۔۔۔۔۔“ (عادل نے ہاتھ سے اشارہ کیا)۔

”وہ۔۔۔۔۔ جس کا پورے محلے نے بیمار مرغیاں بیچنے پر پانچکات کر رکھا ہے۔“ محبت اللہ نے تصدیق ضروری تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہی۔“ عادل اطمینان سے کہہ کر منہ چلانے لگا۔

باقی جو جہاں تھا وہیں بت بن گیا یعنی کہ بتا مرغی۔۔۔۔۔ عادل نے اطمینان سے نوالہ حلق سے اتار پھر بات مکمل کرنا شروع کی۔

”بے چارہ، بہت اداس اور دکھی بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھا تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگا۔ کہتا ہے بھائی! معاف تو خدا بھی کر دیتا ہے، پتا نہیں ہمارے محلے والے اب پتھر دل کیوں ہیں۔ میں نے کب کی تو یہ کر لی۔ اب صحت مند اور تندہ تر مرغیاں لا کر رکھی ہیں۔ لوگ

بھی نہیں خرید رہے۔ بس بھائیو! مجھے اس غریب پر بہت ترس آیا۔ ساتھ ہی تم غریبوں کی شکلیں نظروں کے سامنے ناچنے لگیں تو جھٹ سے میں نے چکن خرید اور فٹ سے بریانی کا پروگرام ترتیب دے لیا۔“

عادل نے سکون سے کہتے ان سب کا سکون درہم برہم کیا۔

”تو نے، ہمیں بیمار مرغی کی بریانی کھلائی۔“ حیدر جا رہا تھوڑوں سے اس کی طرف پڑھا۔

”نہیں بار مرغی بالکل صحت مند تھی۔ اس نے میرے سامنے ذبح کی تھی۔“ عادل کہتے ہوئے حیدر سے ذرا پرے کھسکا۔

”اور پھر۔۔۔۔۔ اس چکن والے نے تو یہ بھی کر لی تھی۔ دیے اگر تم لوگ جاہو تو مت کھاؤ۔ میں کل آفس لے جاؤں گا۔ میرے کوئیگز خوشی خوشی کھالیں گے۔“

”اب کیا فائدہ، اب تو جو ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“ انس کہتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔

اس کی دیکھا دیکھی باقی سب نے بھی کھانا دہیں سے دوبارہ شروع کر دیا۔ جہاں سے چھوڑا تھا۔

”ہائے بے چارے بھوکے۔“ عادل نے افسوس کا اظہار کیا۔ کسی کی طرف سے کوئی رد عمل سامنے نہ آیا۔

”ایک اطلاع اور بھی دینی ہے۔“ عادل نے سسپنس پھیلائے کی کوشش کی۔ پھر مطلوبہ رسپانس نہ پا کر مزید گویا ہوا۔

”آخر کار میری کمپنی والے ایک ایسا گھر ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، جس کے مالک مکان کو ہم چھڑے کر ایہ داروں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”شکر ہے، محنت ٹھکانے لگی۔“ احسن نے با آواز بلند شکر ادا کیا۔

”کیا کمپنی والوں کی؟“ عادل نے کچھ حیرت سے استفسار کیا۔

”نہیں میری۔ اتنی محنت سے سلام بنایا تھا، شکر

ہے کھالیا گیا۔ (اس نے ہاتھ سے سلام کی خالی پلیٹ کی طرف اشارہ کیا) ورنہ محنت ضائع ہو جاتی۔“

”ہمارے بیٹوں سے کبھی کچھ بچا ہے۔ دیکھو بیمار مرغی تک کو نہیں بخشا۔“ حیدر نے ٹکڑا اٹھایا۔

”مرغی ہرگز بیمار نہیں تھی۔“ عادل سخت برامان کر بولا۔

”تیری کیا کوئی جذباتی وابستگی تھی مرغی کے ساتھ جو اس کی صحت مندی کو ہر صورت منوانا چاہتا ہے۔“ کافی دیر سے خاموش بیٹھا محبت اللہ بولا۔

”جی، مرحومہ میری بہادر اور غم گسار تھیں۔ قدم قدم پر میری راہ نمائی فرماتی تھیں۔“ عادل جل کر بولا۔

”یہ آپ لوگ مرغی ہی کے بارے میں بات کر رہے ہیں نا؟“ انس نے تصدیق چاہی۔

”یار، دیکھ بھال کر، پیسے خرچ کر کے مرغی خرید کر لایا تھا۔ جو تم سب کھا بھی چکے ہو، اب تو بخش دو۔“

اس نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

”جا، بخش دیا۔ کیا یاد کرے گا۔“ احسن نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کیا۔

”اچھا، بات سنو میری۔“ عادل کو اچانک کچھ یاد آیا۔ ”نئے مکان مالک ہم سب سے ملنا چاہتے

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے

بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ لگیاں یہ چوہارے

فائزہ افتخار

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی



ہیں۔ کوئی ایک وقت طے کرلو تو سب چلتے ہیں۔“  
 ”کیا ہم سب کو جانا ہوگا؟“ انس کے منہ سے  
 بلا ارادہ ہی نکل گیا۔  
 ”نہیں، آدھے چلے جائیں گے، باقیوں سے  
 وہ آکر مل لیں گے۔“ حیدر نے فوراً سے پیش تر  
 جواب دیا۔ انس بول کر ہچکچاتا۔  
 ”میرے خیال سے کل شام چار بجے تک چلتے  
 ہیں۔“ محبت اللہ بولا، جس پر سب مشتاق نظر آئے۔

☆☆☆

سفید کھر کے اس بڑے سے آہنی گیٹ کے  
 سامنے کھڑے وہ خاصے متاثر نظر آرہے تھے۔  
 ”اس کو مکان یا گھر کہنا تو بڑی زیادتی ہوگی۔“  
 محبت اللہ جانے کس رو میں کہہ بیٹھا۔  
 ”تو پھر کیا کہنا چاہیے، ہوں یا سرائے؟“ عادل  
 نے انتہائی سنجیدگی سے دریافت کیا۔  
 مزید کسی بھی گفتگو سے قبل گیٹ کھل گیا۔ چودہ  
 پندرہ سال کا وہ پشیمان بچہ ان کو اندر لے آیا۔  
 ”صاب! پہلے آپ لوگ گھر دیکھ گایا مونا میم  
 سے ملے گا؟“ سوال پوچھ کر اب وہ منتظر نظروں سے  
 ان کو دیکھ رہا تھا۔  
 ”چند سیکنڈ کے توقف کے بعد محبت اللہ بولا۔  
 ”پہلے گھر دکھا دو۔“

”ٹھیک ہے صاب! آ جاؤ۔“

گیٹ سے اندر آ کر بائیں ہاتھ بہت بڑا اور  
 خوب صورت لانا تھا۔ کار پورج کے ساتھ ہی  
 سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔  
 اوپر کا حصہ دو پورشنز میں بٹا ہوا تھا، ایک کا مین  
 دروازہ لاک تھا۔  
 وہ لوگ اسی سمت بڑھے، جب ملازم بچے نے  
 انہیں آواز دی۔  
 ”صاب اور آ جاؤ، وہ حصہ مونا میم کے بچہ لوگ  
 کا ہے۔“  
 ”تو کہاں ہیں وہ لوگ، جن کا یہ حصہ ہے۔“  
 انس نے پوچھا۔

”وہ باہر ہوتا ہے۔ دو سال میں ایک بار  
 ہے۔“ چھ ماہ کا واسطے۔ اس نے اطلاع بہم پہنچا  
 دوسرے پورشن کی راہ لی۔  
 ”تمہارا نام کیا ہے؟“ احسن نے بچے سے  
 سوال کیا۔  
 ”صاب! ام آپ کو ایک شرط پر نام بتاؤں  
 گا۔“

”ہیں۔۔۔۔۔“ انہوں نے حیران ہو کر اسے  
 دیکھا۔ ”نام بھی کوئی، کسی شرط پر بتاتا ہے۔“  
 ”جی صاب! ام۔۔۔۔۔“ اس نے فخر سے اپنا سر  
 بھلاتے ہوئے کہا۔ ”امارا شرط یہ ہے آپ امارا نام  
 سن کر ہنسے گا نہیں۔ یہاں آنے والا ہر کرایہ دار امارا  
 نام سن کر ہنستا ہے۔“  
 ”ہر کرایہ دار کا کیا مطلب ہے؟“ عادل کے  
 کان کھڑے ہوئے۔

”صاب! یہ اور آنے والا کوئی کرایہ دار زیادہ بڑا  
 نہیں ہے۔ کوئی دو ماہ رہتا ہے، کوئی تین ماہ۔“  
 ”کیوں۔۔۔۔۔؟“ حیدر نے پریشانی سے  
 دوستوں کو دیکھتے ہوئے بچے سے پوچھا۔  
 ”یہ تو ام کو نہیں پتا۔ اتنا اچھا تو ہے مونا میم! بچہ  
 نہیں کرایہ داروں کو ان سے کیا مسئلہ ہوتا ہے۔ جو کسی  
 آتا ہے میم سے لڑ جھگڑ کر چلا جاتا ہے۔“  
 ”یار عادل! دیکھ بھال کر گھر لینا چاہیے۔ یہ نہ  
 ہو دو تین ماہ بعد ہمیں بھی بھاگنا پڑ جائے۔“ حیدر نے  
 عادل کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہمارے پاس کوئی دوسرا تیسرا آپشن موجود  
 نہیں ہے۔“ عادل نے جوابی سرگوشی کی۔  
 ”تب ہی بچہ جوش سے بولا۔  
 ”لو صاب! شرط منظور ہے۔“  
 ”کون سی شرط؟“ عادل اور انس نے چونک کر  
 اسے دیکھا۔ باقی سب بھی متوجہ ہوئے۔  
 ”وہی صاب! امارا نام سن کر ہنسے گا نہیں آپ  
 لوگ۔“  
 ”ہاں ہاں، ہم میں سے کوئی بالکل نہیں ہنسے گا۔“

”محبت اللہ نے اس کی تسلی کرائی۔  
 ”صاب! امارا نام ہے“ سائیکل خان۔“ اس  
 نے کہہ کر فخریہ نظروں سے ان سب کو دیکھا۔ یوں  
 جیسے کہہ رہا ہو، ”اب بتاؤ ہو سکتا ہے کسی کا ایسا نام۔“  
 ”یار، یہ کیسا نام ہے؟“ عادل نے حیران ہو کر  
 پوچھا۔

”اصل میں نا صاب! جس دن ام پیدا ہوا تھا،  
 اس دن امارا والد صاب نے نیا سائیکل خریدا تھا۔ بس  
 اس نے ہمارا نام بھی سائیکل خان رکھ دیا۔“  
 ”پھر تو تمہارے بعد ہونے والے بھائیوں  
 کے نام موٹر سائیکل خان، گاڑی خان اور ٹرک خان  
 ہوئے چائیں۔“ احسن نے اللہ جانے پوچھا تھا یا بتایا  
 تھا۔

”نہیں صاب! امارا والد صاب، امارے  
 پیدائش کے دو سال بعد اللہ کو پیارا ہو گیا۔ امارا اور کوئی  
 بھائی نہیں ہے۔“ بچہ برامانے بغیر بولا۔  
 ”محبت اللہ نے اس کی بات پر انفسوس سے سر  
 ہلایا۔

گھر بہت خوب صورت تھا۔ تین بیدروم، ٹی  
 وی لاونج، دو باتھ، بہت خوب صورت اور سائیکل  
 کچن۔ لیکن کوئی چیز ان کو مسلسل ٹھنک رہی تھی۔  
 غالباً کرایہ داروں کے دو تین ماہ سے زیادہ نہ  
 نکلنے والی بات۔ سائیکل خان اب باہر جا چکا تھا۔  
 وہ پانچوں دائرے کی صورت کھڑے غور و خوض  
 فرما رہے تھے۔

”پھر کیا خیال ہے مولوی؟“ عادل نے بال  
 اس کی کورٹ میں لڑھکائی۔  
 ”یار بابا جی کو ہم نوٹس دے بیٹھے ہیں، اس  
 لیے وہ گھر تو خالی کرنا ہی پڑے گا۔“  
 ”مونا میم سے مل لیتے ہیں، پھر دیکھتے ہیں کیا  
 صورت حال بنتی ہے۔“  
 ”چلو ٹھیک ہے پھر آؤ۔“  
 وہ سب آگے پیچھے باہر نکلے۔  
 ☆☆☆

اب اس وقت وہ اس وسیع و عریض، انتہائی  
 شان دار لاونج کم ڈرائنگ روم میں مونا میم کا انتظار  
 کر رہے تھے۔  
 تب ہی ان لوگوں کو ٹک ٹک کی آواز سنائی  
 دی۔ سب سے پہلے عادل مڑا۔

ایک انتہائی امارت اور خوب صورت متناسب  
 سرائے والی اسٹائش سی خاتون اپنے لیے گھنے کالے  
 بالوں کو جھکتی۔ ان کے قریب چلی آ رہی تھی۔  
 لائٹ کوٹ کے ساتھ بلیو جینز اور ہائی ہیل پہنے  
 وہ خاتون اب ان سب سے تعارف کر رہی تھیں اپنا۔  
 ٹک ٹک ٹک، ٹیک کی آواز قریب اور قریب  
 ہوتی جا رہی تھی۔ اس قدر حسین مکان کی مالک سے  
 کوئی کیوں لڑ جھگڑ کر چلا جاتا ہے۔ خواب ایک  
 چھتا کے سے ٹوٹا تھا اور اس کے چھتا کے کی گونج کہیں  
 عادل کے اندر ہی ختم ہو گئی تھی، آواز تک نہ آئی باہر۔  
 ”ہائے، کس قدر ظالم ہوتے ہیں یہ خیالات  
 اور کتنی تلخ ہوتی ہے حقیقت۔“

احسن کے ٹھوکا مارنے پر وہ خیالات کی دنیا سے  
 حال کی دنیا میں واپس آیا تھا۔  
 ”مونا میم!“ اس نام سے جو خیالی پیکر اس نے  
 تراشا تھا۔ وہ حقیقت والی مونا میم کو دیکھ کر ایسا پُور  
 پُور ہوا کہ آہ تک نہ لگی، بے چارے عادل کی۔  
 وہ جو ہیل کی ٹک ٹک اس کی سماعتوں پر دستک  
 دے رہی تھی، وہ اصل میں مونا میم کی ہولڈنگ اسٹک  
 کی آواز تھی۔

برف کے جیسے سفید بالوں والی کوئی بچہ تر سے  
 اسی برس کے درمیان کی عمر والی ”مونا میم“ اسٹک کے  
 سہارے کھڑی ان سب کا اپنی نگاہوں سے انکسارے  
 کر رہی تھیں۔  
 وہ بھاری تن و توش کی حامل ایک چاق و چوبند  
 بزرگ محسوس ہوتی تھیں۔ نظر کا چشمہ آنکھوں پر  
 جمائے وہ باری باری ہر ایک کے سامنے آ کر اس سے  
 اس کا نام اور خاندان کی تفصیل پوچھ رہی تھیں۔  
 عادل کا نمبر سب سے آخر میں آیا۔





”تم لوگوں کو کسی نے محفل کے آداب نہیں سکھائے۔ کیا کھس پھس کر رکھی ہے۔“  
”محفل کہاں ہے، کلاس روم محسوس ہو رہا ہے۔“ عادل بس منہ میں بدبوا کر رہ گیا۔  
”شام کی چائے تم لوگ میرے ساتھ پیو گے روز۔ شام کے وقت مجھے اکیلے میں بہت وحشت ہوتی ہے۔“  
”ویری گڈ۔ خالی چائے یا ساتھ میں۔“  
ابھی عادل اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ مونا میم کی آواز پھر اسے حال میں لے آئی۔  
”ہاں چائے تم میں سے جو بھی بنائے، نہایت عمدہ ہوتی چاہیے۔“  
”کیسی کہ تم..... بنا نہیں گے، وہ بھی عمدہ۔“  
”پانی فالٹو خرچ نہیں کرو گے۔ پانی کا بل تم لوگ بھرو گے۔“  
لان کی صفائی سہرائی تم لوگوں کے ذمے ہوگی۔ اگر تم میں سے کسی کا کوئی رشتہ دار آنا ہو تو اس کی پیشگی اطلاع مجھے دو گے۔“  
”شکر ہے ہمارے رشتے دار ہمیں منہ ہی نہیں لگاتے۔“ عادل پھر سوچ کر رہ گیا۔  
”سائنس ہم مرضی سے لے سکتے ہیں یا اس سے پہلے بھی اجازت لیتا ہوگی؟“ آخر ہمت کر کے عادل نے بول ہی دیا۔  
پہلی مرتبہ مونا میم کے بزرگ چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔  
”تم..... یک بوائے۔“ انہوں نے عادل کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم بہت شریر معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے تمہارے ساتھ وقت اچھا گزرے گا۔ پھر فائل کر لیں۔“  
انہوں نے جواب طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔  
وہ سب بس ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ گویا زبان بے زبانی کھد رہے ہوں.....  
”کیا کریں کیا نہ کریں.....؟“

وہ تو خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔ جونہ مونا میم کے چہرے کا اثر لیا نہ ان سب کے باری باری تھکھکارنے کا۔ آخر مجبوراً احسن کو ٹھوکا دینا پڑا۔

عادل کا نام اور یہ تفصیل سن کر کہ بے چارے کے والدین حیات نہیں ہیں۔ ٹھنڈی سانس بھر کر محض اتنا ہی کہا۔

”ہاں..... بن ماں باپ کے بچوں کی ایسی حالت ہو ہی جاتی ہے۔“  
”کیسی حالت؟“ عادل کچھ چونکا۔

”ایسی ہی، جیسی تمہاری ہو رہی ہے۔ کچھ غائب دماغی کی سی۔“

عادل نے اس تہرے کے بعد خود کو چاق و چوبند ثابت کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا، تم لوگ میری باتیں دھیان سے سن لو۔ اول تو چھٹی کے دن دیر سے اٹھنا مجھے سخت ناپسند ہے۔“

”تو آپ اٹھ جائیں جلدی، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ عادل نے احسن کے کان سے منہ جوڑ کر کہا۔

”سو اتوار کو زیادہ سے زیادہ آٹھ بجے تک سونے کی اجازت ہوگی تم لوگوں کو۔“

”ہم لوگوں کو.....؟“ بے آواز چیخیں اندر ہی دم توڑ گئیں۔

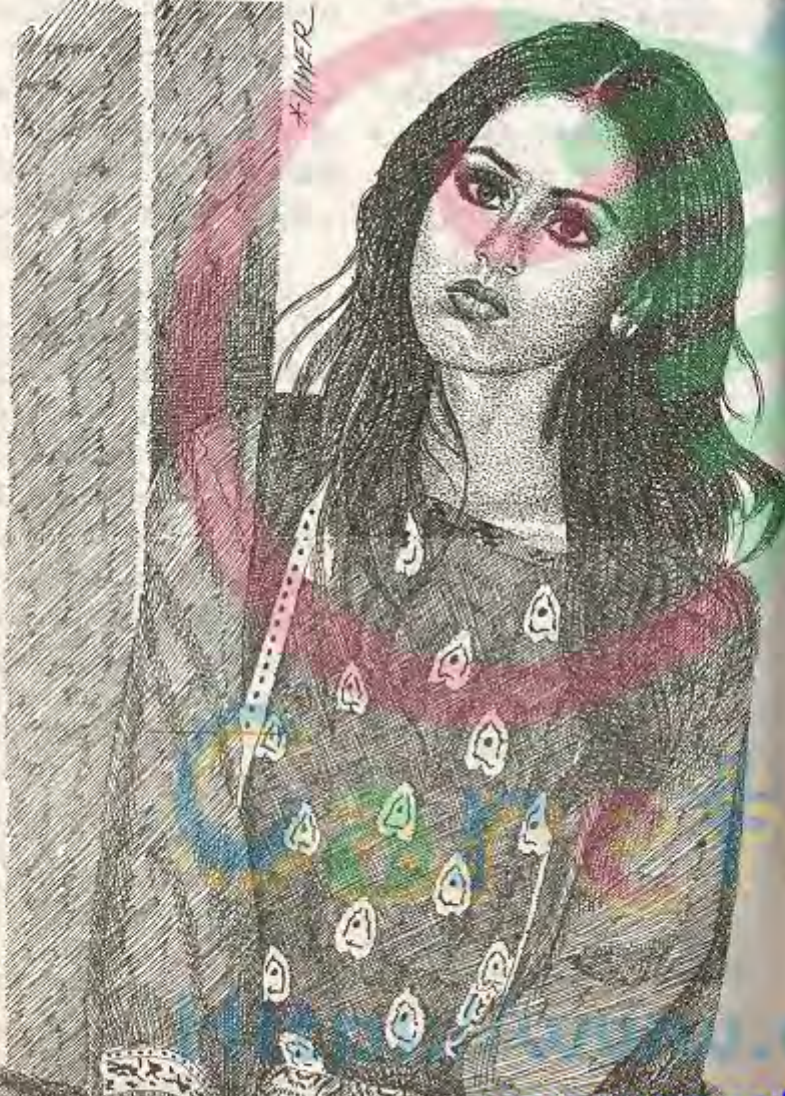
”رات دس بجے کے بعد کسی صورت گیٹ نہیں کھلے گا۔ میوزک بالکل قابل برداشت نہیں ہے۔“

صرف خیریں دیکھنے اور سننے کی اجازت ہوگی۔ کوئی دہیات قسم کا ڈراما یا فلم دیکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

بجلی اور گیس کے میٹر مشترک ہیں لہذا بہت احتیاط سے بجلی اور گیس کا استعمال کرنا ہوگا۔

سردیوں میں میٹر اور گرمیوں میں اسے سی کا استعمال بالکل نہیں کرو گے۔“

”شکر ہے یہ دونوں ہی چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں۔“ انس نے حیدر کے کان میں سرگوشی کی۔





پہناتی تھیں۔ اب تو وہ بھی ہمارے بالوں میں لگنھا بھی نہیں کرتیں۔ اب مجھے اپنے بال بھی خود بنانے پڑتے ہیں اور تمہارے بھی۔“ شانزے بھی ماں کے رویتے پر افسردہ تھی۔

”رات کو جب بابا میرے خواب میں آئیں گے ناں تو میں ماما کی شکایت لگاؤں گی کہ ماما ہمارا ممالکتی ہی نہیں ہیں۔ وہ تو بس اپنے نئے شوہر کا ہی ہر وقت خیال رکھتی ہیں۔ ان ہی کے کام کرتی رہتی ہیں اور ان سے ہی ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے میرے خواب میں بھی جب بابا آئیں گے تو میں بھی ان سے یہی کہوں گی۔ چلو اب جلدی سے ہوم ورک مکمل کر لیتے ہیں ورنہ ماما ڈانٹیں گی۔“ دونوں بہنیں جلدی جلدی ہوم ورک کرنے لگیں۔

☆☆☆

شانزے چھ سال کی اور وریشہ پانچ سال کی تھی کہ ناگہاں سایہ پداری سے محروم ہو گئیں۔ معصوم ذہنوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کج کاسورج ان کی قسمت میں یتیمی لکھ کر نمودار ہوگا۔ رات کو ماجد انور نے اپنی ننھی یوں کے ساتھ کھانا کھایا، ان کی ساتھ خوب باتیں کیں، دونوں کو اپنے بازوؤں پر لٹا کر کہانیاں سنائیں تو وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئیں۔ انہیں صبح طرح سے لٹا کر ان کے ماتھے پر بوسہ دیا اور بیوی سے چائے کے ایک کپڑا فرمائش کی تو مہک فوراً چائے بنا لائی۔ دونوں نے ہلکی پھلکی باتوں کے دوران چائے پی اور سو گئے۔

انہی سوئے ذرا دیر ہی گزری تھی کہ ماجد انور کا

سانس اکھڑنے لگا۔ ساتھ ہی الٹیوں کا ایسا حملہ ہوا کہ اس کی جان پر بن گئی۔ وہ انہیں بھی قہر بنا کر دیتی اور کبھی گھبر رہی کوئی الٹی کی گولی کھلا دیتی مگر طبیعت تھی کہ بگڑتی ہی جاری تھی۔ جب مہک نے دیکھا کہ وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہو رہے ہیں تو اس نے ماجد انور کے بھائیوں کو فون کر کے بلالیا تو وہ فوراً ہی

دوڑے چلے آئے مگر قسمت کی ستم ظریفی کہ وہ ابھی اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جانے بھی نہ پائے تھے کہ وہ قلمہ اجل بن گیا۔

بھائی اس کے اتنے جلدی دنیا سے منہ موڑ لینے پر انگشت بدنداں رہ گئے جس نے سنا اس کی اچانک وفات پر ششدر رہ گیا۔ جوان بیوی سکتے میں آگئی اور معصوم بچیاں باپ کے ایک دم خاموش ہونے پر سہم گئیں۔ باپ کی محبت و شفقت بھری چھاؤں سے کڑی دھوپ میں آ گئیں۔ وہ باپ کو یاد کر کے تڑپ کر روتیں۔ راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتیں۔ اس کو پکارتیں ان کی حالت دیکھ کر ہر آنکھ اٹھتا ہوا جاتی۔

تایا بھی پارک میں گھمانے لے جاتے، کبھی پھوپھو اپنی آغوش میں بھر تھیں اور ماں ان بچیوں کو ککڑ ککڑ دیکھ جاتی۔ منہ سے کچھ نہ بولتی مگر ان کا درد دل میں لیے بے چین رہتی۔

مہک نے عدت مکمل کی تو اس کے بھائی اسے اپنے گھر لے گئے پھر ایک دن ماموں نے بتایا کہ ”تمہاری ماما کی ہم شادی کر رہے ہیں۔ اب تم اپنے نئے بابا کے ساتھ رہو گی۔“ وہ دونوں خوش ہو گئیں کہ اب ہمارے نئے بابا ہمارے لیے اچھی اچھی چیزیں لایا کریں گے۔ ہمیں کہانیاں سنائیں گے اور روز گھمانے لے جایا کریں گے۔ وہ آنے والے دنوں کا تصور کر کے ہی خوش رہنے لگیں مگر دونوں کے خواب اس وقت چٹکا چور ہو گئے جب ایک دن ماں نے انہیں خوب نہلایا دھلایا، نئے کپڑے پہنا کر بال بنائے اور ان کی پھوپھو کے گھر لے گئیں۔ پھوپھو نے انہیں اپنے ساتھ چنا کر خوب پیار کیا۔ پھوپھو کو کچھ کر بھائی کی یاد دلانے لگی۔ شانزے نے پھوپھو کی

گود میں لیٹے ہوئے سنا کہ اس کی ماں اپنی شادی کے متعلق بتا رہی تھی کہ ”چند دن بعد اس کی شادی اس کے کنوارے کزن سے ہو رہی ہے اور وہ بچیوں کو اپنے ساتھ رکھنے پر آمادہ تو ہے مگر میں نہیں سمجھتی کہ وہ ان کو باپ جیسا پیار دے سکے گا اس لیے بچیوں کو آپ اپنے

پاس رکھ لیں۔ یہاں آپ کے بچوں کے ساتھ ان کا دل لگا رہے گا۔“ یہ سن کر کبھی شانزے کا دل جیسے کسی نے مٹی میں لے کر رمل دیا ہو کہ کیا اب انہیں اپنی ماں سے بھی دور رہنا پڑے گا۔ خود پھوپھو یہ بات سن کر سکتے میں آ گئیں کہ ایک ماں نے کیسے اپنی بچیوں کو اپنے سے دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”بھابھی! آپ بچیوں کے بغیر کیسے رہیں گی اور پھر یہ اتنی چھوٹی ہیں کہ ابھی باپ سے دوری کا زخم بھی نہیں بھرا اور آپ انہیں اپنی ممتا سے بھی محروم کر رہی ہیں۔“ پھوپھو نے کرب سے کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر آئے بال سنوارے۔

”میں نے یہ فیصلہ ان کی بہتری کے لیے ہی کیا ہے، وہاں رہ کر اگر ان پر توجہ دوں گی تو اسامہ ناراض ہوگا اور اگر اسامہ کا خیال رکھوں گی تو بچیاں نظر انداز ہوں گی، دونوں صورتوں میں بچیوں کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میں بھی ہر وقت ذہنی ٹینشن کا شکار رہوں گی۔ یہ یہاں رہیں گی تو مجھے اطمینان رہے گا کہ انہوں کے پاس ہیں۔ خرچے کی تم فکر نہ کرنا، ان کی پڑھائی اور دیگر اخراجات کے لیے میں پیسے دیتی رہوں گی۔“ وہ جیسے حتیٰ فیصلہ کیے بیٹھی تھی۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔ بات خرچے کی نہیں ہے، بات محبت اور احساس کی ہے اگر آپ کا دوسرا شوہر جو کہ آپ کا کزن بھی ہے، بچیوں کا خیال نہیں رکھ سکے گا تو مجھ سے آپ کیسے اچھی امید رکھ سکتی ہیں۔ میں تو غیر خاندان میں بیاہ کر آئی ہوں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ میں تو ان خیال رکھ لوں گی مگر فیملی اور اس کی فیملی سے کیسے اچھے سلوک کی توقع رکھ سکتی ہوں۔ آپ بہت غلط فیصلہ کر رہی ہیں۔ بچیوں کو آپ اپنے پاس ہی رکھیں، انہیں اپنی محبت سے دور نہ

کر لیں۔ جو محبت ماں دے سکتی ہے وہ کوئی اور رشتہ کبھی نہیں دے سکتا۔“ پھوپھو نے دو ٹوک جواب دے دیا۔

”تو پھر میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں۔“

”سو فیصلہ انکار۔ ان کو اپنے سے دور کر کے ان پر ظلم مت کریں۔ بچیاں ساری عمر احساس محرومی کا شکار ہو کر پروان چڑھیں گی تو اپنے دلوں کو ماں باپ کی محبت سے خالی پائیں گی۔ باپ کا پیار تو زیادہ دیر یہ اپنی قسمت میں لکھوا کر نہ لاسکیں، خدا ان کے دلوں کو ماں کی محبت سے تو بھر دیں ورنہ ساری عمر اپنے آپ کو ان کا مجرم تصور کریں گی۔“ پھوپھو نے سمجھاتے ہوئے حقیقت بھی گوش گزار کر دی اور وہ ان کی بات سن کر دونوں کے ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”ان کو کچھ دنوں کے لیے میرے پاس چھوڑ دیں، جب نئے گھر میں ایڈجسٹ ہو جائیں تو آ کر ان کو لے جائیں گے۔“ انہوں نے دونوں کو اپنے ساتھ لگایا اور مہک خاموشی سے انہیں وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔

پھر پھوپھو نے ان دنوں میں ان کا بہت زیادہ خیال رکھا، ان کی پسند کے کھانے بنائے۔ ڈھیروں کھلونے لے کر دیے۔ وہ بھی ان کے بچوں کے ساتھ پہلے گئیں مگر ماں کو یاد کر کے اداس ہو جاتیں۔ کافی دن گزر گئے مگر مہک نے کوئی رابطہ نہ کیا تو ایک دن پھوپھو نے خود ہی ان کو فون کر کے یاد کروا دیا کہ بچیاں آپ کو یاد کر رہی ہیں تو وہ اگلے ہی دن انہیں لینے آ گئی۔

خوب صورت کپڑوں میں ملبوس بنی سنوری ماں نے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔ وہ بھی اتنے دنوں کی پھوڑی ماں سے لپٹ گئیں مگر بتائیں کیوں ماں کے لمس میں شانزے کو وہ پہلے جیسی گرمی محسوس نہ ہوئی۔ پھوپھو انہیں رخصت کرتے وقت اپنے ساتھ چٹا کر اے تڑپ کر روئیں گویا بھائی کے ساتھ ساتھ اب پھوپھو کی شکل بھی آئندہ نہ دیکھ سکیں گی مگر وہ معصوم ان کے دکھ کو نہ سمجھ سکیں اور ماں کے ساتھ خوشی خوشی چل دیں۔

☆☆☆

گھر آ کر انہیں جس پہلی ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کا الگ کرنا تھا۔ جب مہک نے انہیں



بتایا کہ تم آج سے اس کمرے میں رہو گی۔  
 ”مما! آپ میری والی سائیڈ پر سوئیں گی  
 ناں۔“ شانزے بولی۔

”نہیں جی، ممما میرے ساتھ سوئیں گی۔“  
 وریشہ نے ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”نہیں، میں تم دونوں کے ساتھ نہیں سوؤں  
 گی۔ میرا کمرہ تمہارے ساتھ ہی ہے۔ میں وہیں پر  
 ہوں گی۔ اب یہ تم دونوں کا کمرہ ہے، تم لوگ یہیں رہا  
 کرو گی۔“ مہک نے ان سے ٹکا ہوا چہرہ اٹاتے ہوئے  
 کہا تو وہ دونوں شاکہ کڈ رہ گئیں۔

”مگر ممما! ہم دونوں کیسے اکیلی سوئیں گی، ہمیں  
 ڈر لگے گا۔ ہم آپ کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔“ شانزے  
 نے فوراً انکار کر دیا۔

”اب تم دونوں بڑی ہو گئی ہو۔ اکیلے کمرے  
 میں رہ سکتی ہو۔“ وہ مزید ان کی کوئی بات سننے وہاں  
 سے اٹھ کر چل دی اور وہ ساری رات دونوں بچوں  
 نے ڈرتے اور روتے ہوئے جاگ کر گزاری۔ بھی  
 ماں کو آوازیں دیتیں اور کبھی بے بس ہو کر باپ کو  
 لکارتیں۔ ماں ساتھ والے کمرے میں ان کی لپکار سن  
 سکی تو باپ تو اب دی نیند سو یا ہوا تھا وہ کیسے ان کی تنہائی  
 باغتا۔

☆☆☆

وہاں رہتے ہوئے چند ہی دنوں میں انہیں  
 اندازہ ہو گیا کہ باپ کے ساتھ ساتھ ماں کی محبت بھی  
 ان کے لیے دفن ہو چکی ہے۔ وہ حیران ہوئیں کہ  
 ہماری ماں ہمارے ساتھ ایسا کیوں کرتی ہے۔ دن  
 میں تو پھر بھی وہ ان کا کچھ خیال کر لیتی تھی مگر شام کو  
 اسامہ کے آتے ہی وہ ان دونوں سے لاپرواہ  
 ہو جاتی۔ اکثر ان کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر وہ رات کو  
 گھومنے پھرنے نکل جاتے اور خوف سے ان کے دل  
 کانپتے رہتے۔ سنے بابا کو جب انہوں نے پہلی بار بابا  
 کہا تو اسامہ کے چہرے پر ناگواری کی لکیریں ابھر  
 آئیں۔

”بھی مہک! ان کو بتاؤ، میں ان کا باپ نہیں  
 ہوں۔ ان کا بابا مر چکا ہے۔“ وہ سفاکی سے بولا۔

بچیاں اس دن کے بعد سے اسے انکل کہنے  
 لگیں۔ ان کے درمیان ایسا رشتہ تھا کہ جیسے کسی دور  
 پرے کے رشتہ دار نے یتیم و یتیم کو اپنے گھر بنا  
 دے رکھی ہو اور وہ اپنی ماں کے ہوتے ہوئے بھی  
 یتیموں کی سی زندگی بسر کرنے لگیں۔ معصوم ذہنوں  
 نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اب وہ نہ تو ماں سے  
 کسی چیز کی فرمائش کرتیں اور نہ ہی اس سے اپنے لیے  
 دل میں محبت کی امید رکھتیں۔

وہ اسکول سے آ کر کھانا کھا کے اپنا ہوم ورک  
 کرتیں اور اپنے کمرے کو ہی دونوں بہنیں اپنی دنیا  
 سمجھ کر رہنے لگیں۔ اب تو وہ اپنے سارے چھوٹے  
 چھوٹے کام خود کرنے لگی تھیں۔ نہ ماں کی بے توقیری  
 کا شکوہ ان کے لبوں کو چھوتا اور نہ اس کے شوہر سے  
 کسی اچھے رویے کی توقع رکھتیں۔ ہاں مگر اپنے تمام  
 دکھ رات کو اپنے باپ کی تصویر سے باغتا۔ نہ  
 بھولتیں۔

☆☆☆

زندگی میں کتنی تلخیاں برداشت کرنا ہوں گی،  
 کیسے غموں کے پہاڑ تلے ان کے وجود پر یہ وہ ہوں  
 گے، اس کا انہوں نے بھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اب  
 بڑی اور سمجھ دار ہوتی جا رہی تھیں۔ ماں کے روتے پر  
 دل ہی دل میں کدھرتیں کرتیں۔ شانزے پہرے بولتی  
 سوچتی رہتی کہ کیا میری ماں کی ماں ہے۔ ہو سکتا ہے  
 ہم بابا کی بیٹیاں ہوں، ہماری ماں ہمیں جنم دے کر  
 مر چکی ہو اور بابا نے اس مہم سے دوسری شادی کر لی  
 ہو۔ بابا کے ڈر سے ممما اس وقت ہمارے ساتھ اچھا  
 سلوک کرتی تھیں اور بابا کے جاتے ہی ہم سے ان کا  
 رویہ بڑا ہو گیا۔ ماں کا ناروا سلوک دیکھ کر یہ خیال اس  
 کے دل میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا۔  
 ان دونوں کے دلوں میں باپ کی چند برسوں کی

روٹی محبت کا پودا تناور درخت بننا جا رہا تھا اور ماں  
 کے لیے نفرت کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی تھیں اور  
 اس دن یہ نفرت زہر بن کر شانزے کے پورے وجود  
 میں پھیل گئی، جب وریشہ ساری رات بخار سے پھٹکتی  
 رہی اور اس نے پریشان ہو کر ماں کے کمرے کا  
 دروازہ کھٹکھٹا دیا تو سوتیلے باپ نے غصے سے اس کے  
 منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا کہ ہماری نیند میں خلل کیوں  
 ڈالا۔

”دفع ہو جاؤ، جا کر اپنی بہن کی تیار داری  
 کرو۔“ کچھ نہیں ہوتا اسے، بڑی ڈھیت جان لے کر  
 پیدا ہوئی ہو تم دونوں۔“

حقارت سے کہتے ہوئے اس نے دروازہ بند  
 کر لیا اور شانزے روٹی ہوئی کمرے میں وریشہ کے  
 پاس آ کر اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔ وہ نیم  
 بے ہوشی کی حالت میں تھی اور ممما پکار رہی تھی۔ بخار  
 سے اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ وہ پریشانی سے مسلسل  
 اپنے اللہ سے بہن کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگتی  
 رہی اور پانی کی پٹیاں اس کے ماتھے پر رکھتی رہی۔

اس وقت اسے اپنی ماں دنیا کی بد صورت ترین  
 عورت لگتی تھی جو اپنے نئے شوہر کی محبت میں اپنی مٹا کا  
 گلا گھونٹ چکی تھی۔ ماں تو وہ ہستی ہے کہ بچے کے  
 معمولی دکھ پر بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی تکلیف  
 اسے اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیسی کھنور ماں تھی  
 جس کی بیٹی شہت تکلیف سے گرا رہی تھی اور ماں کو  
 خبر تک نہیں۔ پتا نہیں اس ماں کے سینے میں دل ہے  
 کہ نہیں، وہ ساری رات دھبی ہوئی رہی۔ صبح تک  
 وریشہ کی حالت کافی بگڑ چکی تھی، اسے دورے پڑنے  
 لگے تو مہک اسامہ کے ساتھ اسے ڈاکٹر کے پاس لے  
 گئی اور وہ گھر پر رو کر بہن کے لیے دعائیں مانگتی  
 رہی مگر پتا نہیں اس کی دعاؤں میں اثر نہیں تھا یا وریشہ  
 کی باپ سے محبت اتنی شدید تھی کہ وہ اس سے زیادہ  
 عرصہ دور۔ نہ وہ کسی یا پھر ماں کی محبت کی محرومی کا غم  
 نہ سہار پائی۔ شانزے باپ کی جدائی کے غم کے بعد  
 اب چھوٹی بہن کے پیچھے نے پر ماتم کرنی رہ گئی۔

اس کا معصوم چہرہ ہاتھوں میں لے کر وہ کتنا تر پی  
 تھی، اس سے کتنی التجا میں کی تھیں کہ وریشہ مجھے یوں  
 تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔ بابا تو چلے گئے، تم تو مجھ سے  
 یوں بے وفا کی نہ کرو۔ میں اکیلی کمرے میں کیسے  
 رہوں گی۔ مگر اس کی تمام تر التجائیں مٹی کا ڈھیر بن کر  
 وریشہ کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں اور اس کے دل میں  
 ہولناک سناٹوں نے بڑاؤ ڈال لیا۔

☆☆☆

وقت کا پہیہ سرکنا رہا اور شانزے نے بچپن کو  
 رخصت کر کے جوانی کا ہاتھ تھاما تو ماں کے لیے نفرت  
 اس کے انگ انگ میں بس چکی تھی۔ پنج یا دیں جب  
 ذہن کی سلیٹ پر نمودار ہوئیں تو وہ درد کی شدت سے  
 بے حال ہو جاتی۔ وہ منہ سے کچھ نہ کہتی، کالج سے  
 آنے کے بعد گھر کے کام کاج میں مصروف ہو جاتی۔  
 ماں سے ضرور بات کر لیتی ورنہ وہ اس کی طرف  
 دیکھتی تنک نہیں تھی۔ نہ بھی اس نے مہک کے ساتھ  
 بدتمیزی کی اور نہ اسامہ کو پلٹ کر جواب دیا مگر وہ ان  
 دونوں کو اپنی بہن کا قاتل ضرور سمجھتی تھی اور اس رات  
 کا تصور کر کے نفرت اس کے دل میں اور سوا ہو جاتی۔  
 پچھلے کچھ دنوں سے اسامہ کا رویہ اس سے کچھ بہتر ہوتا  
 جا رہا تھا۔ بھی بھی اس سے پڑھائی کے متعلق پوچھ  
 لیتا، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، وہ اکثر  
 پوچھتا اور وہ فی میں سر ہلا دیتی۔

مہک بھی اسے توجہ دینے لگی تھی، اس کا خیال  
 رکھنے لگی تھی اور اکثر وریشہ کو یاد کر کے آنسو بہاتی تو  
 شانزے کا دل چاہتا کہ اس عورت سے ان ہاتھوں کا  
 حساب لے جو انہوں نے اس کے پاس رہتے ہوئے  
 بھی اس سے دوری میں گزارے۔ اسے وہ ماں نہیں  
 وہ سنیوں لگتی تھی جو اپنے بچوں کو جنم دے کر خود ہی  
 انہیں نکل جاتی ہے۔

مہک کی طبیعت اچانک خراب رہنے لگی، ٹیٹ  
 کروانے تو پتا چلا کہ اسے بلڈ کنسر ہے۔ اسامہ اس کا  
 بہتر سے بہتر علاج کروا رہا تھا، اس کے لیے روتا، اس  
 کی زندگی کی دعائیں مانگتا۔ شانزے سے اس کا خیال



رکھنے کے لیے کہتا، وہ اسامہ کو اپنی ماں کا اتنا خیال کرتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ یہ تو اسے اپنی ممانی سے ہی پتا چلا تھا کہ یہ دونوں لڑکپن سے ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ کسی دوست سے جھگڑا ہوا تو اسامہ قتل کے جرم میں جیل چلا گیا اور اس کی نانی نے مہک کی شادی شانزے کے باپ سے کر دی۔ مہک کو اسے شوہر سے رتی بھر محبت نہ تھی مگر ماں کی وجہ سے وہ اس گھر میں بسنے پر مجبور تھی۔ شادی کے دو سال بعد ہی اس کی نانی فوت ہو گئیں اور جس دن اس کا باپ اس دنیا سے رخصت ہوا اسامہ کو جیل سے باہر آئے چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اور اس کی ماں نے عدت مکمل ہونے کے بعد اپنے عاشق سے شادی کر لی۔ اسے اپنے بابا شدت سے یاد آتے اور وہ سوچتی کاش میرے بابا کی شادی میری ممانے نہ ہوئی ہوتی۔ کاش میں اس عورت کی بیٹی نہ ہوتی۔ کاش میری ممانے مر جاتیں مگر میرے محبت کرنے والے بابا زندہ رہتے تو آج وریشہ بھی میرے ساتھ ہوتی اور ہم نئی خوشی خوشی زندگی گزارتے۔ وہ خیالوں کے تانے بانے بنتی رہتی۔

وہ مہک کا پورا خیال رکھتی، اس کی مکمل نگرانی کرتی۔ ہانچٹلوں میں راتوں کو اس کے لیے جاگتی، اس کا سر دباتی، ٹانگیں دباتی۔ اس کے لیے پرہیزی کھانا بناتی مگر اس میں ماں کی محبت شامل نہ ہوتی صرف ایک انسانیت کے ناتے یا پھر وہ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتی تھی جو اتنے عرصے ان میاں بیوی نے اس چھت کے سائے تلے رکھا تھا۔

☆☆☆

شانزے نے جلدی سے سوپ کا پیالہ ٹرے میں رکھا اور مہک کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔ اس کی ماں روز بروز موت کے قریب ہوتی جا رہی تھی اور اسامہ کا اس خیال سے ہی چہرہ زرد پڑتا جا رہا تھا۔ اس نے کاروبار پر توجہ دینی چھوڑ دی تھی اور سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا کہ وہ خود کسی بڑی بیماری کا شکار ہے۔

شانزے نے دروازہ کھولنے کے لیے جوں ہی ہاتھ آگے بڑھایا، اپنی ماں کی آواز سن کر وہیں صدمہ لگ گئی۔

”میں اپنے آپ کو اپنی بیٹیوں کا مجرم سمجھتی ہوں اسامہ! میں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ نہ صرف ان سے ان کا باپ چھین لیا بلکہ اپنی محبت کے لیے بھی انہیں ترسیا۔ میری خود غرضی و بے توجہی کی وجہ سے میری بیٹی اس دنیا سے چل بسی۔ میں کیسی ماں ہوں جسے اپنے بچوں پر ذرا رحم نہ آیا۔ تمہاری محبت پانے کی خواہش میں اپنی محبت بیٹیوں پر نہ لٹائی مگر اس ڈر سے کہ کہیں تم حقانہ ہو جاؤ۔ تمہاری ناراضی کے ڈر سے میں نے ہمیشہ ان کو اپنے سے فاصلے پر رکھا، اس ظلم پر میرا خدا مجھے کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ ماجد انور کا تکلیف کی شدت سے زور پڑتا چہرہ مجھے راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے پر مجبور کرتا ہے۔ میری معصوم کلی ساری رات بخار میں تڑپتی رہی اور میں کیسی چین کی نیند سوئی رہی۔ بچھتاؤں مجھے نکل رہے ہیں اسامہ!“ ضمیر نے آج اس کو سمجھوڑ ڈالا تھا اور وہ بیٹے دنوں پر شرم سار ہو رہی تھی۔

”یہ احساس مجھے بھی بہت شرمندہ رکھتا ہے مہک! شاید قدرت نے مجھے اسی بات کی سزا دی ہے کہ اس نے مجھے اپنی اولاد کی خوشی سے محروم رکھا۔“ دونوں آج ضمیر کی عدالت میں کھڑے اپنا احتساب کر رہے تھے۔

”ہم آج ہی شانزے سے اپنے رویوں کی معافی مانگ لیں گے۔ بہت اچھی بیٹی ہے۔ نفرت و حقارت کے جواب میں اس کی طرف سے ہمیشہ خاموشی ہی ملی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہمیں معاف کر دے گی۔“ اس کا سوتلا باپ خوش فہمیوں کو لگے ہوئے تھے۔ اس کی خاموشی کو اچھے پن سے تعبیر کرتے ہوئے معافی کی امید رکھے ہوئے تھا جب کہ ان کے لیے شانزے کے پور پور میں نفرت اپنا گھناؤنا ثبوت بنے ہوئے تھی۔

”وہ تو ہمیں معاف کر دے گی مگر اسامہ! ماجد

انور کے قتل کے گناہ کی معافی ہم کس سے مانگیں گے۔ میرا ضمیر مجھے بچو کے لگتا ہے، ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے کہ ایک بے گناہ کو ہم نے موت کی وادی میں دھکیلا۔ بچوں کو باپ کی شفقت و سائے سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ ہمیں پانا تو میرا خواب تھا اور اس خواب کو تعبیر دینے کے لیے اپنی محبت پانے کے لیے میں نے اپنے شوہر کو ہی قتل کر دیا۔“

”قتل.....“ شانزے کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور ٹرے ہاتھوں میں لرز کر رہ گئی۔

”کاش تم نے مجھے وہ زہاثر نہ دیا ہوتا، جو اس رات میں نے اس کی چائے میں ملا دیا تھا۔ کسی کو اس بارے میں خبر تک نہ ہوئی کہ اس کو موت کے منہ میں پہنچانے والی اس کی اپنی بیوی ہے۔ لوگ میرے بچائی میں بیوہ ہونے پر نام نہان کنائیاں تھے اور ان کو خبر نہ تھی کہ یہ بیوی کی چادر میں نے خود اپنی مرضی سے لٹائی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ اس بوجھ کو اپنے دل میں چھپائے میں تھک چکی ہوں اسامہ! دیکھو قدرت نے مجھ سے کیا انتقام لیا ہے کہ آج میں ایک سو ڈی مرض میں مبتلا ہو چکی ہوں اور سکتے ہوئے کسی بھی دن یہ دنیا چھوڑ جاؤں گی۔ یہ احساس مجھے وقت سے پہلے ہی دفنائے جاتا ہے کہ میں ماجد انور کو کیسے اس پر اور اس کی بیٹیوں پر کیے ظلم کا حساب دوں گی۔ وہ دونوں احساس جرم کا شکار ہو کر اندر آنسو بہا رہے تھے اور شانزے کے قدم جم چکے تھے۔ اس کا دل جیسے کسی نے ٹھنڈی میں جکڑ لیا تھا۔

”قتل.....قتل.....قتل.....“ تو کیا میرے باپ کا قتل میری ماں نے کیا تھا۔ میرا باپ طبیعتی موت نہیں مرا تھا۔ اسے میری ماں نے مارا تھا..... میری ماں قاتل ہے۔

اودہ میرے خدایا..... یہ کیسی اذیت ناک حقیقت ہے۔ ماں کی محبت تو ایسی ہے کہ ایک بے زبان کو بھی اپنی اولاد کو زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کی محبت و عقل دیتی ہے۔ کسی خطرے کے

باعث اولاد کو اپنے پروں میں چھپالیتی ہے مگر اپنے بچوں پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتی۔ یہ کیسی ماں تھی جس نے خود اپنے ہاتھوں اپنے بچوں کو بے سائبان کر دیا تھا۔ یہ عورت۔ ماں نہیں ایک ڈاکٹر ہے جس نے پہلے اپنے شوہر کو کھانا پھر اپنی بیٹی کو لٹکا۔ اسے میرے اللہ! میں اتنے عرصہ اپنے محبت کرنے والے باپ کے قاتلوں کے ساتھ رہتی رہی۔“ آنسو اس کے گالوں پر تواتر سے بننے لگے۔ وہ ایک نئے دکھ اور نئے کرب سے آشنا ہو کر ممانی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ دل کو جیسے کسی نے تیز دھارا لے لے سے چیر دیا تھا۔

آنسوؤں کی دبیز چادر اس کی آنکھوں کے سامنے تہی جا رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان دونوں کے گلے بے رحمی سے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دے۔ اس سے پہلے کہ اس کا نام بھی قاتلوں کی فہرست میں آئے وہ یہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے، اس نے کچھ سوچ کر پاؤں گیٹ سے باہر رکھے، اس کا رخ شہر کے ریلوے اسٹیشن کی طرف تھا جہاں پر جانے کا اب صحیح ٹائم آچکا تھا۔

اس سے بڑی کڑی سزا انسان کے لیے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ اپنے گناہوں کا ادراک ہونے پر دل کو چیر دینے والی اذیت سے دوچار ہوتا رہے۔ ان دونوں کی یہی سزا تھی کہ وہ تنہائی کا زہر پیئیں۔ اپنے گناہوں کا بوجھ لیے دن رات سولی پر لٹے رہیں۔ احساس جرم بچپن پھیلائے انہیں ڈستار ہے، وہ تڑپتے رہیں اور اپنے ضمیر کے کٹھنوں میں کھڑے ہو کر اپنے کیے کا حساب دیتے رہیں۔







دادی جانے کیوں مجھے الف لیلیٰ کی شہزادی دلا کرتی تھیں۔ انہیں قصے سنانے کا بڑا شوق تھا اور رہی میں، تو مجھے ان قصے کہانیوں سے زورہ بھر بھی رغبت نہ تھی۔ قلعے کی کھڑکی سے بالوں کے تجھے چھپتی لڑکی، مینڈک شہزادہ اور کبھی کبھی کہانی چکاوڑوں کے دیس سے سفر کرتی ہوئی جنگوؤں کے دیس جا بھر تھی۔ چلتی چھپتی اور بھڑبھڑ بھڑکتی ہوئی تاریکی آگ کے گرد سب دائرہ بنائے بیٹھے ہوتے تھے جیسے ماچس کی ڈیپا میں بند ہونے اپنے سکھ سے باہر کسی جادو کے اثر سے سمور ہوئے بیٹھے ہوں۔ اگر وہ ذرا سا بھی بلے چلے یا انداز نشست بدلی تو دادی انہیں چنگیوں سے پکڑ پکڑ کر ماچس کی ڈیپا میں بند کرتی جا سکتی گی۔ اور وہ تو سدا کے فرماں بردار تھے۔ اس کنبے، قبیلے میں صرف میں ہی ”بابی“ تھی جو کسی طرح بھی دیو مالانی داستانوں کو سننے اور ان سے متفق ہونے کی خود میں صلاحیت نہ پاتی تھی۔ تراخ تراخ لکڑیاں چٹختی تھیں، دھواں سلگتا، پل بھر کو شیلے کے ساتھ ساتھ قصہ گو کی بھی زبان بلند ہوتی جاتی۔ اسرار بھری حیرت۔

”راستوں میں انگارے بچھ گئے۔ شہزادے کے گھوڑے کے سم انگاروں کی تپش سے باس چھوڑنے لگے۔ مگر شہزادہ، شہزادی کی کھوج میں آگ کا دریا پار کرتا گیا۔ اور آگ سے بہت آگے لیکر کی لڑیوں کے ساتھ چکاوڑیں لگتی ہوئی تھیں اور الوؤں کی آنکھیں لال شعلہ سی نظر آتی تھیں۔“ میری آنکھیں لالین کی لو پر گڑے رہ کر تھک سی جاتی تھیں۔

قصے سننے والے گزرتی رات کے بے خود کر دینے والے لحوں کے زیر اثر دھیرے سے ادھر ادھر کو لڑھکنے لگتے تھے۔ قصہ گو کی آواز بھی مدھم مدھم ہوتی معدوم ہو جاتی تو میں سر اٹھا کر دیکھتی تھی۔ قصہ گو بھی بھجور کی چھال والی درہی پر لڑھکی ہوئی ملتی تھیں۔ سبج ہمیشہ ان کے سینے پر دھری ہوئی تھی۔ آگ ٹھنڈی ہو چکی ہوئی اور میں سوچتی کہ راکھ پھر ولوں۔ کوئی چنگاری، کوئی ننھا سا شعلہ میرے لیے بھی تو بھڑکے۔

دادی کے قصے شروع میں مجھے بہت بھاتے تھے۔ گھوڑے کے سموں سے مٹی ادھیڑتا، بھرے بالوں والا شہزادہ اور اندھیری کوشی کی سلاخوں میں سر دیے بیٹھی الہ شہزادی جس کے جوہن کو شہزادے کا انتظار دیمک کی طرح کھا رہا تھا۔ دادی بھی نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ لڑکیوں کے آگے موٹی رکھ دیے جائیں تو وہ کھیل کھیل میں، شرارت میں، ان موتیوں کو لڑی میں پرو کر گلے کا ہار کر لیتی ہیں۔ میں اندھیری کوٹھڑی کی شہزادی بن گئی جو کسی زمین ادھیڑتے، گھوڑا بھگاتے شہزادے کے انتظار میں ہے۔ اور وہ شہزادہ؟؟؟

☆☆☆

تیلیوں کو عادت تھی سورج کے ساتھ ساتھ چلنے کی۔ اور ہم اپنے اپنے دوپٹوں کو بل دے سرسوں کے کھیتوں میں اتر آتی تھیں۔ دنیا بھر کا لاڈلا سورج ہمارے سروں کے اوپر سفر کرتا رہتا تھا۔ لنگے، قمریاں اور سیل کنٹھ ہواؤں کے راز دار تھے۔ انہی کی چمک چمک سے کاک سہم جاتے تھے۔ وہ بھی

ایک روشن دن تھا اور گھوڑا دوڑاتا، دھول اڑاتا وہ شہزادہ سامنے تھا۔

”پھول مگر کو جانا ہے۔“ اس سوال نے مجھے گم سم کر دیا تھا۔ اگر وہ شہزادہ تھا اور میرا ہی تھا تو اگلے گاؤں کا پتا کیوں پوچھ رہا تھا؟

”ادھر کیوں جانا ہے؟“ میری اودھنی کے پھول بھاری ہو گئے جیسے کہ سلیمان میرے کندھوں پر اتر آیا ہو۔

”میری ماسی رہتی ہے۔“ بالوں کے ہتھکھڑو مٹی میں ڈوبے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پلکوں پر گرد جی بھی۔

”ان کی کوئی بیٹی تو نہیں ہے۔“ کنواری لڑکیوں کے سوال انہیں تا عمر شرمندہ کرتے رہتے ہیں۔ مقابل زیر لب ہنسا تھا۔

”نہیں۔۔۔ اور مجھے اب تک کسی سے محبت بھی نہیں ہوئی۔“ گھوڑے کو ایزہ لگاتا، گنگلتا ہوا وہ آگے چل دیا۔ جب اودھنی کے پھولوں اور دل کو ایک ساتھ سنبھالنا پڑ جائے تو ایک چیز لازمی ہاتھوں سے نکلتی ہے۔ سرسوں کے پھول تو میں سب سلامت گھر لے آئی تھی مگر دل؟؟؟

ڈھلتی شام سے دادی نے ڈوٹی سے ساگ ہتھیلی پر رکھ کر پکھا اور بغور مجھے دیکھا تھا۔

”جب لڑکیاں محنت اور دل سے ساگ بناتی ہیں تو ساگ زیادہ سواد بھرا ہوتا ہے۔“ قصہ گو کا تڑکا میرے حواسوں پر چڑھ گیا تھا اور رات سے قصہ گو کے قصے میں پہلی بار سوال ہوئے تھے۔ قصہ گو تلملائی تھیں۔ داستانوں میں بال برابر بھی رکاوٹ آجائے تو داستانیں ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ پرانی ہو جاتی ہیں۔ قصہ گو مانتا ہیٹ کر رہ جاتے ہیں۔

”نامی۔۔۔ کیوں میرے قصوں میں تو سوالوں کی دیوار کھڑی کر کے راہ روکتی ہے۔؟“ راہ تو میرے رکے تھے۔ سوال تو میں نے کیے تھے اور جواب تو عرفان سے تھے۔ ”اور اب تک مجھے کسی سے

بھی محبت نہیں ہوئی۔“ دیواروں کی مٹی کا لپ لپس ہو جاتا تھا۔ ہتھیلیاں فجر کے دھو میں دھلتی تھیں تو ساری رات کی تھکن اترتی تھی۔ مصلے پر فجر پڑھتے میں بل بل کر دعائیں مانگتی تھی۔

”کاش۔۔۔ گھوڑے کی باگ پکڑنے والا راستہ بھول جائے۔“ میں کبھی نہیں جان پاتی تھی کہ دعائیں راستے بھلاتی بھی ہیں یا نہیں۔ دادی میلے سے واپس آئیں تو سب کی ڈھیروں چوڑیاں لے آئیں۔

درجنوں چوڑیوں سے میں نے کلنیاں بھر لیں۔!!! محبت بھی کچ کی چوڑی ہو گئی۔ شور کرتی رہی، میں نور ایزہ بچے کی طرح تھپک تھپک کر سلائی رہی مگر بے سود۔!!! ساو کی جس بھری دوپہر کو پرانے کنوئیں کے پاس وہ گھوڑا چراتا ہوا ملا تھا۔ سب اور محبت کے شور نے مجھے بہرہ کر دیا۔

”پھول مگر راستہ بھول گئے ہو۔۔۔؟“ گھاس بوٹوں تلے روندتا وہ مقابل آ گیا تھا۔

”چاند مگر کاراہ یاد کر لیا ہے۔“

”ہائے۔۔۔ منزل تو کچھ اور ہی تھی تمہاری۔ اب کیوں۔۔۔؟“

”چاند مگر کی تاری کودل دے بیٹھا ہوں۔“ ہوا پھیل کی پتیوں کے ساتھ مل کر سیٹیاں بجاتی رہ گئی۔

”نام کیا ہے تمہارا۔۔۔؟“





”ناجی“

”تمہیں کسی نے بتایا ہے کبھی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔۔۔؟“ میں سوڑے کے پتے توڑتی مدھر ہنسی ہنسی تھی۔

”آہ جی۔۔۔۔۔ کئی بار بتایا ہے۔“ وہ کنویں کی منڈیر سے اندر کالے اندھیرے میں جھانک رہا تھا۔

”زبان کاٹ ڈالوں گا اس کی۔“ میرا ہاتھ میرے دل پر پڑا تھا۔

”کاہے جی۔۔۔۔۔ میری دادی بڑی قصہ، کہانیوں کی شوقین ہیں۔۔۔۔۔ مگنی جو جائیں گی۔“ شہزادہ تھپتھپے لگا تا گھوڑے کی باگ تھا دے دیا کے پار والے گاؤں چل دیا۔۔۔۔۔ جانے والے کی بانسری اب بھی پرانے کنویں کی منڈیر پر پڑی تھی۔۔۔۔۔!!!

بانسری کی دھن کے سحر میں، میں سپیرے کے ناگ کی مانند شام کو چھٹی چلی آئی تھی۔۔۔۔۔ وجود تپ اٹھتا تھا۔۔۔۔۔ سکون آب حیات سناٹا یا ب ہو جانا تھا۔ سوڑے کی شاخوں کے پار سے چاند کی لگا چھپی جاری رہتی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے میری کچھ کی چوڑیاں گھما تارہتا تھا۔

”تیرے ہاتھوں میں بختی ان چوڑیوں سے بڑھ کر دنیا کی کوئی آواز خوب صورت نہیں لگتی۔“

”مہندی سے ہاتھوں کو رنگا کرو۔۔۔۔۔ مہندی تمہاری ہتھیلیوں پر بڑے بڑے پکے رنگ چھوڑتی ہے۔“

”مجھے اپنے گھر کی ملکہ بناؤں گا جہاں تیرا حکم چلے گا۔“ خوابوں کی میزھیوں کے پائیدان میری دسترس میں تھے۔

”ہم دونوں کا اک چھوٹا سا گھر ہوگا۔۔۔۔۔ اس گھر میں ایک اونچی کھڑکی ہوگی جس سے میں بانس کی میزھی لگا کر تمہیں دیکھا کروں گی۔۔۔۔۔ دیوادر کے درختوں کے تنوں کے ساتھ ہماری بھیڑیں بندھی ہوں گی۔ تمہاری بانسری کی دھن سنتے ہی میں ساگ کی ہانڈی چھوڑ کر تمہاری راہ کی طرف بھاگوں گی۔“

میری آواز ساز کا ساتواں سر ہوگی۔ اس کے ہاتھ

میرے بالوں میں تھے۔

”اور اگر تمہاری ہانڈی جل گئی تو۔۔۔؟“ وہ ہنسا تھا اور میں غصے سے پرے ہوئی تھی۔

”مذاق اڑا رہے ہو میرا۔۔۔۔۔“ وہ میرا ہاتھ کچھ کر قریب ہوا تھا۔

”تو لڑتی جھگڑتی بڑی سونی لگتی ہے، فکر نہ کر میں وہ جلی ہوئی ہانڈی شوق سے، ہنسی خوشی کھالوں گا۔“ مردوں کو کبھی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ان کی محبت میں عورتیں کتنی ہانڈیاں جلا بھتی ہیں اور روٹیاں تو بے پرکالی کرتی ہیں۔ محبت کے منکھ کو پہلے پہل قصہ گو نے پکڑا تھا۔

”ناجی تو کیسی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے صحن میں گول گول گھومتے ہوئے اپنے آپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”کیسی ہو گئی ہوں۔۔۔۔۔؟“ دادی نے جیسے وہ سوال سنا ہی نہیں تھا۔ وہ اماں کا ہاتھ تھامے کہہ رہی تھیں۔

”صغریٰ! ایسی جوان اولاد سے خوف کھایا کرو، صدقہ دیا کرو۔۔۔۔۔ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔“ اور میری نظر زمین پر پڑتے میرے سائے پر تھی اور اماں کی نظریں مجھ پر۔

”ارے چھوڑیں اماں! خواتواہ وہم مت پالا کریں۔۔۔۔۔ ناجی جیسی لڑکی پورے وسیب میں نہیں ہے۔۔۔۔۔ لڑکوں کی مائیں سرد آہیں بھر بھر دیکھتی ہیں۔۔۔۔۔ ناجی کو اس ویزھے بھیجوں گی جن کے گھوڑوں کے بارغ ہوں گے۔“

نظریں پتھر پھوڑتی ہیں۔۔۔۔۔ اور پیار کی نظر تو وجود سیاہ کرتی ہے۔۔۔۔۔ جوانی صدقہ چاہتی ہے،

آزمائش ہوتی ہے۔ مجھے میری نظر نے کالا کیا تھا یا پھر اماں کی نظر نے۔۔۔۔۔؟ یا اس رات نے۔۔۔۔۔؟؟؟

☆ ☆ ☆

اس سیاہ پوش رات کے اندھیرے نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ گدھوں نے مردار نوچ کھائے تھے

اور میری محبت بھی مردار ہو گئی تھی۔ دادی نے کبھی بھی تو وہ قصہ نہیں سنایا تھا کہ جس میں شہزادہ گدھ کا روپ دھار لیتا ہے۔۔۔۔۔ میرا گدھ میرے سامنے تھا۔

”یہ اچھا نہیں ہوتا شہاب۔“

”نہیں ناجیہ۔۔۔۔۔ تمہارا وجود میرا ہی تو ہے۔۔۔۔۔ میں حق رکھتا ہوں۔“

”مگر ابھی ہمارا کوئی شرعی رشتہ نہیں بنا۔۔۔۔۔ یہ گناہ ہوتا ہے۔“ میں پیچھے اور پیچھے ہٹنے لگی تھی۔ وہ آگے اور آگے بڑھنے لگا تھا۔

”رشتہ بن جانے گا۔ تم فکر مت کرو۔“

”نہیں شہاب۔۔۔۔۔ میں نے گھر جانا ہے۔“

جینگر رونے لگے تھے۔ گیدڑوں کی آوازیں ماتم تھیں۔۔۔۔۔ میں نے اسے دھکا دیا تھا۔

”چھوڑو مجھے۔۔۔۔۔ تم نے مجھے محبت کے نام پر دھوکا دیا ہے۔“ سوڑوں کی شاخوں سے جھلکتا چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا۔۔۔۔۔ اور کوئی تارا ٹوٹا۔

میری اوڑھنی اندھے کنویں میں جا گری۔۔۔۔۔ میں اس رات راستوں کی دھول میں شگے سرگرتی پڑتی گھر آئی تھی۔ گھر کے صحن میں اوندھے منہ گر پڑی۔

رات کے پچھلے پہر ڈربے میں بند مرغیاں کر لانے لگی تھیں۔۔۔۔۔ ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے آس پاس لڑھک گئے تھے اور ان کی چادرو گرتی لائین لے کر چوکھٹ میں کھڑی تھی۔ قصہ گو کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید تھا۔

”ناجی۔۔۔۔۔ یہ، یہ۔۔۔۔۔ رات کے آخری پہر شگے سر تو کہاں سے آ رہی ہے۔“ میں ان کے قدموں میں دھم سے گر پڑی۔

”دادی۔۔۔۔۔ شہزادہ گدھ بن گیا تھا۔“

میں نے اپنے آپ کو ”چپ سہیلی“ کر لیا۔۔۔۔۔ آواز گونجی ہو گئی اور زندگی خاموش۔۔۔۔۔ تب سے قصہ گو کے قصوں نے مجھے بے زار کر دیا۔ ہم لڑکیوں کو قصے اور حقیقت کا فرق کیوں نہیں پتا ہوتا۔ آج بھی ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں اور قصے سنتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ”چپ سہیلی“

میں نے اپنے آپ کو ”چپ سہیلی“ کر لیا۔۔۔۔۔ آواز گونجی ہو گئی اور زندگی خاموش۔۔۔۔۔ تب سے قصہ گو کے قصوں نے مجھے بے زار کر دیا۔ ہم لڑکیوں کو قصے اور حقیقت کا فرق کیوں نہیں پتا ہوتا۔ آج بھی ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں اور قصے سنتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ”چپ سہیلی“

میں نے اپنے آپ کو ”چپ سہیلی“ کر لیا۔۔۔۔۔ آواز گونجی ہو گئی اور زندگی خاموش۔۔۔۔۔ تب سے قصہ گو کے قصوں نے مجھے بے زار کر دیا۔ ہم لڑکیوں کو قصے اور حقیقت کا فرق کیوں نہیں پتا ہوتا۔ آج بھی ماچس کی ڈبیا کے بونے آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوتے ہیں اور قصے سنتے ہیں۔۔۔۔۔ اور ”چپ سہیلی“

دیوار کی طرف منہ کی لپٹی رہتی ہے۔۔۔۔۔ قریب اور دھوکے سلیمانی ٹوپی پہن کر آتے ہیں، خبر ہی تو نہیں ہونے دیتے۔۔۔۔۔!!! اماں کو میری فکر ہے ہر روز میرا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔

”ناجی۔۔۔۔۔ تو ہنسی کیوں نہیں؟“

”چپ سہیلیاں چپ کی وفادار ہوتی ہیں

اماں۔۔۔۔۔ اگر نہ ہوں تو پھر عیب شگے سر بیڑوں میں پھرا کرتے ہیں۔“

”مجھے نظر لگی ہے۔“ میں یوں ہنسی تھی کہ مجھے رونا آ گیا تھا۔

”نظر لگتی تو ٹھیک تھا اماں۔۔۔۔۔ یہاں تو۔۔۔۔۔“

”مگر کیا۔۔۔۔۔؟“ میں صحن میں شگے پیر چلنے لگی۔۔۔۔۔ دو پٹا گھسٹا رہا۔ غمخوٹ کرتے کپڑے

پاؤں سے دھاگے اٹھتے تھے، میری تب تک نظر پڑتی رہی جب تک وہ مجھے دھندلے نظر نہیں آنے لگے۔۔۔۔۔ دھندلا تو اتنا کچھ تھا اگر وہ بھی ہوتا تو۔۔۔۔۔؟

اندھی رات، گدھ شہزادہ، سوڑے کے پار چھپتا حیا دار چاند، گیدڑوں کا ماتم۔۔۔۔۔ اور دھول اڑاتے راستوں میں شگے سر بھاگتی اماں کی لاڈلی ناجی۔۔۔۔۔ وہ

ناجی جو اس گھر میں جانے والی تھی جہاں گھوڑوں کے بارغ تھے۔ گھوڑوں کے گروہ گزرنے لگے۔۔۔۔۔ زمین ادھڑتی رہی۔ دھول کی تھاپ، آوازیں شور۔۔۔۔۔ مسافروں کو روک کر کسی نے پوچھ لیا تھا۔

”کہاں جا رہی ہے رات۔۔۔۔۔؟“ میں کھڑکی میں کھڑی بالوں کے مجھے پھینکی شہزادی بن گئی۔

”پھول نگر کو جا رہی ہے۔“ سر پٹ گھوڑا دوڑاتا گدھ شہزادہ آگے اور آگے کو جا رہا تھا۔ کھڑکی بند ہو گئی۔ شہزادی کے بال کٹ کر مٹی میں مٹی ہو گئے۔ قصہ شروع یا ختم۔۔۔۔۔؟ میں آگ کے الاؤ کے پاس اپنے بونے اکٹھے کیے انہیں قصہ سنار ہی ہوں۔۔۔۔۔!!!

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول نگر ہی جانا تھا۔ وہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول نگر ہی جانا تھا۔ وہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول نگر ہی جانا تھا۔ وہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول نگر ہی جانا تھا۔ وہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“

”مسافر راست نہیں بھولا۔۔۔۔۔ مسافر نے پھول نگر ہی جانا تھا۔ وہاں اس کی ماسی رہتی تھی اور ماسی کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس سے مسافر کو محبت بھی تھی۔“



## مرم عزیز وہ اک شخص

وہ دونوں بازو کھڑکی میں لٹکائے ہتھیلیوں پر چہرہ رکھے سامنے گھر کو دیکھنے کے ساتھ سوچنے میں مصروف تھی۔ اسے یہ گھر اور اس گھر میں رہنے والے لوگ بہت پسند تھے۔ اس کا اپنا زیادہ وقت بھی اسی گھر میں گزرتا تھا، لیکن وہ جتنا بھی یہاں رہ لیتی آخر اسے لوٹ کر یہیں آنا تھا جو اس کا گھر تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی اور وہ برا سامنے بنا کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔

بیڈ پر پڑی کتابوں کو کھول کر وہ ایک بار پھر حساب کے ان سوالوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی جو اس

## مکمل ٹافل





اور پایا آنے والے ہیں۔“

”میں....؟“ زہرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔  
”کیوں نہیں کیا ہے؟“  
”آپ! مجھے کچھ بتانا نہیں آتا۔“

”بتانا نہیں آتا تو سیکھو بھی“ میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہو سوائے ادھر سے ادھر پھدکنے کے اور بھی کچھ آتا ہے تمہیں۔ وہ زینت بھی نہیں آتی۔“  
اس نے ان کے گھر کام کرنے والی عورت کا نام لیا۔ ”وہ نہ مجھے شوق نہیں تمہیں کہنے کا۔“

”تو آپ! آپ بتائیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور وہی ہوا وہ مجھے سے اکھڑ گئی۔  
”ہنا سکتی تو تمہارا احسان نہ لیتی، لیکن میں نے ابھی فیشل کے بعد اسٹیم لی ہے چوہے کے آگے نہیں جاسکتی۔ تم نے نہیں بتانا نہ ہٹاؤ۔ میں ماما کو بتا دوں گی اور پایا کو تو تم جانتی ہو۔“

وہ کندھے اچکا کر یوں بولی جیسے گھر میں کھانا پکانے کی ذمہ داری صرف اسی کی ہے۔ وہ کئی دیر بے بسی کے عالم میں وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی جو اپنی بات مکمل کرنے کے بعد بے نیازی سے اپنا کام کرنے میں مصروف ہو گئی تھی

وہ خاموشی سے پچن میں آ گئی، فریج کھول کر دیکھا۔ اس میں کوئی سبزی موجود نہیں تھی۔ صرف انڈے تھے، لیکن خالی انڈوں کا وہ کیا کرتی۔ وہ روہائی ہو کر کینٹ کی طرف مڑی۔ ایک طرف کھانے کی فکر، دوسری طرف اسے اپنا ہوم ورک مکمل کرنا تھا۔ کل مس شمشاد کی کلاس میں ٹیسٹ تھا اور ان کی سخت گیری تو پورے اسکول میں مشہور تھی۔ اس کا دل تو ویسے بھی کمزور تھا۔ کوئی ادنیٰ آواز میں ہوتا تو وہ ڈر جاتی۔ اس نے ایک ایک کر کے سائے ڈبے کھولے۔ مختلف دالیں تھیں۔ ایک ڈبے میں ایسے مسور کی دال نظر آ گئی۔ اسے یہی دال بنانی آتی تھی۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کر کے دال چڑھائی اور دوسرے چوبیسے پر

چاؤلوں کا پانی رکھا تب ہی شرہ آ گئی۔

”کیا بنا رہی ہو؟“  
”دال چاول۔۔۔۔۔“

شرہ نے برا سا منہ بنایا۔ ”تم کچھ اور نہیں بنا سکتیں، پتا بھی ہے تمہیں مجھے دال چاول پسند نہیں،“  
”مجھے صرف یہی دال بنانی آتی ہے۔“  
”تو شرم کرو، یہی دال بنانی آتی ہے، کچھ گھر کے کاموں پر بھی توجہ دو، سارا دن تو عفرائے گھر بیٹھی رہتی ہو۔“ زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چاؤلوں کا پانی ابل رہا تھا۔ چاول ڈالنے کے بعد اس نے دال کو تڑکا لگایا۔ چاؤلوں سے پانی نکالنے کے لیے دیگی اٹھائی تو دیگی کوچ طرح نہ پکڑنے کی وجہ سے اس کا ہاتھ اچھا خاصا جمل گیا۔ اس نے بجائے کوئی ٹیوب لگانے کے اپنا ہاتھ تل کے نیچے رکھ دیا، لیکن جلن کسی صورت کم نہیں ہو رہی تھی۔

وہ شرہ کو بتانے کے لیے باہر آئی تو وہ موبائل لے کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ روٹی ہوئی اس کی پشت دیکھتی رہی اور پھر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ہنڈ پر اس کی کتابیں اور کایاں اسی طرح بکھری تھیں، لیکن اسے اتنی تکلیف ہو رہی تھی کہ وہ کسی اور طرف دھیان لگاتی نہیں پا رہی تھی۔ جب اس سے درد برداشت نہیں ہوا تو اس نے عفرائے گھر کا نمبر ڈائل کیا، لیکن وہاں کوئی فون انڈین نہیں کر رہا تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ سانسے والے گھر میں مکمل سناٹا تھا۔ تب ہی اسے صفورہ کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ وہ دوپٹا اچھی طرح ہاتھ پر لپیٹ کر چہرہ اچھی طرح صاف کر کے نیچے اترتی۔ وہ اچھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھیں کہ ان کی پہلی نظر

زہرہ پر پڑی اس کا رویہ دیا سا چہرہ انہیں چونکا گیا۔ ”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ شوگر بیگ صوفے پر رکھ کر اس کی طرف بڑھیں تو اس نے دوپٹا کھول کر سرخ ہاتھ ان کے آگے کیا۔  
”اومائی گاڈ! یہ کیا ہوا! انہوں نے پریشانی سے

اس کا ہاتھ تھاما تو اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو آ گئے۔ اس کے مسلسل رونے اور خاموشی پر وہ صوفے پر بیٹھ کر اکتائے ہوئے لچھے میں بولیں۔

”ایک تو پہلے سارا دن خوار ہو کر آؤ اور آتے ہی کسی نہ کسی کی روٹی صورت دیکھنے کو ملتی ہے اب بول بھی چلو زہرہ! پہلے ہی میرے سر میں بہت درد ہے۔“  
”ہاتھ جل گیا ہے۔“ وہ بہشکل بولی۔  
”کیسے؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں۔

”چاول بناتے ہوئے۔“  
”تمہیں کس نے کہا تھا کچن میں جا کر تجربے کرنے کو۔۔۔۔۔“  
”زینت آنی نہیں آتی تھیں تو آپ نے کہا۔“  
”کچھ کھانے کو بناؤ۔“

اب کی بار صفورہ نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر بیڑیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ انہوں نے تیزی سے ہینڈل گھمایا۔  
آہٹ پر فون پر بات کرتی شرہ نے ہنڈ برا کر موبائل بند کر دیا اور ماں کو دیکھ کر اس کی ہنڈ براہٹ اکتاہٹ میں بدل گئی۔

”ماما! میرا خیال ہے میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں کہ آپ کو میری پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیے، کم از کم تاک ہی کر لیا کریں۔“  
صفورہ نے ماتھے پر ہل ڈال کر اس کے انداز دیکھے۔ ”ایسا تم کیا کر رہی تھیں کہ مجھے تمہاری پرائیویسی کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور اگر تمہیں اپنے بڑے ہونے کا اتنا ہی احساس ہے تو گھر کے کام کرنا بھی سیکھو۔ کھانا بنانا تمہارا کام تھا نا کہ زہرہ کا۔ اس پر کیوں حکم چلاتی ہو؟ دیکھو جا کر اس نے اپنا ہاتھ جلا لیا ہے۔“

”افوہ ماما!“ شرہ نے گود میں رکھا تکیہ بیڈ پر چٹا اور بیڈ سے نیچے اتر آئی۔  
”اتنی تھکی پٹی بھی نہیں، سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ چاول نہیں ابال سکتی۔“

”اور تم اس سے چار سال بڑی ہو۔ تم نہیں چاول ابال سکتیں۔“

”پلیز ماما! میں بحث نہیں کرنا چاہتی، میری پڑھائی بہت ٹھ ہے، میں پوزیشن ہولڈر ہوں۔ میں پڑھائی کے علاوہ کسی اور چیز پر کانسٹرینٹ نہیں کر سکتی، جبکہ آپ کی وہ تھکی پٹی ایورج اسٹوڈنٹ ہے۔ پڑھائی کے علاوہ اسے سو کام ہوتے ہیں خاص طور پر سامنے والے گھر میں وقت گزارنا۔ وہاں بڑی خوش رہتی ہے۔“

گھر آتے ہی اس کی شکل پر پچکار برسنے لگتی ہے۔ ذرا سا کام کیا کرنے کو کہہ دیا۔ اس نے شکایتوں کے انکار لگا دیے۔ ”وہ غصے سے بولنے لگی۔ صفورہ نے ہونٹ سمجھ کر خود کو کچھ سخت کہنے سے روکا۔  
”جس کے بارے میں تم یوں جلی جلی سنار ہی ہو، وہ تمہاری سگی بہن ہے۔ بہنوں میں تو اتنا اتفاق ہوتا ہے اور تم اس سے سو کنوں کی طرح مقابلہ کرتی ہو۔“

”ماما! مجھے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنی ہے۔ وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل سے فائل اٹھاتے ہوئے بولی، جس کا مطلب تھا آپ جاسکتی ہیں۔“ آئندہ خود کام کر سکتی ہو تو کرو۔ زہرہ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہہ کر وہ رکی گئیں۔

”ہونہ۔۔۔۔۔“ شرہ نے غصے سے ہنکارا بھرا۔  
”اس بی جال کو تو میں دیکھ لوں گی۔ کیسے شکایتیں لگاتی ہے۔ شکل دیکھو تو معصومیت سے دس لوگوں کو دھوکا دے جائے اور مامانے اس کی وجہ سے مجھے ڈانٹا۔“ شرہ کو کسی طور پر یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی۔

☆☆☆  
”یہ کیا ہے؟“ وقار نے ڈوٹنگے کا ڈھکن اٹھا کر پہلے اندر جھانکا اور پھر پیچھے سے شور بے میں تیرتے مسور کے دانوں کو دیکھا۔  
”تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟“ ان کے برعکس صفورہ بڑے اطمینان سے اپنی پلیٹ میں چاول نما ملغوبہ ڈال رہی تھیں۔



”مجھ میں نہیں آ رہا۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ زینت نے کیا کوئی نئی ڈش ٹرائی کی ہے؟“ ان کے الفاظ کے برعکس ان کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔

”زینت آج نہیں آئی۔“ انہوں نے اب چاندلوں پر وہ شور بہنا دال ڈال کر کھانا شروع کر دیا تھا۔ ”تو یہ.....“ وقار نے اب بھی پلیٹ میں کچھ نہیں ڈالا تھا۔

”یہ زہرہ نے بنائے ہیں۔“

”زہرہ نے.....“ وہ حیران ہو کر بولے۔

”شرمہ کہاں تھی، وہ بنائی۔“

”اس کو کچھ بنانا نہیں آتا۔“ وہ کھاتے ہوئے بولیں۔

”ظاہر سی بات ہے جیسی ماں ویسی بیٹی۔ تمہیں کچھ بنانا آتا ہوتا تو انہیں کھاتی نانساری عمر گزرتی۔ باہر کا اور نوکروں کے ہاتھ کا کھاتے ہوئے۔ مجھے تو یاد نہیں پڑتا، مجھی تم نے کچھ بنایا ہو، بے چاری اماں مرحومہ جی یہ بی خواہش لیے دنیا سے گزر گئیں۔“

صفورہ کا پلیٹ میں چلتا چھپرہ رک گیا۔ انہوں نے ایک جلتی نظر سامنے بیٹھے اپنے بے حس شوہر پر ڈالی۔

”اور ساری عمر ہوئی مجھے مشین کی طرح کام کرتے ہوئے جب سے تم سے شادی کی ہے، ایک دن بھی سکون کا سانس نصیب نہیں ہوا۔ پہلے تمہاری اماں مرحومہ نے زندگی کا دائرہ تنگ کر رکھا تھا اور اب تم ان کی پیوری کر رہے ہو اور یہ جو تم ہوٹلوں اور نوکروں کے کھانوں کی بات کر رہے ہو۔ شکر کرو یہ بھی ملتے ہیں، تو کس کی وجہ سے..... میری وجہ سے، میں اگر صبح سے شام تک کام نہ کروں تو تم لوگ یوں عیش نہیں کر سکتے۔ تم نے آج تک کیا، کیا سوائے باتیں کرنے اور طنز کرنے کے اپنی اماں مرحومہ کی طرح۔“

وہ جو اتنی دیر سے اتنے محل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ صبر کا دامن چھوٹ گیا تھا۔

”اپنی زبان کو لگام دو صفورہ!“ وقار نے غصے

سے پلیٹ کو پیچھے دھکیلا۔

”ختم ہو گئیں باتیں یا کچھ اور ہے بولنے کو اور جن بیٹیوں کی بات کر رہے ہو۔ وہ تمہاری بھی ہیں، میں ایسا کرتی ہوں، جاب چھوڑ دیتی ہوں اور گھر بیٹھ کر ان کی کوکنگ پر دھیان دیتی ہوں۔ تم کہیں کام ڈھونڈ لو اور ہر مہینے ساٹھ، ستر ہزار میرے ہاتھ پر رکھ دیا کرو، میں اپنی زبان کو لگام دے دوں گی۔“

”تمہیں بڑا مان ہے اپنے کمانے کا۔“ وقار دانت چیں کر بولے۔

”کیوں نہیں ہونا چاہیے؟“ جواباً وہ ابرو اچکا کر بولیں۔ ”تو وہ صبر کا کڑوا ٹھونٹ پی کر رہ گئے۔“

”زندگی عذاب ہو گئی ہے، تم جیسی بد زبان عورت سے شادی کر کے۔“

”تو کر لیتی تھی نا اپنی اس گنوار کزن سے شادی، جس سے شادی کروانے کی خواہش دل میں لیے تمہاری اماں مرحومہ چل بسیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہاں کر لیتا..... اگر تم پر نظر نہ پڑی ہوتی۔ شکل دیکھ کر یہ تو پتا نہیں چلتا کہ منہ کے اندر کتنی گز بھر لی زبان ہے۔“

”اور واقعی شکل کے ساتھ میٹھی زبان دیکھ کر یہ پتا نہیں چلتا۔ یہ زبان کتنا زہر اگل سکتی ہے۔“ جواباً وہ بھی دو بد بولیں۔

”میں بحث نہیں کر سکتا تم سے.....“ وہ ہار مانتے ہوئے بولے۔

”تو مت کرو۔ میں نے کب تمہیں دعوت دی تھی؟“ وہ اب پلیٹیں اٹھا کر ٹرائی میں رکھتے ہوئے بولیں۔

”مجھے سخت جھوک لگی ہے۔“ آخر ان سے صبر نہ ہو سکا، تو انہیں کہنا پڑا۔

”انداز کچھ نہیں سوائے اس وال چاول کے۔“

”میں پڑاؤ رکھنے لگا ہوں۔“

نئی اور صبح انہیں بینک بھی جانا تھا۔ انہوں نے پہلی بڑی پر قدم رکھا تھا جب وقار کی آواز سنا دی۔

”ہزار روپے دیتی جاؤ۔“ صفورہ نے ایک افسوس بھری نظر اس بے حس انسان پر ڈالی جس سے اس نے بھی محبت کی تھی اور سیر حیاں چڑھ گئیں۔

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے قدم زہرہ کے کمرے کے باہر رک گئے۔ انہوں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔

وہ اس کے دروازے پر چھنے آئی تھیں، لیکن وہ شاید سوئی تھی۔ وہ بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ مڑ گئیں۔

دروازہ بند ہوتے ہی زہرہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کے آنسو پھر رواں ہو گئے۔ ایک تو جھوک، دوسرا ارد کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر تک جب اسے سکون نہیں آیا تو وہ دروازہ کھول کر دے باؤں باہر نکلی۔ اس نے اوپر سے نیچے جھانکا جہاں فی دی لاؤنج کی تیز روشنی میں سب نظر آ رہا تھا۔ لارج بڑا کا باکس کھلا تھا۔ وقار اور شرمہ کسی منووی پر تہمرہ کرتے ہوئے پڑا کھا رہے تھے۔

زہرہ نے بڑے دکھ سے اس منظر کو دیکھا۔ جھوکی تو وہ بھی تھی، لیکن کسی کو وہ یاد بھی نہیں تھی۔ کھانا

تو دور کی بات! پاپا نے ایک دفعہ بھی اس کا جلا ہاتھ نہیں دیکھا۔ وہ جو کچن میں کچھ کھانے کے لیے جارہی تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے واپس لوٹ گئی۔

☆☆☆

صبح جب وہ تیار ہو کر نیچے اتری۔ ماما چاچکی تھیں۔ کچن سے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس کا ناشتا رکھا تھا۔ تو اس ٹھنڈے ہو چکے تھے لیکن وہ رات کی جھوکی تھی۔ اس نے اکرے ہوئے تو س پر جیم لگایا۔ ابھی اس نے بشکل ایک تو س کھا کر دو ٹھونٹ دودھ پیا تھا کہ اس کی اسٹول وین آ گئی۔ وین میں بیٹھنے سے پہلے اس نے عفرہ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ ان کے پورچ میں گاڑی نہیں تھی جس کا مطلب تھا عفرہ جا چکی ہے۔

وین میں موجود لڑکیوں نے چور نظروں سے اس کی سوچی ہوئی لال آنکھوں کو دیکھا، لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا نہ بلایا، کیونکہ ایک تو وہ دیے بھی خاموش طبع تھی۔ دوسرا وہ اپنے احساس کتری کو لائق میں چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔ عفرہ کے علاوہ اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ جب وہ اسکول گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔ عفرہ پہلے سے درخت کے نیچے مخصوص جگہ پر کھڑی اس کی منتظر تھی۔

”تم ٹھیک ہو، کیا ہوا ہے؟“ اس نے حیرت اور پریشانی سے زہرہ کی سوچی ہوئی لال آنکھیں دیکھیں۔

”کچھ نہیں۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔

عفرہ نے اس کا ہاتھ تھاما، تو درد کے مارے اس کی سسکی نکلی گئی۔ عفرہ نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا اور ہاتھ پر نظر پڑے ہی اس منہ سے ”او میرے خدا“ لگا تھا۔ زہرہ نے آٹھ گھنٹیں ایک بار پھر آنسوؤں سے بھر لیں۔

یہ کیسے ہوا؟ اس نے افسوس سے اس کا ہاتھ پکڑا جہاں بڑے بڑے چھالے بنے تھے۔

”کھانا بناتے ہوئے جل گیا۔“

”تم کیوں کھانا بنا رہی تھیں باقی سب کیاں تھے؟“ عفرہ کے سوال پر وہ خاموش رہی تھی۔

گھٹی بج گئی تھی۔ میڈیکل اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

زہرہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”عفرہ!“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں عفرہ کو پکارا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں نے میٹ کی تیاری نہیں کی اور ہوم ورک بھی نہیں کیا۔“

اس کی بات سن کر عفرہ ابھی پریشان ہو گئی۔

”تم چلو..... میں تمہاری ہیلپ کر دوں گی، تم میرے پیچھے والی چیز پر بیٹھنا۔“ وہ اس کو سمجھاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

کوچن پیپر ملتے ہی سب تیزی سے شروع ہو گئے، صرف وہی خالی خالی نظروں سے کوچن پیپر کو گھور رہی تھی اور چند منٹوں بعد ہی مس شمشاد کی



عقاب نظر میں نے اسے تازہ لیا تھا۔

”زہرہ! سینڈ اپ.....“ ان کی دھاڑتی آواز پر سب لڑکیوں نے سر اٹھا کر پہلے مس شمشاد کو اور پھر زہرہ کو دیکھا۔ جس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں تم؟“ وہ اس کے صین سر پر آ کر کھڑی ہو گئیں اور جھینے کے انداز میں اس کی آنکھیں اٹھائی جو بالکل خالی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ انہوں نے پچھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”آدھا گھٹنہ ہونے کو ہے اور تم نے ایک سوال بھی حل نہیں کیا اور بار بار عفرہ کے پیچھے کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔“

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں؟“ انہوں نے انگلی زور سے اس کے سر پر بجائی۔

”ٹیسٹ کی تیاری کی بھی ہے یا نہیں؟“ اب کی بار اس نے سرٹھی میں ہلایا۔

عفرہ اسے لکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم اٹھی تھی۔ ”میم! کچھ نیکی کل سے زہرہ کی طبیعت خراب ہے۔ اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ اس وجہ سے وہ تیاری نہیں کر سکی۔“

”عفرہ! کیا میں نے آپ سے کچھ پوچھا؟ جو آپ اس کی دکان کرنے کھڑی ہو گئی ہیں۔ ہر ٹیسٹ میں اس کا رویہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب کی بار اس کی کیمپین مجھے پرنسپل تک لے کر جانی پڑے گی۔“

ان کے کہنے پر عفرہ نے مجبور نظر روتی ہوئی زہرہ پر ڈالی اور برے دل سے پچرل کرنے لگی۔

”اور تم زہرہ گیٹ آؤٹ، میری کلاس سے باہر نکل جاؤ۔“

”میم!“ وہ روتے ہوئے اتنا ہی بول سکی۔

”جو میں نے کہا ہے، ویسا ہی کرو، ورنہ میں اس سے بھی زیادہ سخت سزا دے سکتی ہوں۔“ زہرہ جھکے سر کے ساتھ باہر نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔

اتنی ذلت..... اسکول کا ہر آتا جاتا بچہ اسے

دیکھ رہا تھا۔ کچھ تو خاموشی سے گزر رہے تھے اور کچھ کے ہنسنے کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔

”تم میرے ساتھ چلو۔“ چھٹی کے وقت عفرہ نے اسے کہا تو وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی عفرہ نے اونچے آواز میں سلام کیا تھا۔

”آگئی میری گڑیا!“ صائمہ آنٹی بولتی ہوئی کچن سے نکلیں اور ساتھ ہی ان کی نظر زہرہ پر پڑی۔

”ارے زہرہ بھی آئی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھیں۔

”کیا ہوا زہرہ! طبیعت ٹھیک ہے؟“

”نہیں ممما! اس کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ اس کا ہاتھ دیکھیں۔“ عفرہ نے اس کا جلا ہوا ہاتھ اونچا کیا۔

”او میرے خدا..... کیا، کیا تم نے بیٹا۔ کچھ لگایا بھی یا نہیں؟“ وہ اس کا دوسرا ہاتھ تھام کر اسے صوفے تک لے آئیں۔

”کو کنگ کا شوق چڑھ آیا میڈم کو، بندہ پوچھے بی بی اگر پکانا نہیں آتا تو پنگا لینے کی ضرورت کیا ہے۔“ صائمہ اس کا سر ہجایا ہوا چہرہ دیکھ کر کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”بیٹا! زینت پکانے نہیں آئی تھی؟“ انہوں نے اسے بازوؤں کے گھیرے میں لے کر پوچھا۔

”نہیں.....“

”شرہ کہاں تھی؟“

”آپی نے کہا تھا پکانے کو۔“

”ہوں.....“ انہوں نے سمجھ کر سر ہلایا۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ ایسا ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ اور ساتھ ہی انہوں نے بڑے بڑے کو آواز دی۔

”فخر!“

”جی ممما!“ وہ شاید پڑھ رہا تھا۔ کتاب ہاتھ میں لیے باہر آ گیا۔

”یہ دیکھو، زہرہ کا ہاتھ کس بری طرح زخمی ہے۔“ اس نے ذرا سا آگے ہو کر دیکھا اور پھر ہنسنے لگا۔

”تو یہ لڑکی ایسا کیا..... کیا ہاتھ کے ساتھ؟“ اس نے ہاتھ پکڑ کر غور سے جائزہ لیا، پورے ہاتھ پر پانی کے جیلے سے بے تھے۔

”کچھ لگایا تھا ہاتھ پر.....“ وہ ہاتھ غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”نہیں درد ہو رہا تھا، تو میں نے ہاتھ پانی کے نیچے رکھ دیا۔“ فخر نے بے ساختہ ماں کو دیکھا۔

”سن رہی ہیں۔“

”ہاں سن لیا۔ تم اب تبصرہ بعد میں کرنا پہلے کوئی دوا لگا دو۔ مجھے تو لگ رہا ہے بخار بھی ہو رہا ہے، آنکھیں دیکھو، کیسی ہو رہی ہیں۔“

وہ کتاب میز پر رکھ کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ جب واپس آیا اس کے ہاتھ میں ٹیوب تھی۔

”سیدھا کرو ہاتھ۔“ دوا کی لگنے سے پہلے ہی زہرہ نے آنکھیں زور سے میچ لیں۔

”یہ بڑا لڑکا ہے! نکلتا نہیں، فخر نے مسکرا کر اس کا ہاتھ دیکھا۔

”بھائی آپ ڈاکٹر بن رہے ہیں۔ ہیں نہیں۔“ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر دوا کی دینا۔ یہ نہ ہو میری بیماری دوست کا ہاتھ خراب ہو جائے۔“

”تمہاری بیماری دوست نے ہاتھ خراب کرنے میں خود کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب تم میری ڈاکٹری کو بدنام نہ کرو۔“ اس نے مرہم لگاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ جب لاؤنج میں داخل ہوئی، زینت صوفے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

”بے بی!“ آج اتنی دیر کر دی۔ کب سے انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی، ”کھانا لگاؤں۔“

”نہیں مجھے بھوک نہیں۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ آپ کو اگر کوئی کام نہیں تو آپ بھی آرام کر لیں۔“ وہ کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

کمرے میں آ کر ٹیک رکھ کر وہ بیڈ پر چٹ لیٹ گئی تھی۔

جلا ہوا ہاتھ بازو تک اتنا وزنی ہو چکا تھا کہ اسے ہلانا دو بھر ہو گیا تھا۔ درد برداشت کرتے ہوئے پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ کراہ کے ساتھ کھلی وہ جلتے ہوئے ہاتھ کی طرف کروٹ بدلے سو رہی تھی۔ وہ بمشکل سیدھی ہوئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ بند دروازہ اس کے پاؤں میں موجود اسکول شوز اور یونیفارم بتا رہے تھے کہ کوئی اس کے کمرے میں نہیں آیا۔ اپنی بے فکری اسے ایک بار پھر دلا گئی، لیکن وہ اٹھ نہیں سکی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ ابھی بینک پہنچی تھیں۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انہوں نے کمپیوٹر آن کیا، جب ان کے فون پر کال آئی تھی۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ڈال کر فون دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا، لیکن جب فون منسلک تیسری دفعہ آیا تو انہیں کال ریسیو کرنی پڑی۔

ان کی جیلو کے جواب میں جب انہیں بتایا گیا کہ فون کہاں سے آیا ہے۔ وہ ان کے لیے حیران کن تھا، لیکن اس کے بعد جب انہیں آنے کا کہا گیا تو وہ ان کے لیے پریشان کن تھا۔ فون رکھنے کے بعد وہ کئی دیر غائب دماغی سے کمپیوٹر اسکرین کو



دیکھتی رہیں اب ان کے لیے کام پر توجہ پر قرار رکھنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی کوئی کامیابی کا کبھی گواہ نہیں تھیں۔ ان کی کارکنان زہرہ کے اسکول کی طرف تھا۔

”السلام علیکم!“ کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے سلام کیا تو پرنسپل صاحبہ انہیں دیکھ کر مسکرا دیں۔

”وعلیکم السلام مسز وقار! بلیز آئیں۔“

”خیریت مسز یونس! آپ نے مجھے اتنی امیر جیسی میں بلایا۔ کوئی پرابلم ہے؟“ ان کے سوال پر مسز یونس نے گھانٹھا کر بات شروع کی۔

”پرابلم تو ہے مسز وقار! اگر چھوٹی موٹی بات ہوتی تو میں آپ کو کال نہ کرتی۔ میں پچھلے کئی سالوں سے آپ کو جانتی ہوں۔ ثمرہ آپ کی بیٹی ہمارے اسکول کی بریلیٹ اسٹوڈنٹ رہ چکی ہے۔ حتیٰ کہ بورڈ میں پوزیشن لے کر اس نے ہمارے اسکول کا نام روشن کیا ہے، لیکن افسوس۔“

وہ کہہ کر رکیں۔ ساتھ ہی صفورہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی۔ ”جیسی توقعات ہمیں زہرہ سے تھیں، مجھے بہت افسوس ہے کہنا پڑ رہا ہے۔ وہ بالکل ثمرہ سے مختلف ہے۔ ہر روز پچاس کی پکلیں لے کر آ رہے ہوتے ہیں۔“

”کیا اس کے بی بیو میں کوئی پرابلم ہے؟“ صفورہ کو اپنی آواز بشکل سنا دی۔

”بی بیو پر بھی ایک پرابلم ہے، لیکن یہ نہیں کہ وہ وائلنٹ ہو جاتی ہے، وہ بہت کوائیٹ ہے اتنی کوائیٹ کہ کلاس میں اس کا ہونا نہ ہوتا ایک برابر ہے۔ کسی ایکٹیوٹی میں وہ حصہ نہیں لیتی۔ جب بھی ٹیسٹ ہوتا ہے اس کے مارکس آؤٹ اسٹینڈنگ نہیں ہوتے۔ پہلے تو پھر نارمل مارکس تھے۔ اب تو نارمل رزلٹ بھی نہیں ملتا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر وہ سہم کر رونا شروع کر دیتی ہے۔ کلاس میں وہ کسی سے بات نہیں کرتی، سوائے عفرائے۔ شاید وہی اس کی ایک فرینڈ ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ آپ کے

گھر میں کچھ پرابلم ہے ورنہ ثمرہ بھی اس سے متاثر ہوتی۔ پھر کیا وجہ ہے اگر آپ ہم سے کچھ شیئر کریں تو شاید ہم کچھ سہیل کر سکیں۔ وہ حیران و پریشان تھیں۔ زہرہ، ثمرہ سے بہت مختلف تھی، لیکن پڑھائی میں وہ اتنی پیچھے ہے، یہ تو ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں مسز وقار!“ ان کے چہرے پر اتار چڑھاؤ دیکھ کر پرنسپل نے انہیں تسلی دی۔ ”سب بچے ایک جیسے نہیں ہوتے۔ میں یہ بات سمجھتی ہوں، لیکن میں جانتی ہوں آپ زہرہ پر زیادہ توجہ دیں۔ ہم بھی کوشش کریں گے، لیکن پرنسپل کا رول سچر سے زیادہ ہوتا ہے۔“

انہوں نے بشکل سرانجام میں بلایا۔

”اب دیکھیے! آج بھی ٹیسٹ تھا، وہ نہیں آئی۔“ اب کے انہوں نے چونک کر پرنسپل کو دیکھا۔

”اس طرح فرار کا راستہ اختیار کر کے وہ خود کو نقصان پہنچا رہی ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔ میں زہرہ پر پورا دھیان دوں گی۔ آپ کا بہت شکریہ۔۔۔۔۔ آپ نے اتنا کٹھن شوکیا۔“

”یہ تو ہمارا فرض ہے مسز وقار!“ وہ ان سے کھڑے ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے بولیں۔

گاڑی تک آتے آتے ان کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ وہ اتنی لاپرواہ تھیں کہ انہیں یہ تک پتا نہیں چلا کہ زہرہ اسکول گئی ہے یا نہیں، اس کی لائف میں کیا ہو رہا ہے۔ ان کی بیٹی سائیکو پینٹن بنی جا رہی ہے۔ انہوں نے کار میں بیٹھ کر فون کر کے اپنے نہ آنے کا بتایا اور گاڑی گھر کی طرف موڑ لی۔ ان کو یوں اچانک دیکھ کر زینت حیران ہوئی تھی۔

”بابی! آپ اس وقت۔“

”ہاں۔“ انہوں نے بیک صوفے پر رکھا۔

”ثمرہ کہاں ہے؟“

”وہ تو کالج گئی ہے۔“

”اور زہرہ۔۔۔۔۔“

”وہ اپنے کمرے میں ہے۔“

”وہ اسکول کیوں نہیں گئی۔“ انہوں نے ماتھے پر ہل ڈال کر پوچھا۔

”میں تو دو دفعہ اٹھانے گئی تھی، پر وہ نہیں اٹھی۔“

”اس نے ناشتا کیا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔ کل دوپہر بھی کھانے سے منع کر دیا تھا۔ کل سے تو وہ کمرے سے ہی نہیں نکلی۔“

”اور تم مجھے ابھی بتا رہی ہو؟“ انہوں نے غصے سے اسے دیکھا، وہ بے چاری بوکھا کر رہی تھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچیں۔ دروازہ کھولتے ہی انہیں جھکا لگا تھا۔ وہ یونیفارم میں جوتوں سمیت بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی تھی۔ ان کے دل کو جیسے دھچکا لگا، وہ بھاگنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھیں۔ انہوں نے اسے پکڑ کر سیدھا کرنا چاہا اور انہیں لگا جیسے انہوں نے آگ کو چھو لیا ہو۔ وہ بخار میں تپ رہی تھی اور بخار کی شدت اتنی تھی کہ اس کا چہرہ دھبہ دھبہ رہا تھا۔ وہ دہلیز سے زینت کو کال کرنے لگیں۔

”زہرہ بیٹا! آنکھیں کھولو۔“ وہ اس کا چہرہ چھو تھپتھپانے لگیں۔

”وہ کب سے یوں پڑی ہے اور کسی نے اسے دیکھا تک نہیں۔“ وہ اب زینت پر چلانے لگیں، جس کے ہاتھ پاؤں زہرہ کی حالت دیکھ کر پھول گئے تھے۔

”زہرہ! میری جان آنکھیں کھولو۔“ وہ اب اس کا گرم ہاتھ چومتے ہوئے رو پڑی تھیں۔

بابی! شاید بخار زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہے۔ آپ ڈاکٹر کو بلا لیں۔“ زینت نے ہی انہیں ہوش دلایا تھا۔ وہ تیزی سے نیچے کی طرف بھاگیں، ڈاکٹر کو فون کرنے کے لیے۔

”بخار کافی تیز ہے۔“ اکمل صاحب نے سیدھا ہوتے ہوئے انہیں بتایا۔

”کوئی پریشانی والی بات تو نہیں۔“ صفورہ کی نظریں مسلسل اس کے سرخ چہرے پر تھیں۔

”اگر آج رات بخار اتر جاتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہسپتال میں ایڈمٹ کروانا پڑے گا۔“ صفورہ نے پریشانی سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

”کوئی ڈبئی دباؤ یا پریشانی ہے جو بخار اتنی شدت اختیار کر گیا ہے اور ہاتھ دیکھا ہے آپ نے، کتنا جلا ہوا ہے۔“ وہ ان کے نیلی ڈاکٹر تھے۔ زہرہ کی حالت دیکھ کر انہیں بھی دکھ ہوا تھا۔

”بہر حال انکیشن میں نے لگا دیا ہے، آپ پانی کی گیلی پیٹاں اس کے ماتھے پر رکھتی رہیں۔“

ڈاکٹر کے باہر نکلتے ہی ثمرہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ”خیریت ماما! یہ ڈاکٹر انکل کیوں آئے تھے۔“

”زہرہ کو کافی تیز بخار ہے۔“ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولیں۔

”اچھا کب سے۔۔۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی۔

”پچھلے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولیں۔

”پتا بھی کیسے چلتا، گھر میں نظر کب آتی ہے۔“ وہ منہ پڑھا کر کے بولی۔ صفورہ اس وقت اتنی پریشان اور تھکی ہوئی تھیں کہ اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئیں۔

”زینت آنٹی! کھانا لگا دیں۔ بہت جھوک گئی ہے۔“ وہ بچن کی طرف ہانک لگا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔





”ہاجی! آپ کے لیے کھانا لگاؤں۔“  
 ”نہیں زینت! میرا دل نہیں چاہ رہا۔ میں  
 زہرہ کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم چھجڑی بنا کر  
 زہرہ کے کمرے میں لے آؤ۔“ وہ دھیرے سے اس  
 کے پاس جا کر لیٹ گئیں اور کتنی دیر تک اس کا چہرہ  
 دیکھتی رہیں۔

کردیا۔ وقار کو لفظوں سے کھینا آتا تھا۔ وہ وقار کے بحر میں اتنا کھو چکی تھی کہ حقیقت سے مکمل نظر میں چرائے ہوئے تھی۔ اسے لگتا تھا ہر بار کی طرح اس کی ماں یہ ضد بھی پوری کر دے گی، لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ ماں کے انکار پر وہ کتنی دیر کچھ بول ہی نہیں سکی۔

”لیکن کیوں امی؟ آخر وہ غصے سے بولی، کیا برائی ہے وقار میں؟“

”اگر میں تم سے یہ پوچھوں کیا اچھائی ہے وقار میں؟“

آپ کو صفہ خالد کا بیٹا پسند ہے، لیکن مجھے وہ پسند نہیں۔ زندگی مجھے گزاری ہے، اگر میں خوش نہیں رہی تو آپ بھی خوش نہیں رہیں گی۔“

”صفورہ! میں جانتے پوچھتے تمہیں کنوئیں میں کودنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ اب چاہے تم جو بھی کہہ لو یا کرلو۔“ اب کے وہ سخت لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے۔ آپ کی مرضی ہے۔“ وہ کہہ کر رکی نہیں۔ فاطمہ نے افسردگی سے اسے جاتے دیکھا۔

## بیوٹی بکس کا تیار کردہ



وہ جو دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھیں، بے ساختہ گھومیں۔ ”تم پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ اب یہ گناہ نہ کرنا۔“ چار سال بعد انہوں نے اس سے بات کی تھی اور اسی وقت وہ بچہ ان کے لیے اہم ہو گیا تھا، جس کی خبر سنتے ہی اس کی ماں کا دل نرم ہو گیا تھا۔

”اگر میں اس بچے کو جنم دوں تو آپ مجھے معاف کر دیں گی؟“ وہ ایک دم اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔

”تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہے صفورہ! ماں ہوں نا۔ کبھی تمہیں بددعا نہیں دے سکتی ہاں اس بچے کے صدمہ میں تمہیں معاف کرنی ہوں۔ لیکن وعدہ کرو، اس کی پرورش ایسے کرو گی جیسے میں تمہاری چاہتی تھی، تاکہ مرنے کے بعد مجھے سکون ہو۔“ اور وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو دی تھی۔

☆☆☆

ان کی آنکھ کسی احساس سے کھلی تھی۔ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ زہرہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”زہرہ!“ انہوں نے تیزی سے اسے کندھوں سے اٹھا۔

”کچھ چاہیے تھا بیٹا!“

”پانی!“ اس ایک لفظ سے بھی اس کی نقاہت جھٹک رہی تھی۔

”تم لیو، میں لاتی ہوں۔“

وہ ایک دم تیزی سے اٹھیں۔ نیچے ٹی وی چل رہا تھا۔ ریوٹ وقار کے ہاتھ میں تھا اور سامنے چائے کے ساتھ کٹ رکھے تھے، جبکہ دوسری طرف شمرہ ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس لیے دوسرے سے موبائل تھا۔ مصروف تھی۔ انہیں غصہ تو بہت آیا، پر ضبط کرنی ہونی چاہی کی طرف بڑھ گئیں۔ زینت چن کی صفائی کر رہی تھی۔

”چھڑی بن گئی زینت!“

”جی ہاں! زہرہ بے بی اٹھ گئی، طبیعت ٹھیک ہے اب۔۔۔۔۔؟“

”ہاں ابھی ابھی ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ میں۔“ ہاتھ چلاتے ہوئے بولیں۔

زینت نے ان کا تھکا ہوا چہرہ دیکھا۔

”آپ چلیں۔۔۔۔۔ میں آپ کے لیے چائے کے ساتھ کچھ لے کر آتی ہوں، آپ نے بھی سارا دن کچھ نہیں کھایا۔“

”شکریہ۔“ وہ احسان مندی سے کہتے ہوئے مزیں۔

”ارے بیگم کہاں غائب ہو، جب سے آیا ہوں نظر ہی نہیں آ رہیں۔“ انہوں نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

”زہرہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس کے پاس ہوں۔“

”کیوں، اسے کیا ہوا؟“ بڑا سرسری انداز تھا۔

”تیز بخار ہے۔“ وہ کہتے ہوئے جگ لیے میز چیلوں کی طرف بڑھنے لگیں۔

”زہرہ کی میسٹ فرینڈ کا تین مرتبہ فون آچکا ہے۔“ شمرہ نے طنزیہ انداز میں انہیں اطلاع دی تھی۔

”ہم سے زیادہ تو اسے فکر لگی تھی۔“ اب وہ ہنستے ہوئے باپ کو بتا رہی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر اوپر آ گئیں۔ زہرہ بیدار اون سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”اب کسی طبیعت ہے بیٹا!“

”ٹھیک ہوں ماما!“ وہ دبیسی آواز میں بولی۔

”بیٹا اتنی طبیعت خراب تھی، کم از کم ماما کو بتانا تھا نا!“ زہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب ہی زینت اندر داخل ہوئی۔

”کچھ بڑی دیکھ کر اس کے منہ کا ذائقہ اور خراب ہو گیا تھا۔“

”تھوڑا سا کھانا پڑے گا زہرہ! کیونکہ دوئی لینی ہے۔“ صفورہ نے پچھلے اس کے منہ کی طرف

براہ راست اشارے سے مجبوراً کھانا پڑا۔

تھوڑا سا کھانے کے بعد اس نے منع کر دیا تھا۔

”اب میری بیٹی جلدی سے ٹھیک ہو جائے۔“

اسکول کا کتنا حرج ہو رہا ہے۔“

”ماما! مجھے اسکول نہیں جانا۔“

”صفورہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔“ کیوں بیٹا؟“

”مجھے سے پڑھا نہیں جاتا۔“ اب کی بار اس کی آواز بھرا گئی تھی، تو صفورہ نے بے ساختہ اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیا تھا۔

”زہرہ میری جان! یہ کیا بات ہوئی، اگر ٹیسٹ اچھا نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسکول چھوڑ دیا جائے۔“

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تم ٹیسٹ کی

باری نہیں کر سکتیں، نیچرل سی بات ہے۔“

”نہیں ماما۔۔۔۔۔ یہ نیچرل نہیں۔ میں کچھ نہیں

کر سکتی، نہ مجھے اسکول میں کوئی پسند کرتا ہے اور نہ گھر

میں۔۔۔۔۔ میں شمرہ آبی کی طرح اٹھتی جیٹ نہیں،

اب اسکول میں مجھے شمرہ آبی سے کمپیر کرتے ہیں

اور گھر میں بھی مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ جب میں

چھوٹی تھی تو آبی کہتی تھیں کہ پاپا مجھے اسپتال سے

اٹھا کر لائے ہیں۔ مجھے غصہ آتا تھا۔ میں روتی تھی، مگر

اب مجھے وہ ٹھیک لگتا ہے، کیونکہ سب ان سے پیار

کرتے ہیں۔ پاپا نے کبھی مجھے پیار نہیں کیا۔ ان کی ہر

بات کا خیال رکھتے ہیں۔ گھٹ لاتے ہیں اور مجھے۔۔۔۔۔“

وہ کہتے ہوئے رو پڑی اور اس کے یوں

رونے پر صفورہ نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

”زہرہ! تم سے کس نے کہا، تم سے کوئی پیار

نہیں کرتا۔ میں کرتی ہوں، تم مجھے دنیا کی ہر چیز سے

زیادہ عزیز ہو۔“ وہ اب اس کا چہرہ چومنے کی کوشش

”اور شمرہ تو مذاق کرتی ہے اور پاپا کی نیچرل سی

ہے۔ ورنہ وہ بھی تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ اور تم

سب کچھ کر سکتی ہو، کیونکہ تم شمرہ سے زیادہ لائق ہو۔“

ان کے کہنے پر زہرہ نے بھری ہوئی آنکھوں

سے آنسو دیکھا۔

”میری جان کبھی ایسا نہ کہنا کہ کوئی تمہیں پیار نہیں کرتا۔ تم میری جان ہو۔“ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

”تمہیں آئندہ جو بھی پراہلم ہو، تم مجھے بتاؤ۔“

”ماما! اذ آل ویز ہیر فور یو۔“

”میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں زہرہ۔“ وہ اسے سینے

سے لگائے سرگوشی کے انداز میں بار بار ہراری تھیں۔

☆☆☆

وہ بالوں میں برش کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا دھیان کہیں اور ہی تھا اور وقار گاہے بگاہے ان پر نظر ڈال رہے تھے۔ آخر ان سے رہا نہ گیا تو وہ بول پڑے۔

”کیا بات ہے؟ دیکھ رہا ہوں کل سے پریشان ہو۔“

”ہاں!“ وہ گہرا سانس لے کر بولیں۔ ”زہرہ

کی وجہ سے وہ بہت حساس ہے اور اسی عادت کی وجہ

سے بہت سی پراہلمز ہو رہی ہیں۔ وہ دن بہ دن

کمپلیکس کا شکار ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات ہے، وہ شروع سے ایسی ہے۔“

صفورہ تیزی سے پٹیں۔ ”وہ شروع سے ایسی

نہیں، اسے یوں بنانے والے ہم ہیں، جب بچے کو

گھر سے توجہ اور محبت نہ ملے تو وہ کمپلیکس ہو جاتا

ہے۔ کبھی تم نے اس سے پیار سے بات کی جیسے تم

شمرہ سے کرتے ہو، اس کے لاڈ اٹھائے، جیسے تم شمرہ

کے اٹھاتے ہو، تمہارا یہ سلوک دیکھ کر شمرہ بھی اس

سے وہی سلوک کرتی ہے۔ اپنے ہی گھر میں وہ خود کو

غیر محسوس کرتی ہے۔“

وقار نے بے زاری سے انہیں دیکھا۔ ”اب

میں ہر وقت تو اسے ساتھ چکا کر نہیں رکھ سکتا۔“

”اس کی دل جوئی تو کر سکتے ہو؟“

وقار نے ٹی وی آف کر کے ریوٹ رکھ دیا۔

”تم یہ بات کیوں نہیں مان لیتیں صفورہ کہ زہرہ شمرہ

سے بہت مختلف ہے۔ شمرہ ہر لحاظ سے اس سے بہتر

ہے اور زہرہ ہر لحاظ سے پیچھے۔“



”اور تم یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ اس کے ذمہ دار ہم ہیں، وہ ہماری سگی بیٹی ہے۔ وقار اسے ہماری توجہ اور محبت کی ضرورت ہے۔“ آخر میں ان کا لہجہ التجائیہ ہو گیا تھا۔

”تو میں نے کب منع کیا ہے تم دو اسے توجہ اور محبت۔ میرے پاس اتنا غم نہیں کہ میں ہر وقت اسے سمجھاؤں پڑھاؤں۔ میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہے کوئی ننھی بچی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ لیٹ گئے تھے جس کا مطلب موضوع ختم ہوا اور صفورہ کو ان کی بے بسی دیکھ کر ایک بار پھر اپنے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔ وہ اندر آئیں تو سامنے ہی عفر اور زہرہ بیٹھی تھیں۔ زہرہ کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جسے دیکھتے ہی ان کی ساری چٹکن اڑن چھو ہو گئی تھی۔

”السلام علیکم آئی!“ ان پر نظر پڑتے ہی عفر کھڑی ہو گئی۔

”وعلیکم السلام بیٹا! کیسی؟“ ہو؟ وہ اسے پیار کرتی ہوئی ان دونوں کے قریب بیٹھ گئیں۔

”میں ٹھیک ہوں آئی، ممانے زہرہ کے لیے سوپ بنایا تھا۔ سوچا دے بھی آؤں اور مل بھی آؤں۔“

”اوہ! امیر کی طرف سے اپنی ماما کو بہت شکریہ کہنا۔“ وہ ممنونیت سے بولیں۔

”میں اس سے یہ پوچھ رہی تھی اسکول کب آئے گی؟“

”کل سے ان شاء اللہ آئے گی۔“ جواب صفورہ نے دیا تھا۔

ان کو زہرہ کے گریڈز کی فکر تھی گریڈز اچھے ہوں گے تو اچھے کالج میں داخل ملے گا۔ وہ کسی میل میچر کو گھر نہیں بلانا چاہتی تھیں کیونکہ گھر میں کوئی نہیں ہوتا تھا اور وہ لیٹ آئی تھیں۔

آئی! وہ سوچ میں تھیں جب عفر کی آواز پر چونکیں۔

”میں زہرہ سے کہہ رہی تھی۔ ہمارے گھر آ جایا کرو۔ ہم کیا کن اسٹڈی کر لیا کریں گے۔ مجھے جب کچھ میں نہیں آتا میں فخر بھائی یا فاطمہ بھائی

سے سمجھ لیتی ہوں۔“

”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے جیسے بے ساختہ خوش ہو کر بولیں۔ وہ اتنے سال سے ان لوگوں کو جانتی تھیں۔ ان کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ ہٹا تھا۔

☆☆☆

یہ کوئی تیسری دفعہ تھا جب وہ ایک سوال کو رہا تھا اور اب کی بار اس کا لہجہ اونچا ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں پیانی اکٹھا ہو گیا تھا۔ سامنے کی کتاب دھندلائی تھی۔ عفر نے چور نظروں سے زہرہ کا سرخ چہرہ دیکھا۔

”یہاں دماغ نام کی کوئی چیز ہے یا خالی نادر جیسا سر لے کر گھوم رہی ہو؟ فاطمہ نے چین کی ٹوکی اس کے سر پر ماری تو آنسو گالوں سے پھسلے ہوئے کتاب پر جا گرے۔

”پلو!“ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا۔ ”ایک تو بات پر رو نے بیٹھ جاتی ہو۔“

اب کے اس نے سر کا رخ اپنی بہن کی طرف کیا جو خاموشی سے اپنا سوال حل کر رہی تھی۔ ”آئی نے خود مجھ سے بات نہ کی ہوئی تو میں تمہاری ذمہ داری نہ لیتا۔“

”اور اگر ماما نے مجھے مجبور نہ کیا ہوتا تو میں مگر کبھی یوں آپ کے سامنے نہ بیٹھی ہوتی۔ وہ یہ جملہ صرف دل میں کہہ سکی۔ اسے کچھ عرصہ پہلے اندازہ تھا کہ وہ اچھی خاصی لائق اسٹوڈنٹ ہے۔ تین ماہ پہلے فخر بھائی نے پڑھانا شروع کیا تھا۔ امتحان نزدیک ہے اور فخر بھائی کو اپنے ضروری کام کی وجہ سے اسلام آباد جانا پڑ گیا تھا تو مجبوراً یہ ڈیوٹی فاطمہ کو دینی پڑ گئی تھی۔

خود تیرا ان تھی۔ فاطمہ جب بھی کچھ سمجھتا تھا اس کے سر کے اوپر سے گزرتا جاتا جگہ وہی سوال عفر کو سمجھ نہ آتا۔ اب وہ روئی نہ تو کیا کرتی اور پرستے اسے فاطمہ سے سخت خوف آتا تھا۔ جب وہ گھر ہوتا تو عفر کے لاکہ بلانے پر بھی وہ نہیں جاتی تھی اور اگر اتفاقاً سامنا ہوتا تو یوں بھاگتی جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو اور جب

عفر کی جگہ فاطمہ نے سنبھالی تو اس نے اگلے دن جانے کی بات آنا کا کافی کی لیکن ممانے کوئی رعایت دینے کو نہیں تھیں۔ انہیں ہر حال میں اس کے اچھے مارکس سے تھے۔ سو مجبوراً اس کو فاطمہ کو جھیلنا پڑا تھا۔

اور کچھ ایسا ہی خیال فاطمہ کا تھا۔ اس نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ زہرہ کو نہیں پڑھا سکتا، لیکن فخر کی چینی دوست ماما اور بابا کے بعد جب صفورہ نے زہرہ کی ریکویسٹ کی تو انکار نہیں کر سکا۔ لیکن ایک ہی دن میں اس لڑکی نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔

بہن کی طرح بیٹھی رہتی، کچھ کہتو روٹا شروع اب بھی تیسری دفعہ سمجھاتے ہوئے اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔

”کیا ہو گیا فاطمہ کیوں چلا رہے ہو؟“ تب ہی ماما گھر گئی ہوئی اندر داخل ہوئیں۔ زہرہ پر نظر پڑے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔

”ایں ڈانٹ رہے ہو اسے؟“

”ڈانٹوں نہیں تو کیا اسے میڈل پہناؤں! ایک ہی بات کو تین دفعہ ہر آنے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔“ اس کی غصیلی نظریں اب بھی اس پر جمی تھیں۔

”تو سمجھانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم اتنی زور سے ڈانٹو۔ بیٹا کیا سمجھ نہیں آ رہا؟“ اس نے انگلی کتاب پر رکھی تو فاطمہ کا دل جا پا۔ ایک پھڑپھڑا لگے۔

”یہ جو آپ کو بتا رہی ہے۔ کیا مجھے نہیں بتا سکتی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا، پتھر بن کر بیٹھی ہے۔ آپ کو کیا لگتا ہے میرا وقت فالتو ہے، جو میں اس پر ضائع کر رہا ہوں۔“

اس کے غصیلے انداز پر زہرہ ایک دم صائمہ کے ساتھ لگ کر رونے لگی۔ صائمہ کی ملامت بھری نظروں نے فاطمہ کو اور اشتعال دلایا تھا۔

”یہ دیکھ رہی ہیں آپ..... بجائے اپنی غلطی ماننے کے یوں رو رہی ہے۔ جیسے میں نے کوئی پہاڑ اس کے سر پر پھونڈ دیا ہو۔ مجھے تو آپ معاف رہیں اور اتنا دیکھتے تم نظر مت آنا۔“

آخر میں اس کے وارن کرنے کا انداز زہرہ کہہ کر روئی گئی۔

”بیٹا تم پریشان مت ہو، کل پر سون فخر آ رہا ہے، وہ پڑھائے گا تم دونوں کو اگر اس کے پاس ٹائم نہ ہو تو میں ٹیوٹر کا بندوبست کر دوں گی، چلو شاباش۔“

انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے اور کھڑی ہو گئیں۔

اگلے دن فخر کے آنے پر اس نے شکر ادا کیا تھا۔ پیپرز کے شروع ہوتے ہی اس نے دن رات ایک کر دیئے لیکن جب پیپرز ختم ہوئے تو اس کی جھکن پر اس کی خوشی حاوی تھی۔ کیونکہ پیپرز اس کی امید سے زیادہ اچھے ہوئے تھے اور اس سے زیادہ خوشی صفورہ کو تھی۔ وہ دل سے عفر کی فیملی کی احسان مند تھیں جنہوں نے ان کی بیٹی کا مستقبل تاریک ہونے نہیں دیا تھا۔

پیپرز کے بعد جب فراغت ملی تو وہ یوریت کا شکار ہونے لگی تھی۔

وہ صبح سے نی وی دیکھ دیکھ کر بور ہو گئی تھی۔ سب اپنے اپنے کاموں پر تھے زینت آج بھی نہیں آئی تھی آج چچن میں سب کچھ تھا، لیکن افسوس اسے کچھ بنانا نہیں آتا تھا۔ وہ بریڈ پر جام لگا کر وہی کھانے لگی تب ہی فون کی بیل پر اس نے بے زاری سے فون اٹھایا۔

کیا کر رہی ہو؟ دوسری طرف عفر کی چپکتی آواز سنائی دی۔

”کرنا کیا ہے، کھیاں مار رہی ہوں۔“ اس کی بات سن کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”کھیاں ہی ماری ہیں تو یہاں آ جاؤ، اکٹھے مارتے ہیں۔“

”اوکے..... ماما کو فون کر کے بتا دوں تو آتی ہوں۔“ وہ گیٹ لاک کر کے عفر کے گیٹ کی طرف بڑھی، لیکن گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس کے قدم جم گئے، وہاں تو میلہ لگا تھا۔ اس کا دل چاہا فوراً مڑ جائے، لیکن افسوس سب کی ہی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔ سب سے پہلے عفر اس کی طرف بڑھی تو مجبوراً اسے اندر کی طرف بڑھنا پڑا۔



”تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ وہ اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔  
 ”بیتا نہیں سکتی تھیں، تمہاری خالہ آئی ہوئی ہیں۔“ وہ ناراضی سے اس کا چہرہ دیکھ کر بولی۔  
 ”کیا فرق پڑتا ہے مہمان وہ ہیں تم نہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے آگے لے آئی۔ وہ سلام کر کے بیٹھ گئی۔

”بیٹا! چائے ڈالو تمہارے لیے۔“  
 ”نہیں آئی!“ صائبر نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
 ”تمہیں تو چائے بہت پسند ہے۔“  
 ”مما! اس نے کھانا نہیں کھایا۔ پہلے کھائے گی، پھر چائے پئے گی۔“  
 ”کیوں بیٹا، گھر کھانا نہیں کھایا؟ بظاہر بڑی میٹھی زبان میں یہ سوال عفرہ کی خالہ بتول نے کیا تھا۔  
 ”نہیں آئی! آج زینت آئی نہیں آئیں تو کچھ پکائیں۔“

”تو لڑکی تم خود کچھ بنا لیتیں۔“  
 ”وہ آئی! مجھے کچھ اتنا خاص بنانا نہیں آتا۔“ وہ سر جھکا کر شرمندگی سے بولی۔

عفرہ نے اشارے سے ماں کو خالہ کو روکنے کو کہا۔  
 ”اتنی بڑی ہوئی ہو۔ ابھی تک کچھ بنانا نہیں آتا۔ تمہاری ماں نے بھی تمہیں ٹوکا نہیں، خیر وہ گھر میں ہوتی کب ہے۔ ورنگ دو من ہے۔ بڑی رہتی ہوگی، لیکن لڑکی تمہیں خود کچھ کھانا چاہیے۔ اب میری طیبہ اور ردا کو دیکھو ماشاء اللہ سارے کھانے پکالتی ہیں۔ یہ ردا تو تمہارے جتنی بے پراسار گھر سنبھال لیتی ہے۔“  
 ”خالہ! یہ آپ کون سی باتیں لے رہی ہیں۔ ابھی وہ چھوٹی ہے۔ پڑھائی بھی ٹھٹ ہے۔ اس دوران کاموں کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔“ عفرہ نے اس کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھ کر خالہ کی تقریر کو لگام دینے کی کوشش کی۔  
 ”بھئی جو بھی کہہ لو میرا تو خیال ہے لڑکی جتنا بھی پڑھ لے کرنا تو اسے ہانڈی چولہا ہے۔“

”خالہ.....!“

”فخر! یہ چائے کا کپ ذرا دینا۔“ صائبر نے فخر کو مزید بولنے سے روکا تھا۔  
 ”چلو زہرہ اٹھو اندر چلتے ہیں۔“ عفرہ نے ناراضی سے خالہ کو دیکھ کر زہرہ سے کہا تھا۔  
 ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ وہ جوشیل کر کے لیے سر جھکائے چل رہی تھی۔ عفرہ کے کہنے پر بے ساختہ سر اٹھایا۔ سامنے ردا اور فاطمہ کھڑے تھے۔ اس کے چہرے کو دونوں نے چونک کر دیکھا تھا۔ ردا دوبارہ سر جھکا کر آگے نکل گئی اور کچن میں آ کر شیلٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

”ایک یہ ردا جب بھی آئی ہے فاطمہ بھائی سے چپک جاتی ہے۔ لاڈو کی فرمائشیں ختم نہیں ہوتیں۔ اتنی عجیب ہے اور ممما سے بہو بنانے کا سوچے ہوئے ہیں اور بھائی.....“ اس نے افسوس سے سر جھکا کر پھر اس پر نظر پڑنے ہی چونک گئی۔

”زہرہ! تمہیں کیا ہوا۔ اور رو کیوں رہی ہو؟“ ایک دم اس کے قریب آئی۔ ”مجھے پتا ہے تمہیں خالہ کی باتیں بری لگی ہیں نا۔“

تب ہی فخر اندر آیا تھا۔ زہرہ نے تیزی سے اپنے آنسو صاف کئے۔ ”مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ اندر ہی سین دیکھنے کو ملے گا۔ کم آن یا زہرہ! تم تو خالہ کی عادت کا گنور کیا کرو اور جہاں تک کھانا بنانے کی بات ہے تو یہ ایک آرٹ ہے جو کھانا اچھی بات ہے۔ عفرہ! ممما سے کچھ نہ کہہ سکتی رہتی ہے، تم بھی ممما کے پاس آ جایا کرو اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل برا نہیں کرتے لڑکے! فخر نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ مسکرا دی۔ ”اور وہ تم نے سنا نہیں شوہر کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔“ فخر نے شرارتی انداز پر جہاں وہ شرارتی تھی۔ وہیں عفرہ ہلکھلا کر ہنسی گئی۔ وہ باہر نکلا تو فاطمہ کچن کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔

”بڑے زبیدہ آیا والے مشورے دیے جا رہے تھے۔“

”تم کیا یہاں کھڑے میری جاسوسی کر رہے تھے۔“

”بھئی میری نیت تو نہیں تھی، لیکن جس طرح تم اٹھ کر بھاگے تو میرا شک کرنا پڑا تھا۔“  
 ”کیوں نہیں کرو تمہارا کوئی چکر ہے؟“ فاطمہ نے اس کے قریب ہو کر پوچھا۔  
 ”فاطمہ! مجھ سے مار کھاؤ گے۔ وہ بہت چھوٹی ہے۔ عفرہ کی طرح..... بچپن سے آئی ہے، انیت ہے اس سے اور تم فضول انسان، ہر ایک کو اپنی طرح مزیل نہ سمجھ لیا کرو۔“

”انیت کیوں ہے؟“ وہ اب بھی باز نہ آیا۔  
 ”سر نہ کھاؤ اور جا کر اپنی ہونے والی مگتیر کو برکراؤ۔“

”مشورے کا شکریہ اور آپ کی بھی ہونے والی مگتیر آپ کی آمد کی منتظر ہیں اور آپ کی ہونے والی ساس یعنی ہماری خالہ صاحبہ کو آپ کا یوں اٹھ کر اس چھوٹی لڑکی کے پیچھے جانا ایک آنکھ نہیں بھایا۔“

”ان کی ناراضی کی تم پر داکرو۔ میرا مستقبل میں ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ اب فخر کافی سنجیدگی سے بولا۔  
 ”کیا مطلب.....!“ فاطمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا، جبکہ فاطمہ کتنی دیر وہیں کھڑا سوچ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔  
 ”آئی کیا بنا رہی ہیں۔“ وہ تیزی سے کچن میں داخل ہوئی۔  
 ”بے بی چکن گوشتی بنا رہی ہوں، کیونکہ شمرہ اور وقار صاحب کو من پسند نہیں۔“ وہ ہنسیا بھونکتے ہوئے بولیں۔

”آئی! کیا آپ مجھے سکھا سکتی ہیں؟“ زینت نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔  
 ”بے بی! آپ کو کیا ضرورت ہے، جب میں ہوں۔“  
 ”نہیں آئی! لڑکیوں کو سب کام آئے چاہئیں۔“ وہ بڑی سمجھداری سے بولی تو زینت مسکرا دی۔

پھر اس کی روز کی روٹین بن گئی جو گھر میں بننا وہ نوٹ بک میں نوٹ کرتی جاتی اور اب وہ خود پکانے لگی تھی۔ آج اس نے یون لیس چکن بنایا تھا اور بڑے اہتمام سے ڈانکنگ ٹیبل سجایا۔ شمرہ کو اندر آتے دیکھ

کر اس نے بے اختیار خوشی سے اسے آواز دی تھی۔  
 ”آئی! یہاں آئیں۔“  
 ”کیا ہے زہرہ!“ وہ وہیں کھڑی بے زاری سے بولی۔  
 ”آئی میں نے نئی ڈش بنائی ہے، آپ کھا کر بتائیں کسی نئی ہے۔“  
 ”ریش! انہیں کس نے مشورہ دیا ہے یہ اگلے سیدھے کام کرنے کا، جب زینت آئی ہیں اور مجھے نہیں کھانا۔ یہ عجیب و غریب کھانا۔ اب کے اس نے قریب آ کر ڈش میں بچے یون لیس چکن کو دیکھ کر کہا۔  
 ”زینت آئی میرے لیے ایک دو سینڈویچ تیار کر کے میرے کمرے میں دے جائیں۔“  
 زہرہ نے ہونٹ چپا کر آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا۔ پاس کھڑی زینت کو بے اختیار اس پر ترس آیا جو صبح سے پکان ہو رہی تھی۔  
 ”آئی! کیا یہ اچھا نہیں بنا۔“ وہ بڑی بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”نہیں بیٹا! میں نے پکھا تھا۔ بہت مزے کا تھا۔ مجھے تو یہ بنانا بھی نہیں آتا۔ میں تو حیران ہوں بے بی نے یہ ڈش کہاں سے سیکھی۔“ انہوں نے اس کا دل خوش کرنے کی کوشش کی، لیکن جب اپنے دل دکھا دیں تو غیروں کی باتیں مزہم کا کام نہیں کر سکتیں۔  
 ”آئی! کھانا اٹھالیں۔“ وہ بڑی دل گرفتگی سے بولی۔  
 ”بے بی تم تو کچھ کھالو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“  
 ”نہیں آئی! مجھے بھوک نہیں۔“ زینت نے بڑے افسوس سے اسے جاتے دیکھا۔  
 وہ لاؤنچ میں پہنچی ہی تھی کہ فون بج اٹھا، آنے والا فون عفرہ کا تھا۔  
 ”ہائے!“ اس کی ہیلو کے جواب میں عفرہ کی چپکتی آواز سنائی دی۔  
 ”کیسا بنا، پھر آج کا کھانا؟“  
 ”چائیں۔“ اس کے پوچھنے پر وہ رونی آواز میں بولی۔

کر اس نے بے اختیار خوشی سے اسے آواز دی تھی۔  
 ”آئی! یہاں آئیں۔“  
 ”کیا ہے زہرہ!“ وہ وہیں کھڑی بے زاری سے بولی۔  
 ”آئی میں نے نئی ڈش بنائی ہے، آپ کھا کر بتائیں کسی نئی ہے۔“  
 ”ریش! انہیں کس نے مشورہ دیا ہے یہ اگلے سیدھے کام کرنے کا، جب زینت آئی ہیں اور مجھے نہیں کھانا۔ یہ عجیب و غریب کھانا۔ اب کے اس نے قریب آ کر ڈش میں بچے یون لیس چکن کو دیکھ کر کہا۔  
 ”زینت آئی میرے لیے ایک دو سینڈویچ تیار کر کے میرے کمرے میں دے جائیں۔“  
 زہرہ نے ہونٹ چپا کر آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکا۔ پاس کھڑی زینت کو بے اختیار اس پر ترس آیا جو صبح سے پکان ہو رہی تھی۔  
 ”آئی! کیا یہ اچھا نہیں بنا۔“ وہ بڑی بے چارگی سے پوچھ رہی تھی۔  
 ”نہیں بیٹا! میں نے پکھا تھا۔ بہت مزے کا تھا۔ مجھے تو یہ بنانا بھی نہیں آتا۔ میں تو حیران ہوں بے بی نے یہ ڈش کہاں سے سیکھی۔“ انہوں نے اس کا دل خوش کرنے کی کوشش کی، لیکن جب اپنے دل دکھا دیں تو غیروں کی باتیں مزہم کا کام نہیں کر سکتیں۔  
 ”آئی! کھانا اٹھالیں۔“ وہ بڑی دل گرفتگی سے بولی۔  
 ”بے بی تم تو کچھ کھالو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“  
 ”نہیں آئی! مجھے بھوک نہیں۔“ زینت نے بڑے افسوس سے اسے جاتے دیکھا۔  
 وہ لاؤنچ میں پہنچی ہی تھی کہ فون بج اٹھا، آنے والا فون عفرہ کا تھا۔  
 ”ہائے!“ اس کی ہیلو کے جواب میں عفرہ کی چپکتی آواز سنائی دی۔  
 ”کیسا بنا، پھر آج کا کھانا؟“  
 ”چائیں۔“ اس کے پوچھنے پر وہ رونی آواز میں بولی۔



”کیوں... کیا ہوا؟“

”میں صبح سے بیمار ہی ہوں، لیکن کسی نے چکھا تک نہیں۔“

”او...“ عفر ا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اچھا تو اس میں اداس ہونے والی کیا بات ہے۔ میں ہوں نا۔ میں نے ابھی کھانا نہیں کھایا، ڈونگا اٹھاؤ اور سیدھی میری طرف آ جاؤ۔“

”میں آ رہی ہوں۔“ وہ ایک دم خوش ہو کر بولی۔

”زینت آئی! میں عفر ا کی طرف جا رہی ہوں۔“ وہ ڈونگا اٹھا کر جاتے ہوئے بولی۔ زینت نے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم سست پڑ گئے۔ وہاں عفر ا کی خالہ اپنی دو عدد بیٹیوں کے ساتھ موجود تھیں۔

”آؤ بیٹا! رک کیوں گئیں؟“ عفر ا کے پاپا کے کہنے پر اس نے جھک کر ڈونگا ٹیبل پر رکھا اور خود سائیڈ والے ٹیبل پر بجرم کی طرح بیٹھ گئی۔ سب تھوڑا تھوڑا چپن پیٹ میں ڈال رہے تھے اور اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”واہ بھی زہرہ! کمال کر دیا تم نے، بیٹا بہت مزے کا بنایا ہے۔“ اس نے جھکے سے نظریں اٹھا کر سفیان انگلی کو دیکھا۔

”واقعی زہرہ بہت اچھا بنایا ہے۔“ صائمہ آئی نے بھی اسے داد دی تھی۔

”بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔“ تب ہی باہر سے بولتا ہوا فخر اور اس کے پیچھے فاطمہ اندر داخل ہوا تھا۔

”زہرہ چپن بنا کر لائی ہے۔“

”اچھا بھئی، پھر تو ضرور کھانا چاہیے۔“ فخر کے کہنے پر اس کی خالہ، صبا اور روانے ایک دم اسے دیکھا تھا، جبکہ فاطمہ وی لگا کر بیٹھ گیا، جہاں فٹ بال میچ آ رہا تھا۔

”تم بھی لونا فاطمہ!“ فخر نے کھاتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مجھے بھوک نہیں۔“

”پراگھی تو تم مجھے کہہ رہے تھے بڑی بھوک لگی

ہے۔“ فخر کے کہنے پر زہرہ کی غیر ارادی نظر فاطمہ کی طرف اٹھی تھی اور اسی وقت اس نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔ صرف ایک لمبے لگا تھا زہرہ نے نظریں جھکا کر نہیں دیکھا لیکن اگلا لمحہ حیران کن تھا۔ فاطمہ کھڑے ٹیبل پر آیا، وہ اب پیٹ میں چپن نکال رہا تھا۔ زہرہ کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا تھا، اس نے اس کی طرف دیکھا ہی کیوں اور اگر دیکھتا تو وہ اس کی نظروں کا شکوہ کیسے پڑھ گیا اور اگر پڑھتا تو دور کیوں کیا۔ وہ اپنی سوچوں میں اتنی گم تھی کہ فخر کے گھٹنا بلانے پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

”پاپا بلا رہے ہیں۔“

”جی انگل!“ وہ ایک دم ندوب ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”یہ تمہارا انعام۔“ انہوں نے والٹ سے ہزار کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”نہیں انگل!“ وہ بوکھلا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

”انعام کو منع نہیں کرتے بیٹا اور پھر اتنا اچھا کھانا بنانے پر انعام تو بنتا ہے۔ عفر ا کو بھی ایسے ہی دیتا ہوں اور تم میرے لیے بالکل عفر ا کی طرح ہو۔“

لاؤنج سے باہر نکلتے ہی کب سے رکے اس کے آنسو باہر آ گئے، پیچھے آئی عفر ا ایک دم حیران رہ گئی۔

”کیا ہوا زہرہ! کیا پاپا کی کوئی بات تمہیں بری لگی۔“

”نہیں عفر ا! تم نہیں جانتیں، یہ ایک نوٹ میرے لیے کتنا قیمتی ہے۔ پہلی بار کسی نے مجھے سراہا ہے۔“ کہتے ہوئے اس کی آواز بھر ا گئی تھی۔

عفر ا بیسے ساتھ لگا لیا۔ تم بالکل پاگل ہو زہرہ! اتنا چھوٹا سا تمہارا دل ہے میں تمہاری دوست بہن سب کچھ ہوں۔ میرے سب گھر والے تم سے بہت پیار کرتے ہیں یہ تم بھی جانتی ہو۔“ اس نے الگ ہو کر پوچھا تو وہ مسکرا کر سیدھی ہوئی تو نظر نیچے کھڑے فاطمہ پر پڑی تو وہ تیزی سے اللہ حافظ ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”زینت اب یہ کس نے بنایا؟“ پاپا لک چپن کے ساتھ رکھی ڈش میں موجود بون لیس چپن دیکھ کر

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا، کیونکہ وہ جانتی تھیں۔ زینت ایسے کھانے نہیں بنا سکتی۔

”یہ بی بی نے بنایا ہے اور یہ سلا دیکھیں، کتنا پیارا ہے اور یہ سالن کھا کر دیکھیں۔ کتنے مزے کا ہے۔“

”واقعی!“ وہ تو حیرت کے مارے کچھ بول ہی نہیں سکیں۔

”پر ہوا، آج اتنی خوشی سے بچی ٹیبل تیار کر کے بیٹھی تھی، نشترہ نے کھایا، بلکہ جھڑک دیا اور تمام کو وقار بھائی نے بھی منع کر دیا۔ بچی کا دل برا ہو گیا۔ وہ تو بھلا ہوسانے والوں کا۔ عفر ا نے بلالیا۔ وہاں سے آئی تو خوش تھی۔“

صفورہ کا مسکراتا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ زہرہ کو بلا لائیں۔“ کہہ کر انہوں نے ڈھیر سارا چپن اپنی پیٹ میں ڈالا۔

”آپ نے بلایا ماما؟“

”جی میری جان، یہ سب میری گزریا نے بنایا ہے۔“ انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے سامنے کیا۔

”جی ماما!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”اتنا مزے کا، مجھے تو یقین نہیں آ رہا، بلکہ اتنی خوشی ہو رہی ہے، بتا نہیں سکتی۔“ انہوں نے نوالہ منہ میں لیتے ہوئے چٹخارہ لیا۔ اب کی بار زہرہ کے چہرے کے تاثرات مختلف تھے۔

”آپ کو اچھا لگا ماما!“

”بہت اچھا میری جان۔“ ان کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم نے خود میٹ نہیں کیا۔“

”نہیں۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”آئی پاپا کسی نے بھی میرا کھانا میٹ نہیں کیا۔“

”تو کیا ہوا، ماما تو کھارتی ہیں نا۔“ صفورہ نے نوالہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالا۔ اب وہ ایک نوالہ اپنے اور دوسرا اس کے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ اور وہ صفورہ کو سارے دن کی روداد سنا رہی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے سن رہی تھیں۔

”میرے بچے کو یہ شوق پیدا کیسے ہوا؟“

انہوں نے کھانا اس وقت ختم کیا جب انہیں یقین ہو گیا کہ زہرہ کا پیٹ بھر چکا ہے۔

”ماما میں فری تھی نا اور عفر ا کو کوکنگ کا شوق ہے، تو اس کے ساتھ میں بھی کیسے لگی اور۔“ پھر وہ بات کرتے کرتے رگ گئی، تو صفورہ چونکیں۔

”اور کیا بیٹا؟“ انہوں نے زنی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ پھیرا۔

”عفر ا کی خالہ بہت عجیب ہیں، جب انہیں پتا چلا کہ مجھے کھانا بنانا نہیں آتا تو انہوں نے آپ کے متعلق بہت فضول باتیں کیں۔ مجھے بالکل اچھی نہیں لگیں۔“

صفورہ نے نہیں پوچھا، وہ کیا باتیں تھیں۔

”ہوں“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”زینت میرے لیے چائے لے آتا۔“ وہ اسے بازو کے گھیرے میں لے کر لاؤنج میں آ گئیں۔

”ماما آج انگل سفیان نے مجھے ایک ہزار روپے دیے انعام، یہ دیکھیں۔“ وہ اب بھی ایک ہزار کا نوٹ جیب میں رکھے بیٹھی تھی۔

صفورہ نے غور سے اس کے چہرے کی خوشی دیکھی۔ ”ماما! پاپا نے بھی یوں مجھے پیار نہیں کیا اور نہ ہی گفت دیا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اداس ہو گیا تھا۔

”زہرہ بیٹا! میں نے اس دن بھی آپ سے کہا تھا۔ ماما میں نا، آپ کو کچھ بھی چاہیے۔ ماما سے کہو۔“

آپ کی ہر بات میں پوری کروی کی۔

وہ اس کا سر چومتے ہوئے بولیں۔ انہیں وقار پر غصہ آ رہا تھا۔ ایک انسان اپنی ہی اولاد میں اتنا فرق کیسے کر سکتا ہے۔

”تمہیں کچھ چاہیے زہرہ، تمہارا رزلٹ آؤٹ ہونے والا ہے اور مجھے یقین ہے رزلٹ بہت اچھا ہوگا، میں نے تمہارے لیے گفت سوچا ہے، لیکن اب گفت تمہاری مرضی کا ہوگا۔“

”رنگی ماما!“ اس کی آنکھیں چپکنے لگیں اور اگر وہ مہنگا ہوتا تو۔“

”تو بھی۔“ وہ مسکرا کر بولیں۔ وہ جلدی سے



لیپ ٹاپ لے آئی۔ وہ اب انہیں اسکرین دکھا رہی تھی۔ جہاں ایک خوب صورت اور نفیس پینڈنٹ بنا تھا، جس کے آخر میں ایک موتی لٹک رہا تھا۔  
 ”ماما! مجھے یہ بہت پسند ہے۔“  
 ”تو میری بیٹی کو یہ ہی ملے گا۔“  
 ”ماما!“ وہ پہلے حیران ہوئی اور پھر ایک دم ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

اس کا رزلٹ آؤٹ ہوا، جو اس کی امید سے بھی زیادہ اچھا تھا۔ اس کے نمبر عفرائے بھی زیادہ تھے، لیکن عفرائے خود سے زیادہ اس کی کامیابی پر خوش تھی۔ اب بے صبری سے شام کا انتظار تھا۔ جب ماما آئیں، لیکن وہ اس کی توقع کے برعکس اس کے فون کے آدھے گھنٹے بعد ہی گھر میں تھیں۔ آتے ہی انہوں نے گلے لگا کر اسے بے تحاشا پیار کیا تھا، لیکن اسے سب سے زیادہ خوشی تب ہوئی جب وقار نے بھی اسے گلے لگا کر پیار کیا۔ پاس کھڑی ٹمرہ کو محبت کا یہ مظاہرہ کچھ بھایا نہیں تھا۔  
 ”کیا ہو گیا ہے پاپا! آپ لوگ تو ایسے خوش ہو رہے ہیں، جیسے اس نے پورے پنجاب میں ٹاپ کیا ہو۔ ٹاپ تو ہر سال میں کرتی ہوں، پر ماما کا ایسا جوش میری دفعہ تو دیکھنے کو نہیں ملتا۔“  
 ”جی ہاں! تم تو میری پرس ہوں، پر زہرہ نے بھی اسے گریڈ لے کر کمال کر دیا ہے۔ زینت! وہ مٹھائی لاؤ جو میں خاص اپنی بیٹی کی پسند کی لائی ہوں۔“  
 ”جی ہاں! ابھی لائی۔“ زینت فوراً مڑی تھی۔  
 ”دیکھو تمہارا گفٹ بھی آ گیا ہے۔“ صفورہ کے کہنے پر مکرانی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔  
 ”او بیوٹی فل ماما! یہ تو بالکل ویسا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے موتی کو چھوا۔  
 ”دکھاؤ۔“ اس کا اشتیاق دیکھ کر ٹمرہ بھی اٹھی۔  
 ”ماما! آپ نے بھی مجھے تو ایسا گفٹ نہیں دیا۔“ اس نے پینڈنٹ کو دیکھنے کے بعد سنجیدہ نظروں سے ماما کو دیکھا۔

”تم نے اپنی کامیابی پر جو مانگا، میں نے دو دیا، اب جو ہرہ نے مانگا وہ اسے ملے گا۔“  
 حسد کے مارے ٹمرہ کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اب مجھے پسند آ گیا ہے۔ یہ میں لوں گی۔ آپ زہرہ کو اس کے بدلے کچھ اور دے دیں۔“  
 وہ ایک دم ڈبا بند کرتے ہوئے بولی اور پینڈنٹ پر کچی زہرہ کی نظریں ایک پل کو ساکت ہوئیں۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا، جو ابھی ہوئی نظروں سے ٹمرہ کو دیکھ رہی تھیں۔  
 ”اگر یہ کوئی مذاق ہے ٹمرہ تو بہت فضول ہے۔“  
 ”میں سیریس ہوں۔“  
 ”یہ مجھے دو ٹمرہ!“ اب کے صفورہ سختی سے بولیں۔  
 ”پاپا! ماما سے کہیں نا، زہرہ کو دوسرا لا دیں۔“  
 ”مجھے یہ بہت اچھا لگا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ زہرہ کی خوشی میں بھگت ڈال چکی تھی۔ زہرہ بالکل ساکت اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔  
 ”بالکل نہیں۔ یہ زہرہ کا ہے۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ سے ڈبالیٹا چاہا تو اس نے بازو پیچھے کی طرف موڑ لیا۔  
 ”پاپا!“ ٹمرہ روہانسی ہو کر وقار سے لگ گئی۔  
 ”چھوڑو صفورہ! اسے پسند آیا ہے تو اسے دے دو۔“ انہوں نے ٹمرہ کو بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا۔  
 ”نہیں، تم بھی حد کرتے ہو وقار جو جس کا ہے اس کو ہی ملنا چاہیے، کیا کبھی زہرہ نے ٹمرہ کی چیز کے لیے یوں ضد کی ہے۔ وہ بھی کسی چیز کی ڈیمانڈ کرتی ہے اور تب ہی اس کو وہ چیز پسند آ جاتی ہے، لیکن اب نہیں۔“ انہوں نے زبردستی وہ ڈبالیٹا اس کے ہاتھ سے چھینا۔  
 ”مجھے پتا ہے۔ آپ کو زہرہ سے محبت ہے، کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے آپ میری سوتیلی ماں ہیں، اگر پاپا کا پیار نہ ہوتا تو میں بھی آپ کے ساتھ نہ رہتی۔“ کہنے کے ساتھ اس نے ٹیبل پر پڑی کرٹل کی کٹی ٹیس چیزوں کو توڑ ڈالا تھا۔

”ٹمرہ! حد میں رہو۔“ اب کے صفورہ حلقی کے بل چلائیں۔  
 ”ٹمرہ!“ وقار نے بھی سختی سے اس کا نام کیا۔ زہرہ تو جیسے ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ مٹھائی کی پلیٹ تھا سے زینت بھی حیران پریشان تھی۔  
 ”تم میری بہن نہیں دشمن ہو۔ تم ہو کیا، ڈر پوک کا پیکسڈ..... جس سے کوئی پیار نہیں کرتا۔“ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن صفورہ کا ٹیپٹر اسے جب کروا گیا تھا۔ اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا، جس کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔  
 ”صفورہ!“ اب کی بار وقار غصے میں آگے بڑھے۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی، میری بیٹی کو ہاتھ لگانے کی، کیا غلط کہا اس نے کیا زہرہ کا ٹمرہ ہے کوئی مقابلہ ہے؟ میری بیٹی اس قابل ہے، سب اسے پسند کرتے ہیں۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں، چلو ٹمرہ!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گئے۔ صفورہ وہیں سر تمام کر بیٹھ گئی تھیں۔  
 ٹمرہ نے بھوک ہڑتال کر دی تھی، لیکن صفورہ نے کوئی پروا نہیں کی اور رات کو صفورہ اور وقار کے درمیان ایک بڑا جھگڑا ہوا تھا، جس کی وجہ یقیناً وہ تھی، ان کے لڑنے کی آوازیں اس کے کمرے تک صاف آرہی تھیں اور وہ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزاری تھی۔ صبح صفورہ کے بینک جاتے ہی وہ ٹمرہ کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کوئی مودی دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے منہ موڑ لیا۔  
 ”آپنی! یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ یہ آپ کا ہے۔“  
 ”مجھے کوئی ضرورت نہیں، تم رکھو اپنی بھیک اپنے پاس۔“  
 ”آئی پلیز سوری اور یہ رکھ لیں۔“ وہ اس کی منت کر رہی تھی۔  
 اور کچھ آنا کافی کرنے کے بعد اس نے بہت احسان کرتے ہوئے وہ پینڈنٹ کھ لیا تھا اور جب صفورہ کو پتا چلا تو انہوں نے غصے سے اسے ہی ڈانٹ

دیا۔ وہ سر جھکے سستی رہی۔ انہیں اس پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔  
 ☆☆☆  
 کالج میں ایڈمیشن سے پہلے صفورہ نے اسے ویسا لاکٹ بنوا دیا تھا، لیکن وہ اب بھی ٹمرہ سے ناراض تھیں، مگر اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ ٹمرہ اور پاپا چاہتے تھے وہ ٹمرہ کے کالج میں ایڈمیشن لے، لیکن اس نے انکار کر دیا، کیونکہ اب وہ خود کو سمجھنا چاہتی تھی۔ منوانا چاہتی تھی، وہ اور عفرائے ہی کالج میں تھے تو کالج لائف بہت اچھی گزر رہی تھی۔  
 اس دن فرسٹ ایئر کے فائنل سپر زکی رول نمبر سب لینے جانا تھا۔ وہ جوں ہی تیار ہو کر گیٹ سے باہر نکلی۔ باہر کھڑے فاطمہ کو دیکھ کر اس کے قدم وہیں رک سے گئے تھے۔ کل تک تو اسے یہ ہی پتا تھا۔ فخر بھائی انہیں لے کر جانے والے تھے۔  
 ”زہرہ۔“ اسے بت بنا دیکھ کر عفرائے آواز دینی پڑی تھی۔ تو مجبوراً وہ من من کے قدم اٹھائی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔  
 سفر کے دوران وہ بالکل خاموش تھی۔ جبکہ عفرائے مسلسل فاطمہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ کالج آتے ہی کب سے رکا ہوا سانس اس نے بحال کیا تھا۔  
 ”تمہیں کیا ہوا، اتنا مت کیوں سو جا ہوا ہے؟“  
 ”فخر بھائی کیوں نہیں آئے۔“ عفرائے سوال کے جواب میں اس نے تیزی سے پوچھا۔  
 ”تو تم اس لیے چپ کھیں؟“ عفرائے پہلے حیران ہوئی اور پھر اسسوس سے سر ہلایا۔ ”اتنا پینڈنٹ اور پیارا میرا بھائی ہے، چھپیں آخر پر الیم کیا ہے ان سے۔“  
 ”پینڈنٹ اور پیارے وہ تمہارے لیے ہوں گے۔ میرے لیے تو وہ خوف ناک سے جن ہیں، جن کی بڑی بڑی آنکھوں سے ہر وقت انگارے اور منہ سے لاوا نکلتا رہتا ہے۔“ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔  
 ”اب ایسا بھی کچھ نہیں، بس تھوڑے سے غصے والے ہیں۔“



”ہاں بس تھوڑے سے ہی۔“ زہرہ منہ میڑھا کر کے بولی۔ جب وہ دونوں باہر آئیں تو وہ ان کے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔

”کتنی دیر لگا دی۔ بتایا تو تھا مجھے اپنے کام سے بھی نکلتا ہے۔“ وہ اسے انگوڑ کر کے عفرائے گہرہ ہاتھا۔ ”سوری بھائی ارش ہی بہت تھا اور آپ نے جس آدمی کا حوالہ دیا تھا وہ ملائی نہیں۔“ وہ اب بھی پیچھے خاموشی سے ان دونوں بہن بھائی کی باتیں سن رہی تھی۔

”بھائی بہت بھوک لگی ہے۔“ وہ جتنی جلدی اس سفر سے نجات چاہتی تھی، عفرائے گھرے اتنے بڑھتے جا رہے تھے، فاطمہ نے کچھ کے بغیر گاڑی ایک برگر کارنر پر روکی۔ وہ تین برگر اور کوک کا آرڈر دے کر واپس آگیا، جبکہ وہ غصے سے عفرائے گھر رہی تھی۔

لڑکاتین پلیٹ لے کر آیا۔ فاطمہ نے ایک عفرائے کو تھمائی، دوسری اپنی گود میں رکھی اور تیسری پیچھے کی طرف گھمائی، جب کہ وہ یوں ہی بتی بجتی رہی۔ ”اب پکڑو گی بھی یا نہیں۔“ وہ سرگھا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”مجھے بھوک نہیں۔“ وہ منمناتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”تو پہلے بولنا تھا۔ حرام کے پیسے نہیں ہیں میرے کھانا ہے تو کھاؤ، ورنہ باہر پھینک دو۔“

اس نے تیزی سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی، مبادا وہ اس کے سر پر ہی نہ چھوڑ دے۔ ویسے بھی اسے شروع سے ہی اس کا سر بہت پسند تھا۔ کوئی بھی چیز مارنے کے لیے چاہے وہ پھنڈا ہو، پن ہو یا انگلی، وہ چھوٹے چھوٹے نوالے کیے لگی۔

مشکل سے اس نے آدھا برگر کھایا ہوگا اور وہ خود بہن، بھائی فارغ بھی ہو گئے تھے۔ فاطمہ نے ہارن دے کر اس لڑکے کو بل لانے کو کہا۔ جب وہ پلیٹ واپس کر رہے تھے، اس نے ڈر کے مارے پوری کی پوری کوک اسے تھادی۔ فاطمہ نے تھر تھری نظروں سے اسے گھورا۔ جواباً وہ گھبرا کر سر جھکا گئی۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں آج سارا دن تھکا دینے والا تھا۔ اس کا ارادہ بھی تان کے سونے کا تھا، لیکن لاؤنچ کا دروازہ کھولتے ہی شہرہ کی جتنی چٹکھٹائی آواز نے اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے تختی سے آنکھیں میچ کر انہیں کھولا اور گہرا سانس لے کر اندر داخل ہوئی۔

”جو اولاد اپنے ماں، باپ کا کہنا نہیں مانتی، ان کے تجربے کو جھٹلاتی ہے، وہ ہمیشہ ذلیل و خوار ہی ہوتی ہے۔“ صفورہ نے غصیل نظر میں شہرہ کے چہرے پر جھاتے ہوئے کہا۔

”اوپلیز..... بچپن سے یہ ڈائلاگ سنتی آرہی ہوں، مجھے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں صرف یہ جانتی ہوں، زندگی میری ہے، اسے کس طرح گزارنا ہے، یہ حق صرف میرا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو مجھ سے کیوں بات کر رہی ہو۔ جو تمہارا دل کرتا ہے کرو۔“

”تو آپ کا مطلب ہے آپ عدیل کی فیملی سے نہیں ملیں گی۔“

”بالکل ٹھیک سمجھی ہو تم۔“ شہرہ کتنی دیر غصے اور بے بسی سے صفورہ کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”بہت پچھتاؤں گی آپ۔“ اس کا انداز دھمکی لیے ہوئے تھا۔ دروازے میں کھڑی زہرہ نے گھبرا کر صفورہ کا چہرہ دیکھا، لیکن ان کا چہرہ بالکل ساٹھا تھا۔

وہ کتنی دیر وہیں کھڑی رہی، یہاں تک کہ صفورہ اور شہرہ دونوں اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ عفرائے فون سے کھلتی تھی۔ آج ان کی یونیورسٹی میں فنکشن تھا اور وہ اسے تیار ہونے کا کہہ رہی تھی۔ کل گھر میں جو بے مزگی ہوئی تھی اس کے بعد اس کا دل بہت خراب تھا۔ وہ اٹھ کر نیچے آگئی۔ اس کا ارادہ عفرائے منع کرنے کا تھا۔

”تم تیار نہیں ہوئیں۔“ اسے یوں آتا دیکھ کر صفورہ نے پوچھا۔

”ماما میرا دل نہیں چاہ رہا، سوچ رہی ہوں عفرائے

”کونج کروں۔“

”کیوں منع کرنا ہے یہ تمہارا یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ یہ دن دوبارہ بھی لوٹ کر واپس نہیں آتے، جتنا ہو سکے اسے انجوائے کرو اور مجھے یہ بھی پتا ہے تم کیوں منع کر رہی ہو، تم جس کی وجہ سے اپنا دل خراب کر رہی ہو، اس کی تو جوتی کو بھی پروا نہیں۔ سو اس کے لیے تمہیں اپنا دن خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ چلو جاؤ شاہاش، اچھی طرح تیار ہو کر آؤ۔ صفورہ کے چکارنے پر وہ گہرا سانس لے کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ تیار ہو کر نیچے اتری صفورہ، زینت کے ساتھ بات کر رہی تھیں، ان دونوں کی نظریں بے اختیار اس کی طرف اٹھیں اور پھر جیسے اس کے چہرے پر رک گئیں۔

”باجی یہ ہماری بے بی ہے۔“ زینت نے شرارتی انداز میں اسے دیکھا۔

”ہاں زینت یہ خوب صورت لڑکی ہماری زہرہ ہی ہے۔“ صفورہ کے چار کرنے پر وہ جھینپ کر سر جھکا گئی تھی۔ وہ پنگ فراک اور پاجامے میں کھلے بالوں اور ہلکے میک اپ کے ساتھ واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی عفرائے گیٹ کی طرف بڑھی اور لاؤنچ میں داخل ہوتے ہی اس نے بلند آواز میں سلام کیا تھا۔

”ارے واہ..... کیا بات ہے زہرہ آج تو بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ نیوی دیکھتی صائمہ نے بھی ستائشی انداز میں اسے دیکھا تھا۔

آئی عفرائے تیار ہے۔“ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد اس نے عفرائے کا پوچھا تھا۔

”جاؤ بیٹا، دیکھ لو اپنے کمرے میں ہے۔“ وہ تیزی سے عفرائے کمرے کی طرف بڑھی۔

”ارے زہرہ۔“

”اوپلیز عفرائے اب تم کچھ مت کہنا، جلدی کرو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ کہنے کے ساتھ وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے غور سے اپنا چہرہ دیکھا۔ ”ہلکی سی لپ اسٹک، آئی لائنز اور مسکارے

کے علاوہ کوئی شے اس کے منہ پر نہیں تھی، پھر سب کو وہ خوب صورت کیوں لگ رہی تھی۔

”میں منہ دھونے جا رہی ہوں۔“ آخر کار اس نے حتمی فیصلہ کیا۔

”بکومت پہلے ہی کوئی میک اپ نہیں کیا اور پر سے جو دو تین لائپس کھینچی ہیں انہیں بھی دھونے جا رہی ہو، تم یونیورسٹی فنکشن میں جا رہی ہو، کسی کے افسوس پر نہیں۔“ عفرائے اپنی ہلکے والی سینڈل کے اسٹریپ بند کرتے ہوئے بولی۔

”اور یہ لوتھوڑی لپ اسٹک ڈارک کر دو اور یہ پرفیوم بھی چھڑک لو ماسی بول۔“ یہ کہہ کر وہ خود واش روم میں گھس گئی۔ زہرہ نے ایک دفعہ لپ اسٹک کو دیکھا اور پھر سٹریپ میں ہلا کر واپس رکھ دی۔ ابھی اس نے پرفیوم کا ڈھکن کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے تیزی سے آئینے میں دیکھا اور اس میں جو عکس نظر آیا وہ حقیقت تھا یا الوٹون..... بہر حال اس کے ہاتھ سے پرفیوم کی بوتل چھٹ کر ماربل کے فرش پر گر کے چٹکا چور ہو گئی۔

”کیا ہوا۔“ آواز پر گھبرائی ہوئی عفراباہر نکلی۔

ٹوٹی ہوئی بوتل سے ہوتی ہوئی نظریں ساکت کھڑی زہرہ پر گئیں۔ جس کی آنکھیں یوں کھلی تھیں جیسے کوئی بھجوت دیکھ لیا ہو۔ فاطمہ ہنگامہ کرنا اندر داخل ہوا۔

”سوری مجھے پتا نہیں تھا تمہارے علاوہ بھی کمرے میں کوئی اور ہے۔“ وہ عفرائے کہہ رہا تھا۔

”اس اوکے بھائی، یہ زہرہ ہے، غیر تھوڑی ہے اور تم زہرہ والے کیوں گھور رہی ہو، بیچانا نہیں، یہ فاطمہ بھائی ہیں۔“ عفرائے کہنے پر اس نے تھوک نکل کر نظریں جھکا لیں۔

”بیچانا نہ ہوتا تو یہ حال نہ ہوتا۔“ فاطمہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ ابھی بھی ویسی ہی ہے، حواس بانشتہ، جبکہ تم تو بڑی تعریفیں کر رہی تھیں، زہرہ ایسی ہو گئی ہے، ویسی ہو گئی ہے، میں سمجھا پتا نہیں ان چار سالوں میں میرے پیچھے کون سا انقلاب آ گیا ہے۔ یہ



امپرور منٹ ہوئی ہے تمہاری زہرہ میں، تمہارا پر فیوم  
ہی توڑ دیا۔“ زہرہ نے بے ساختہ اپنے ہونٹ  
دانتوں تلے۔ دبا لیے تھے۔

”اس اوکے زہرہ۔“ اس کالال پڑتا چہرہ دیکھ  
کر عفراتی تیزی سے بولی۔

”بھائی آپ بھی نا آتے ہی شروع ہو گئے، چلو  
زہرہ دیر ہو رہی ہے۔“ عفرات کہہ کر تیزی سے باہر نکل  
گئی، جبکہ اس نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا،  
جہاں فاطمہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر کھڑا تھا۔

”نہیں جانا کیا۔“ اس کے یوں ہی کھڑے  
رہنے پر وہ ابرو اچکا کر پوچھنے لگا، تو وہ تیزی سے  
آگے بڑھی، لیکن دروازے کے قریب اسے رکنا پڑا،  
جہاں وہ جھپٹ کر کھڑا تھا، پتا نہیں وہ اسے اس طریقے  
سے کیوں تنگ کر رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس  
کا چہرہ دیکھا جہاں شرارت ہی شرارت بکھری تھی۔  
”فاطمہ بھائی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ہاں بولو۔“  
”راستہ دے دیں۔“

”بس یہی دیکھنا چاہتا تھا ان گزرے سالوں  
میں، کہیں کوئی تو نہیں ہو گئیں۔“ وہ مسکرا کر کہتا ہوا  
کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ یوں بھاگی جیسے رکی تو  
وہ اسے کھائی جائے گا۔ باہر عفرات غصے میں غی بجٹ  
میں لگی تھی۔

”میں نے کل فجر بھائی کو بتا دیا تھا، پھر وہ ایسا  
کیسے کر سکتے ہیں۔“ وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔

”بیٹا۔“ امیر جیسی آگئی تھی۔ فاطمہ لوگوں کو  
چھوڑ آئے گا۔“ وہ جو بمشکل سنبھلی تھی اسے پھر جھٹکا لگا۔  
”مما! بھائی رات کو تھکے ہوئے آئے ہیں۔“

”میں پلٹیں میں بیٹھ کر آیا ہوں عفرات، اسے دھکا  
دے کر نہیں لایا۔“ پیچھے سے فاطمہ کی آواز آئی، جسے سن  
کر اس کے سوا صائمہ اور عفرات دونوں ہنس پڑے تھے۔  
ایک بل کے لیے زہرہ کے دل میں آیا وہ صبح کر دے،  
لیکن اس سے عفرات کے ناراض ہونے کا خدشہ بھی تھا۔  
”ہاں بھئی، کہاں جانا ہے۔“ ڈرائیونگ سیٹ

پر بیٹھتے ہوئے فاطمہ نے پوچھا۔  
”بھائی! اتنے عرصے میں راستے بھول تو نہیں  
گئے۔“ مطلوبہ پتا بتا کر عفرات نے پوچھا تھا۔

”اب اتنی بھی کمزور یادداشت نہیں میری، کیا  
میں نے تمہاری دوست کو نہیں پہچان لیا، کہاں وہ  
اول جلول جلیہ اور کہاں یہ تیار۔“ وہ پھر سے اسے  
درمیان میں ٹھیک لایا تھا۔

”تم لوگوں کے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے،  
میں یہیں قریب میں ہوں۔ آتے ہی فون کروں گا،  
فوراً باہر آ جانا، میں ویٹ نہیں کروں گا۔“ وہ کہہ کر  
گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

”یہ آج بھائی کو کیا ہوا ہے۔“ عفرات نے خود  
کلائی کی تھی، جبکہ زہرہ نے گہرا سانس لے کر خود کو  
ریلیکس کیا تھا۔ اندر رنگ و بو کا ایک سیلاب برپا تھا۔  
ہر کوئی لگتا تھا جی جان لگا کر تیار ہوا تھا۔ لڑکیاں تو  
لڑکیاں لڑکے بھی کسی سے پیچھے نہیں تھیں۔ وہ دونوں  
اپنے گروپ کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

”تم کچھ لوگی۔“ زہرہ جو اس کی طرف دیکھ  
رہی تھی، عفرات کے پوچھنے پر اسے دیکھنے لگی۔  
”جو اپنے لیے لاؤ گی میرے لیے بھی لے  
آنا۔“ عفرات سر ہلا کر اٹھ گئی۔ وہ دوبارہ اس کی طرف  
متوجہ ہو گئی، جہاں ان کی کلاس کا نعیم اپنی سریلی  
آواز کا جادو نکھیر رہا تھا۔

”ہیلو زہرہ۔“ وہ جو گانوں کے بولوں میں  
پوری طرح گم تھی، مردانہ آواز پر چونک کر سیدھی  
ہوئی، فائل ایئر کا اسٹوڈنٹ زوہیب جو یونیورسٹی کا  
سب سے بریلیٹ اور ہینڈزم لڑکا کہلاتا تھا، اس کے  
سامنے کھڑا تھا۔ وہ حیرت کے مارے کچھ بول ہی  
نہیں سکی، جب کہ اس کی حیرت دیکھ کر اس کے  
چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔“ وہ اس کے  
سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا، تو اس  
نے بے ساختہ نظریں سامنے دوڑائیں، لیکن سامنے  
اتنے جھوم میں اسے عفرات کی نظر نہیں آئی۔

”مس زہرہ۔“ وہ دوبارہ اس سے اجازت  
مانگ رہا تھا۔ وہ اب اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔  
”جی بیٹھ جائیں۔“ اس نے خود کو نارل کرتے  
ہوئے کہا۔

”میرا نام زوہیب ہے، میں آپ کا سینئر  
ہوں، آپ نے شاید مجھے بھی اتنا نوٹس نہیں کیا ہوگا،  
لیکن میں پچھلے ایک سال سے صرف آپ کو ہی نوٹ  
کر رہا ہوں۔“ زہرہ کے لیے یہ بات کسی جھٹکے سے کم  
نہیں تھی۔

”میں جو بات آج آپ سے کرنے آیا ہوں،  
پچھلے ایک سال سے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی  
اور ہوتا تو شاید میں کب کا کہہ چکا ہوتا، لیکن آپ  
سب سے بہت مختلف ہیں اور میرے لیے بہت  
خاص بھی۔ آج ہمارا یونیورسٹی میں آخری دن ہے،  
اس کے بعد سب الگ الگ راستوں پر چلے جائیں  
گے، لیکن میں چاہتا ہوں ہمارے راستے ایک ہوں۔  
زہرہ بظاہر اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی، لیکن اس کی  
دھڑکن اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اپنی دھڑکن کی آواز اسے  
کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

”مجھے آپ بہت اچھی لگتی ہیں، میں آپ سے  
شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ کہنے کے ساتھ اس نے  
سامنے رکھے گلدان سے گلاب کی کٹی نکال کر اس کی  
طرف بڑھائی۔ اب کی بار زہرہ کا چہرہ لال پڑ گیا  
تھا۔ اس کی نظریں جھٹک کر اس کی پرٹھہر گئیں۔

”آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے پیئرٹس کو  
بھیجتا چاہتا ہوں۔“ زہرہ کی پٹکوں پر جیسے منوں بوجھ  
اتر آیا تھا۔ زوہیب کو اس کی جھکی پٹلیں، گلابی چہرہ اور  
البریکٹ کر رہا تھا۔

”زہرہ کیا تم یہ بھول قبول کر کے میرے سوال  
کا جواب دے سکتی ہو۔“ وہ جیسے اس کی مشکل سمجھ گیا  
تھا۔ زہرہ نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی کوتھاما  
اور نظریں اٹھا کر اس کے چہرے کو دیکھا، لیکن نظریں  
اس کے چہرے پر ٹھہرنے کے بجائے زوہیب کے  
بالکل پیچھے کھڑے فاطمہ پر جا کر رک گئیں۔ کیا تھا

اس کی آنکھوں اور چہرے پر، کلی اس کے ہاتھ سے  
چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑے بے ساختہ انداز میں کھڑی  
ہوئی تھی اور اس کے یوں کھڑے ہونے پر زوہیب  
بھی تیزی سے کھڑا ہوا۔

”تھیک یو۔“ تھیک یو دیری جی زہرہ۔“ اپنی  
خوشی میں اس نے زہرہ کے ہاتھ سے گری ملی اور اس  
کے ہوائیاں اڑاتے چہرے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔  
”میں کل ہی می، پاپا کو بھیجتا ہوں۔“ وہ نہیں  
جانتی تھی، وہ کیسے اس کا کھڑا اور پتا جانتا ہے، وہ بس  
خوف زدہ نظروں سے فاطمہ کے پیچھے ہوئے ہونٹوں  
کو دیکھ رہی تھی۔

”ارے بھائی، آپ اتنی جلدی آگئے۔“ تب  
ہی پیچھے سے دونوں ہاتھوں میں پلٹتے تھے عفرات ان  
دونوں کے پاس آئی تھی۔  
”گھر چلو۔“ وہ کہہ کر بڑا۔

”لیکن بھائی، ابھی تو فکشن شروع ہوا ہے۔“  
”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا۔“ وہ اتنے  
غصے سے بولا کہ عفرات کے ساتھ وہ بھی اپنی جگہ پر بل کر  
رہ گئی۔ وہ تیزی سے سڑ گیا تھا، جبکہ عفرات رو ہانسی ہو کر  
اسے دیکھنے لگی۔

”بھائی کو کیا ہوا ہے۔“ جب کہ وہ خود اس کے  
اتنے شدید رد عمل پر حیران تھی، وہ دونوں بھاگنے کے  
انداز میں اس کے پیچھے آئی تھیں۔ ان دونوں کے  
پیچھے ہی فاطمہ نے بڑے جارحانہ انداز میں گاڑی  
اشارت کی تھی۔ عفرات اس کے اتنے ناراض ہونے پر  
حیران تھی۔ حیران تو زہرہ بھی تھی، پروہ ڈر زیادہ رہی  
تھی۔ پتا نہیں اس نے کیا، کیا سنا تھا اور کیا، کیا سمجھا  
تھا اور اگر اس نے گھرتا دیا تو ایک نیا طوفان آ جائے  
گا۔ سارا راستہ اس نے ہاتھ مسلتے گزرا، اس کا خیال  
تھا فاطمہ اس سے کچھ تو کہے گا، لیکن جب وہ بغیر اسے  
دیکھے اور کہے اتر گیا تو وہ مطمئن ہونے کے بجائے  
اور پریشان ہو گئی۔

ساری رات اس نے اٹھتے بیٹھتے گزاری تھی،  
کبھی پر شوق نظروں سے دیکھتی آتھیں اس کے



چہرے پر مسکراہٹ لے آئیں، لیکن اگلے ہی پل ان پر غصے سے گھورتی نظریں حاوی ہو جاتیں، اسے صبح کا انتظار تھا، جب وہ عفرائے سب شیر کرے گی۔

☆☆☆

وہ کچن میں داخل ہوئی تو فاطمہ پہلے سے موجود تھا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا، جہاں صبح کے ساتھ نہ رہے تھے۔  
”السلام علیکم بھائی۔“  
”علیکم السلام!“

”آج آپ اتنی جلدی اٹھ گئے۔“

”ہاں آنکھ جلدی کھل گئی۔“ وہ جواب دے کر دوبارہ چائے پینے لگا۔ عفرائے بغور اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا اور پانی کا گلاس لے کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آپ کچھ پریشان ہیں بھائی۔“ فاطمہ نے نظریں اٹھا کر عفرائے کو دیکھا اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔  
”پریشان تو نہیں، پر کچھ سوچ رہا ہوں۔“ عفرائے نے ابرو اچکائے۔

”اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے اپنا مسئلہ شیر کر سکتے ہیں۔“ اب کی بار فاطمہ مسکرا دیا تھا۔  
”ویسے میرا مسئلہ بھی تم ہی کر سکتی ہو۔“  
”اچھا۔“ اب کی بار عفرائے کچھ پرجوش ہو کر آگے کوچکی۔

”تمہیں اپنی سہیلی کسی لگتی ہے۔“  
”زہرہ کی بات کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ الجھ کر پوچھنے لگی۔

”ظاہری بات ہے، ایک ہی تو تمہاری سہیلی ہے۔“  
”بھائی آپ کو پتا تو ہے، میری اگر کوئی بہن ہوتی تو بالکل زہرہ جیسی ہوتی۔“

”اتنی اچھی ہے کہ تم اسے دوست بہن کے علاوہ کوئی درجہ دے سکو۔“ اس نے کچھ الجھ کر فاطمہ کو دیکھا۔  
”میں بھی نہیں بھائی۔“

”اگر وہ تمہاری بھابھی بن جائے تو؟“  
”آپ کا مطلب ہے فخر بھائی۔“ وہ خوشی سے

بولی۔ فاطمہ نے ماتھے پر پل ڈال کر اسے دیکھا۔  
”بات میں کر رہا ہوں یا فخر؟“  
”آپ بھائی؟“ اب کی بار عفرائے حیرت کی شدت سے اتنا ہی کہہ سکی۔

”کیوں، مجھے کیا ہوا ہے؟“ اس کی اتنی حیرانی فاطمہ کو ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔  
”لیکن بھائی اب کو تو زہرہ بالکل پسند نہیں تھی۔“  
”یہ تم سے کس نے کہا؟“ وہ زہرہ لب مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”یہ کوئی کہنے والی بات ہے آپ کا اپنی بیوہ بتاتا ہے ہمارے گھر میں صرف آپ ہیں جو اس سے روڈ ہیں اور آپ کو دیکھ کر تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔“ فاطمہ کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔  
”سو جو اس کو ڈرانے میں کتنا محاذ آئے گا۔“

”بھائی۔“ وہ برامانتے ہوئے بولی۔ ”میری دوست اس قابل ہے کہ اس سے پیار کیا جائے نہ کہ اسے ڈرایا جائے۔“  
”اچھا۔“ وہ ابرو اچکا کر بولا۔

”یہ بتائیں آپ نے ماما، پاپا یا بھائی سے بات کی؟“  
”نہیں۔۔۔۔۔ پہلے تم سے کر رہا ہوں۔“

”لیکن بھائی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، آپ کو تو وہ بالکل پسند نہیں تھی، تو یہ اچانک بات شادی تک کیسے پہنچ گئی۔“ وہ ابھی تک وہیں اٹکی تھی۔  
”میں نے بھی کہا، وہ مجھے پسند نہیں۔“ وہ الٹا اسی سے سوال کرنے لگا۔

”ہاں یہ اور بات ہے کہ اچانک بات شادی تک پہنچ گئی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں شروع سے اس پر نظر رکھے بیٹھا تھا۔“

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے مسکرا کر فاطمہ کو دیکھا۔  
”اپنی دوست کی مرضی پوچھو۔“ وہ کپ خالی کر چکا تھا۔

”مرضی پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، میں کہوں

گی تو وہ نہ تھوڑی کرے گی۔“ فاطمہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

”بات یہاں تم سے شادی کرنے کی نہیں، مجھ سے شادی کرنے کی ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو۔“ عفرائے کا سر بے ساختہ نیچے میں ہلا۔  
”میں بچپن سے جانتی ہوں اسے اور دعوے سے کہہ سکتی ہوں وہ پسند وسند سے بہت دور ہے، وہ تو لڑکوں سے دس فٹ کے فاصلے پر ہی راستہ بدل لیتی ہے۔“ عفرائے کے لہجے میں یقین ہی یقین تھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ آپ سے ڈرتی ضرور ہے، لیکن میں اسے کنکوس کر لوں گی، کیونکہ اب مجھے لگ رہا ہے آپ کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی اور اچھا ہی نہیں لگ سکتا، پتا نہیں یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔“ آخر میں وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولی۔

”تمہیں بیٹا عقل عقل کی بات ہے۔“ فاطمہ اسے چراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔  
”اب میں سونے جا رہا ہوں۔“ وہ اٹھڑائی لیتے ہوئے بولا۔

”اور میرا کام جلدی ہو جانا چاہیے۔“  
”بڑی جلدی ہے، ابھی تو فخر بھائی کا گھر پہلے ہے۔“  
”تم میرا تو کام کرو، اس کا جب دل چاہے گا کرے لگا۔“

”اچھا بھائی کتنے بے صبرے ہو رہے ہیں، آج ہی چلی جاؤں گی۔“ اس کی ایک ہی رٹ سے چڑ کر وہ منہ پھلا کر بولی تو وہ مسکراتا ہوا بچپن سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

دروازہ کھلنے پر اس نے کھل پٹا کر دیکھا اور عفرائے کو دیکھ کر وہ جھٹ سے اٹھ بیٹھی تھی۔ ”خیریت تم اتنی صبح۔“

”گھڑی دیکھو محترمہ صبح کے گیارہ بج رہے ہیں اور میں تو صبح سات بجے ہی آنا چاہ رہی تھی، بڑی مشکل سے اس وقت تک خود کو روک رہا ہے۔“

”کیوں کیا ہوا، سب ٹھیک ہے۔“ پہلے وہ بچی اور پھر منتظر نظروں سے عفرائے کا چہرہ دیکھنے لگی۔

یقیناً فاطمہ نے عفرائے کو سب بتا دیا ہوگا۔  
”تم بڑی کھنی نکلیں ہو، اتنا کچھ ہو گیا اور تم نے مجھے خبر تک نہیں ہونے دی۔“ وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔  
”یقیناً کرو عفرائے اس میں میرا کوئی قصور نہیں، مجھے تو پتا ہی نہیں وہ پچھلے ایک سال سے مجھے فالو کر رہا ہے اور یوں اچانک مجھے پروپوز کر دے گا۔“  
”نہیں۔“ عفرائے حیران ہوئی۔ ”بھائی نے کل تمہیں پروپوز بھی کر دیا، یہ تو انہوں نے مجھے بتایا ہی نہیں۔“

”تم کس کی بات کر رہی ہو۔“ زہرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”فاطمہ بھائی کی اور کس کی۔“

”پاگل ہو گئی ہو، فاطمہ بھائی سچ میں کہاں سے آ گئے؟ میں تو زہرہ ہی صغریٰ کی بات کر رہی ہوں۔“

”کیا۔“ اب کی بار پوچھنے کی باری عفرائے کی تھی۔

”یہ زہرہ ہی صغریٰ میں کہاں سے آ گیا اور اس نے تمہیں کب پروپوز کیا؟ زہرہ نے ایک لمحہ رک کر سوچا اور پھر کل جو ہوا تھا سب عفرائے کو بتا دیا۔

”ہوں تب ہی میں سوچوں بھائی کو کیا ہوا ہے۔“

اس کی سرگوشی پر زہرہ کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔  
”کیا کہا فاطمہ بھائی نے۔“

”انہوں نے کہا تم سے پوچھ کر آؤں، وہ تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔“ اس کی بات سن کر زہرہ کو ایک دم سکتے سا ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ انہوں نے بات اس کی بائیس سالہ زندگی میں بھی نہیں ہونی تھی۔

”فاطمہ بھائی۔۔۔۔۔ نہیں۔“ زہرہ کا سر نفی میں ہلا۔  
”کیا نہیں؟“ عفرائے نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ ”تم میرے بھائی کو نہ کر رہی ہو، اس زہرہ صغریٰ کے لیے، مطلب جتنی ہو اس بات کا۔“

”عفرائے پلیز۔“ وہ بے بسی سے بولی۔  
”کیا پلیز؟ تم میرے سامنے میرے بھائی کو رنجش کر رہی ہو۔“

”عفرائے میں نے نہ کہا؟“ اس کا غصیلا انداز



دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی۔

”یعنی تم بھی بھائی کو پسند کرتی ہو۔“

”اب میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کہا۔ اب کے وہ نظریں چرا کر بولی۔

”اور ایسا کہنا بھی مت، ورنہ تم مجھے کھو دو گی۔“

”عفرا۔“ زہرہ بے ساختہ بولی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا، جسے دیکھ کر عفرا کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”مجھے پتا ہے، تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو۔“

”لیکن عفرا فاطر بھائی مجھ سے وہ کیوں ایسا کہہ

رہے ہیں، تم جانتی ہو کہ دو میرے ساتھ کیسے ہیں۔“

”ضروری نہیں جو دکھائی دے وہی سچ ہو پسند کرنے

کے لیے ایک لمحہ کافی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کہہ ان کی

زندگی میں آ گیا ہو، تم خوش نہیں، ہم اکٹھے رہیں گے۔“

”ہم تو اکٹھے رہیں گے، لیکن فاطر بھائی۔“

اس کی سوتلی وہیں الٹی تھی۔

”یاد رہے وہم کرنا چھوڑو اور آنتی سے پوچھو، پھر

مجھے فون پر بتا دو، میں ماما اور بابا کے ساتھ پہنچ جاؤں

گی، وہاں کا جوڑا لے کر۔“ کہنے کے ساتھ عفرا نے

اسے گلے لگا لیا۔ زہرہ کے ہونٹوں پر آنے والی

مسکراہٹ بے ساختہ تھی، لیکن اگلے ہی لمحے اس کی

مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

”عفرا! وہ ذہیب وہ بھی اپنے پیرئس کو لے

کر آج داخل آ جائے گا۔“

”تم منع کر دو گی تو وہ کیسے آئے گا۔“ زہرہ کچھ

بولنے لگی تھی، لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔ عفرا

کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر ابھی بیٹھی رہی۔ فاطر

اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، یہ بہت حیران کن تھا۔

”تو کیا وہ اس لیے اتنے غصے میں تھا کہ اس

نے ذہیب کو سب کہتے سن لیا تھا، تو کیا وہ اسے پسند

کرتا ہے، لیکن کب سے اسے تو بہت سوچنے پر بھی

کچھ ایسا یاد نہیں آ رہا جو خاص ہو۔ کتنے ہی سوال اس

کے گرد گھوم رہے تھے، جس کا جواب فاطر ہی دے

سکے کی طرف بڑھ رہی تھی، جب اندر شرہ کے

کمرے سے زور زور سے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ وہ

بے ساختہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”لیں آ گئی، آپ کی چیخنی لاڈلی جس کی مثالیں

دیتے، آپ نہیں بھلتی تھیں۔ مجھ پر تو آپ نے ہمیشہ

شک کیا، اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گی، اپنے

کانوں سے سن کر آرہی ہوں۔ عفرا، فاطر کے پیغام،

بلکہ نہیں محبت کے پیغام پہنچائی ہے۔ بتائیں کب سے

ان کی لوا ستوری چل رہی تھی۔ تب ہی تو یہ بھائی بھائی

دہاں جاتی ہے۔ ایک بات سن لیں، ماما اگر زہرہ کی

شادی فاطر کے ساتھ ہوئی تو میں ہمیشہ کے لیے یہ گھر

چھوڑ دوں گی، اگر مجھے میری پسند نہیں مل سکتی تو میں کسی

اور کو بھی خوش نہیں رہنے دوں گی۔“

”بس چپ کر جاؤ شرہ۔“ صفورہ دونوں

کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھیں۔

”تم بتاؤ زہرہ، کیا شرہ تھیک کہہ رہی ہے؟“

زہرہ نے ڈرتے ڈرتے ماں کا چہرہ دیکھا، جن کی

آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

”ماما ایسی کوئی بات نہیں۔“

”جھوٹ مت بولو، کیا عفرا نے تم سے نہیں کہا

کہ فاطر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے اور تم نے بھی منع

نہیں کیا۔“

”تو اس کا کیا مطلب ہے۔“

”زہرہ بولو کچھ۔“ صفورہ چیخ کر بولیں۔

”ماما۔۔۔۔۔۔ اب کے وہ رو پڑی تھی۔

”میرا یقین کر لیں میرا کوئی چکر نہیں۔“

”اگر کوئی بات نہیں تو عفرا نے تم سے ہی کیوں

بات کی، وہ ماما، پاپا سے بھی کر سکتی تھی۔“ شرہ پوری

طرح اسے اس گھیر چکی تھی اور وہ اتنی لپیٹو ہو گئی تھی

کہ اپنے حق میں کچھ کہہ ہی نہیں پا رہی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی زینت اندر

داخل ہوئی تھی۔

”باجی باہر کچھ مہمان آئے ہیں۔“

”کون ہے۔“ اس وقت وہ جو کوئی تھا صفورہ کو

اس کی مداخلت گراں گزری تھی۔

”وہ بے نی کا پوچھ رہے تھے۔“ زہرہ نے

چونک کر زینت کو دیکھا، جبکہ شرہ کے چہرے پر طنز یہ

مسکراہٹ آئی تھی۔

”لیں آپ کی لاڈلی کا ایک اور رشتہ آ گیا، اسے

کہتے ہیں چچی رتم۔“ اور وہاں ڈرائنگ روم میں

زہیب کے ساتھ اس کے پیرئس کو دیکھ کر زہرہ کو چکر

آگئے تھے۔ ایک ہی دن میں اتنے مسئلے اسے سمجھ میں

نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ ان لوگوں نے بڑی چاہت

سے زہرہ کا رشتہ مانگا تھا، جبکہ صفورہ بڑی سہولت سے

ان سے تھوڑا وقت مانگا تھا۔ لیکن ان کے جاتے ہی

صفورہ کا باری ایکشن زہرہ کے لیے بہت عجیب تھا۔

”کم از کم زہرہ تم سے مجھے یہ امید نہیں تھی، کیا

پوٹی ورٹی جانا اسی وجہ سے تھا اور عفرا کے گھریا بار

جانا فاطر کی وجہ سے تم جاتی ہو آج تمہاری وجہ سے

میں خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہی ہوں، کیا میں نے

تمہاری ایسی تربیت کی تھی۔“

”ماما پلیز ایسے مت بولیں میں نے آپ کی

تربیت پر کبھی کوئی حرف نہیں آنے دیا، نہ تو میں نے

فاطر بھائی کے بارے میں ایسا سوچا تھا اور نہ

زہیب کے بارے میں، میں تو خود ان دونوں

پر پوز لڑ رہی ہوں۔“

”تم یہ بات سن لو زہرہ پہلے شادی شرہ کی

ہو گی، پھر تمہاری۔“

”ماما۔۔۔۔۔۔ وہ بے بسی سے بولی تو انہوں نے ہاتھ

اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”جہاں اتنا کچھ تم کر چکی ہو، وہاں یہ بھی بتا دو

ان دونوں میں سے کس کو ہاں کہنی ہے۔“ زہرہ نے

سر جھکا دیا۔

”جس کو آپ کا دل کرتا ہے ماما مجھے کوئی فرق

نہیں پڑتا۔“ اس نے پہلے بھی کبھی بحث نہیں کی تھی،

اب بھی وہ ہار کر بولی۔

”ماما آپ پلیز کول ڈاؤن ہو جائیں، انسان

سے غلطی ہو جاتی ہے، اس بے چاری سے بھی

ہو گئی۔“ اس نے بڑی خاموش نظر شرہ پر ڈالی جو صفورہ

کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسا دیے رہی تھی۔ وہ اسی

خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔ وہ کتنی دیر پلکیں

جھپکے بغیر سامنے دیوار کو دیکھتی رہی۔ وہ رو رہی تھی۔

بچپن سے لے کر اب تک اس نے ہمیشہ کوشش کی

تھی، اس کی وجہ سے کبھی کسی کو تکلیف نہ ہو، خاص طور

پر اس کی ماں کو، اس نے ہمیشہ عام لڑکیوں سے ہٹ

گر خود کو رکھا۔ اپنے ارد گرد ہمیشہ اوپنی دیوار بنا کر رکھی،

جس کو کوئی پار نہ کر سکے، لیکن آج اس کی غلطی نہ ہوتے

ہوئے بھی وہ قصور وار نہیں لگتی تھی۔ دروازہ کھلنے پر اس

نے آس بھری نظریں اٹھائی تھیں، لیکن دروازے میں

کھڑی شرہ کو دیکھ کر مایوس ہو کر واپس جھکا لی۔

”مجھے پتا تھا، تم یوں ہی بیٹھی رو رہی ہو گی۔“

وہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”کلی ہو۔۔۔۔۔۔ دو دو پر پوز لڑ تمہارے انتظار

میں بیٹھے ہیں۔“ زہرہ کچھ کہے بغیر یوں ہی سر

جھکا کر بیٹھی رہی۔

”ماما بے چاری کو آج بہت افسوس ہوا تم پر، بڑی

مایوس بیٹھی تھیں۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ تمہاری کسی

میں انوالومنٹ نہیں ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنی پسند سے

ہاں کہہ سکتی ہیں۔ انہوں نے فاطر کا نام لیا تھا۔ وہ کہہ کر

رک گئی، جبکہ زہرہ اس کے اگلے جملے کی منتظر تھی۔

”لیکن میں نے منع کر دیا، کیونکہ مجھے پتا ہے، تم

اسے پسند نہیں کرتیں۔“ زہرہ نے اب کی بار نظریں

اٹھا کر شرہ کا چہرہ دیکھا، وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”میں نے تھیک کیا نا۔ وہ اب ذہیب کی ذیلی

کو ہاں کر دیں گی، پھر تمہاری منگنی ہو گی، مزہ آئے

گا۔“ شرہ نے کہہ کر خود اپنی اپنی بات کا مزہ لیا، وہ جو

اٹھ کر سامنے دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھی،

دوبارہ اس کے پاس آئی۔

”لیکن زہرہ تم عفرا کو نہ کیسے کرو گی۔“ اس

کے پاس اب بھی خاموشی تھی۔

”کچھ پوچھا ہے تم سے۔“ اب کے شرہ کے

تاثرات ایک دم سخت ہوئے تھے۔



”ماما خود ہی اسے منع کر دیں گی۔“ مجبوراً زہرہ کو جواب دینا پڑا تھا۔

”ماما نہیں، تم منع کر گئی جا کر، وہ بھی فاطر کے منہ پر۔“

”آئی۔“ وہ دکھ سے بہن کا چہرہ دکھنے لگی۔

”کیوں..... تمہیں دکھ ہوگا..... کہیں تمہارا واقعی اس کے ساتھ چکر تو نہیں تھا۔“

”خدا کے لیے آئی چپ کر جائیں۔“ وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی تھی۔

”اگر چکر نہیں تھا تو پھر رو کیوں رہی ہو، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، میں نے تمہاری جان چھڑا دی۔“

”آپ نے مجھے ماما کی نظروں میں گرا دیا، اب عفر اور فاطر بھائی کی نظروں میں بھی گرا نا چاہتی ہیں۔“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں، تم جا کر فاطر سے کہو کہ تم اسے سخت نا پسند کرتی ہو اور اس کو راضی کرو کہ وہ مجھ سے شادی کر لے۔“ زہرہ کو اپنی بہن کی ذہنی حالت پر شک گزرا تھا۔

”آپ کو بتا ہے، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”مجھے پتا ہے، میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم فاطر سے کہو کہ وہ مجھ سے شادی کرے اور تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے، کیونکہ زہیب بھی کسی سے کم نہیں، دوسرا وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔“

”میں ایسا کچھ نہیں کروں گی آئی۔“ اب کے وہ آنسو صاف کرتی ہوئی ٹھوس لہجے میں بولی۔

”اچھا.....“ ثمرہ کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا کہہ کر وہ ہاتھ روم میں گھس گئی۔ واپسی میں اس کے ہاتھ میں تیزاب کی بوتل تھی۔

”یہ دکھ رہی ہو، یہ کیا ہے ایسڈ۔“ ثمرہ نے بوتل کا ڈھکن کھول کر آگے کیا اور زہرہ بے اختیار پانچ قدم پیچھے ہٹی تھی۔ ثمرہ سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ بڑی اس کی طرف اچھال دیتی۔

”آئی پلیز..... کیا کر رہی ہیں، اسے بند کریں۔“ وہ دہشت زدہ ہو کر چلائی اور اسے اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ دروازے کی طرف دوڑی

تھی۔ اس سے پہلے وہ بینڈل گھمائی، ثمرہ اس کا بازو دبوچ چکی تھی۔

”آئی چھوڑیں مجھے۔“ وہ بے ساختہ چلائی تھی۔

”پہلے تم بتاؤ، تم اسے منع کر گئی نا۔“

”ہاں آئی میں منع کر دوں گی۔“ وہ بازو چھڑاتے ہوئے بولی۔

”اور تم اسے مناؤ گی بھی کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔“ اب کی بازو زہرہ کچھ بول نہیں سکی، تو ثمرہ نے بوتل کو پھر ہوا میں اُھرا۔

”آئی..... میں کروں گی پلیز اس بوتل کو بند کر دیں۔“ ثمرہ کے چہرے پر بڑی گہری مسکراہٹ آئی تھی۔

”کھاؤ میری قسم۔“

”آئی آپ کی قسم۔“ وہ روتے ہوئے بولی تو ثمرہ نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ وہ سکتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ ثمرہ ہنستے ہوئے باہر نکل گئی تھی، جبکہ زہرہ کے رونے کی رفتار میں اضافہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

زندگی میں پہلی بار تھا جب وہ اتنا سوچتے ہوئے عفر کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی اس نے گہرا سانس لے کر آنسوؤں کو ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ اسے فاطر سے بات کرنی تھی، لیکن کیسے یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس سے پہلے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی وہ اسے باہر آتا دکھائی دیا اور اس کے قریب آ کر رک گیا۔ اس کی نظریں اس کی آنکھوں پر پڑھیں جو سوچی ہوئی تھیں۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

”اچھا.....“ وہ حیران ہوا۔

”یقیناً کوئی خاص بات ہوگئی جو تمہیں کرنے کے لیے خود آنا پڑا۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

”میرا ایک پریوینڈل آیا ہے گھر میں، سب کو پسند ہے، اگلے ہفتے ماما نے انہیں ایجنٹ کے لیے بلایا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کتنی دیر اس کے جوتوں کو دیکھتی رہی، لیکن جب خاموشی طویل ہونے لگی تو اسے سر

اٹھانا پڑا۔ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، بلکہ لان میں گئے پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔

”میں بہت عام سی لڑکی ہوں، جو آپ جیسے شخص کے بالکل قائل نہیں، آپ کے لیے آپ جیسی لڑکی ہونی چاہیے، ہر لحاظ سے فریکٹ آپ ان سے شادی کر کے بہت خوش رہیں گے۔“ اتنا سب بولنے کے لیے جتنی ہمت اس کو درکار تھی، یہ صرف وہی جانتی تھی، لیکن مقابل کھڑا شخص کوئی رول ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسے برا بھلا کہے، کہہ دے کہ وہ واقعی اس لائق نہیں کہ اس سے شادی کی جائے۔

”اپنے گھر والوں میں تم بھی شامل ہو۔“ فاطر کی طرف سے سوال آیا تھا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے۔“ اب کہ وہ اتنی زور سے بولا کہ وہ اپنی جگہ پر پل سی گئی، اس کی ساری ہمت ڈگمگ گئی تھی۔ اس کا سر اثبات میں ہلاتھا۔

”یہ وہی ہے نا جو تم سے اظہار محبت کر رہا تھا۔“ وہ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے بالکل اس کے مقابل آ کر کھڑا ہو گیا۔ زہرہ بے ساختہ پیچھے ہٹی تھی۔

”آپ آئی سے شادی کر لیں۔“ وہ اب ہنسی بھری آواز میں بولی۔

”اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو، تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے یا کیا نہیں۔“ وہ کہہ کر تیزی سے باہر کی طرف بڑھا۔

”بات سنیں فاطر بھائی پلیز آئی سے۔“ وہ جو اس کے پیچھے بھاگی تھی، اس کے ایک دم رکنے سے بری طرح اس سے ٹکرائی تھی کہ درد کی شدت سے وہ بے ساختہ اپنا ماتھا سہلانے لگی۔

”آج تو تم نے مجھ سے یہ بات کر لی، آئندہ میں تمہارے منہ سے اپنا نام بھی نہیں سننا چاہتا اور آج کے بعد میرے سامنے مت آنا، ورنہ بہت برا ہوگا۔“ وہ چلا گیا تھا اور خود پر اس کا ضبط ختم ہو گیا تھا۔ اس نے روتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ لاؤنج کے دروازے میں عفر اکھڑی تھی۔ اس کی دوست اس کی ہم راز، وہ تو اس کی تکلیف سمجھ گئی نا، یہ ہی تصور

کر کے وہ اس کی طرف بڑھی، لیکن تین قدم کے فاصلے پر اس کے پیروں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا۔ عفر اندر چلی گئی تھی اور اپنے پیچھے اس نے زور سے دروازہ بند کیا تھا اور وہ بند دروازہ اسے کسی پتھر کی طرح اپنے وجود پر لگتا محسوس ہوا تھا۔

”تم نے فاطر سے بات کی تھی۔“ رات کو جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو ثمرہ بھی اس کے پیچھے آئی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا کر پلٹی تھی اور ہم کر ثمرہ کو دیکھا، جس کی نظریں اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”تو کیا کہا اس نے۔“ ثمرہ ایک دم تیزی سے اس کے قریب آئی۔ وہ..... وہ..... وہ ہکا کر بولی۔

”وہ کہہ رہے تھے وہ سوچ کر جواب دیں گے۔“ اس نے ثمرہ کے چہرے کو سخت ہوتے دیکھا تھا۔ زہرہ نے تھوکر نکل کر اپنے حلق کو تر کیا۔

”لیکن آئی..... میں نے فاطر بھائی سے کہا آپ بہت خوب صورت ہیں، بالکل ان کی ہی طرح پرفیکٹ ہیں، آپ دونوں ایک ساتھ اچھے لگیں گے۔“ وہ روانی کے ساتھ بولتی گئی تو ثمرہ کے کھنچے تاثرات معمول پر آئے۔

”ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

☆☆☆

”عفر! پلیز رکو..... صرف ایک بار میری بات سن لو۔“ آج ایک ہفتہ ہو گیا تھا اسے عفر کے پیچھے بھاگتے ہوئے۔

”عفر!۔“ اب کے اس نے تقریباً بھاگتے ہوئے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

”پلیز! میری بات سن لو۔“ اب کے زہرہ آنکھوں میں آنسو لیے جی انداز میں بولی۔

”ابھی بھی کچھ سننے کو باقی رہ گیا ہے، تم نے جو میرے بھائی کو سنایا وہ کافی نہیں تھا۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“

”کچھ تو اللہ کا خوف کھاؤ زہرہ، میں نے خود اپنے کانوں سے سنا جو تم نے کہا۔ میں نے تمہارے



یارے میں کیا دعوے کیے تھے اور تم نے کیا کیا، اگر تمہیں زوہیب ہی پسند تھا تو مجھے اس وقت کہہ دیتیں، اتنا تماشا بنوانے کی کیا ضرورت تھی، شکر ہے میں نے ممّا، پایا سے کوئی بات نہیں کی۔“

”پلیز عفراتم تو مجھ سے ناراض نہ ہو، میں مجبور ہوں۔“ اس کے آنسو گالوں پر بہہ رہے تھے، عفرات نے بے ساختہ نظر چرائی تھی۔

”کیا مجبوری ہے، کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی۔“ اب کے عفرات نے پورا رخ اس کی طرف موڑا تو وہ سر جھکا کر رہ گئی، عفرات نے ہنکارا بھرا۔

”کچھ ہوگا تو کہو گی نا۔ بہت ہی افسوس کی بات ہے، زہرہ بہت افسوس کی۔“ اس کی ساری باتیں زہرہ نے جل سے اپنی سنی کی تھیں۔

”کل میری مٹنی ہے، تم آؤ گی نا۔“ زہرہ نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا، عفرات کو تو جیسے کسی نے سوئی چھو دی تھی۔

”تمہیں شرم نہیں آ رہی زہرہ۔“ عفرات کا سارا چہرہ لال ہو گیا تھا۔

”عفرات تمہارے سو کوئی میرے قریب نہیں، تم یہ بات بھول کیوں نہیں جانتیں، ہم پہلے جیسے نہیں ہو سکتے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ عفرات نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔

”بہت فرق آ گیا ہے، صرف دو دن ہماری اٹھارہ سالہ دوستی پر بھاری ہیں، میرے بھائی نے زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی کا نام لیا تھا۔ میرا وہ بھائی جو مجھے بے حد پیارا ہے اور جو اس قابل ہے کہ ہر لڑکی اس جیسے شریک حیات کی تمنا کرتی ہے، تم نے اسے رنجیکٹ کیا، اس زوہیب کے لیے وہ میرے بھائی کے پاسنگ بھی نہیں، ایک بات یاد رکھنا زہرہ، ہمارا دل دکھا کر تم خوش نہیں رہو گی۔“

”عفرات۔“ زہرہ تڑپ کر بولی، لیکن وہ تیز تیز چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

”ماشاء اللہ میری بیٹی تو بہت خوب صورت

لگ رہی ہے، کسی کی نظر نہ لگے۔“ صفورہ نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”اور میرے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ اپنے پیچھے انہیں شمرہ کی جھپٹی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ سنجیدگی سے اس کی طرف پلٹیں، وہ بڑی عجیب نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”تم تو ہمیشہ ہی پیاری لگتی ہو“ انہوں نے پیار سے اس کا چہرہ دیکھا، جس کے چہرے کا تناؤ ایک دم کم ہوا تھا۔

”میں زہرہ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہوں نا، بیوٹی پارلر والی بھی کہہ رہی تھی اور ویسے بھی میں نے اس سے کہہ دیا تھا زہرہ کا میک اپ اور مجھے کم ہی ہونا چاہیے۔ وہ اپنی ہی دھن میں کہہ رہی تھی، اس نے غور ہی نہیں کیا، صفورہ کا چہرہ سخت ہو گیا ہے، لیکن زہرہ، ماں اور بہن دونوں پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس نے بے ساختہ ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں بولنے سے روکا تھا۔ صفورہ نے بمشکل خود کو کنٹرول کیا تھا اور ہونٹ سمجھ کے رہ گئیں۔

”ماما، عفرات آئی ہے۔“

”نہیں بیٹا، تم نے اس کو اطلاع کی تھی نا، زیادہ لوگوں کو انوائٹ نہیں کیا نا ہم نے، تو میں نے عفرات کی فہمی کو نہیں پایا۔“ وہ اتنی جلدی میں تھیں اس کی بات سے بغیر نکل گئی تھیں۔

”عفرات نہیں آئی اور نہ ہی فاطمہ نے مجھ سے کوئی بات کی، کہیں تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ تو نہیں بولا۔“

”آئی ہے مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ اکتا کر بولی۔

”بات سنو عفرات! اس نے ایک دم اسے پکڑ کے سیدھا کیا۔“ میں نے تمہاری مٹنی میں کوئی رکاوٹ اس لیے نہیں ڈالی، کیونکہ مجھے فاطمہ چاہیے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی۔“

”چلو زہرہ، شمرہ وہ لوگ آ گئے۔“ صفورہ تیزی سے اندر داخل ہوئی تھیں۔ اور شمرہ کی بات ادھوری رہ گئی۔

اسے جب زوہیب کے پھلوں میں لاکر بٹھایا گیا تو اس کا دل بالکل خاموش تھا۔ کوئی احساس چاہنے

کے باوجود وہ محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ انگلیوں پہنانے کی رسم شروع ہوئی تو زوہیب کے کزنز نے ایک شور برپا کر دیا تھا۔ شوخ چیلوں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ شمرہ سب میں پیش پیش تھی۔ زوہیب اسے انگلی پہنانا چاہتا تھا، لیکن اس کی والدہ نے زہرہ کو انگلی پہنانی تھی، جس پر پھر شور بلند ہوا تھا۔ زوہیب سب انجوائے کر رہا تھا۔ وہ کتنا خوش تھا۔ اس کا اندازہ اس کے قہقہوں سے ہو رہا تھا۔ وہ بھی خوش ہونا چاہتی تھی پر اس کا دل اداس تھا۔ اس کی دوست اس کی بچپن کی ساتھی اس سے ناراض تھی، وہ اس گھر کا حصہ بننے والی تھی، جس کی بچپن سے اس نے چاہ کی تھی۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ جس شخص نے اسے پروچوڑ کیا تھا وہ بھی اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا، لیکن اب کیا ہوا تھا۔ اس نے تو اس سے کوئی محبت بھرا جملہ نہیں بولا تھا۔ اس نے تو اس سے نہیں کہا تھا وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، نہ اس نے اس کی خوب صورتی کے قصیدے پڑھے تھے۔ وہ تو اس کو دھکا کر رہا تھا، پھر کیوں اپنے منگھڑتے کے ساتھ بیٹھ کر وہ اسے سوچ رہی تھی۔ اس نے تو کبھی بھی کسی چیز میں بے ایمانی نہیں کی تھی، پھر اب کیوں، وہ خود سے سوال کر رہی تھی، جب وقار نے زوہیب کو انگلی پہنادی، اس نے گہرا سانس لیا۔

”مجھے بے ایمانی نہیں کرنی۔“ اس نے خود کو باور کروایا تھا، کیرے کا فلیش اس کی آنکھوں میں پڑا تو اس نے بے ساختہ آنکھوں کو بند کیا تو بے اختیار دو آنسو اس کے گالوں پر بہہ نکلے۔

☆☆☆

”عفرات۔“ اپنے نام کی پکار پر وہ بے ساختہ متوجہ ہوئی تھی۔

”ہوں۔“ کہاں ہو یار، کب سے بلا رہی ہوں۔“ روانے حیرت سے اس کا کھویا ہوا انداز دیکھا۔

”ہاں کیا کہہ رہی تھیں۔“ اب کے کی وی دیکھتے فخر نے بھی چونک کر اسے دیکھا تھا۔

”کیا بات ہے عفرات، کوئی پریشانی ہے۔“ فخر

اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”نہیں تو بھائی۔“ اس نے ہنس کر اس سے زیادہ خود کو مطمئن کیا۔

”تو پھر کیا بات ہے، کتنے دنوں سے دیکھ رہا ہوں پریشان لگ رہی ہوں، نہ ٹھیک سے کھاتی ہو، دھیان بھی تمہارا نہیں اور ہوتا ہے، کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”نہیں بھائی، ایسی بات نہیں، ویسے ہی آج کل ٹھیک ہو رہے ہیں، بس ان کو لے کر۔“

”یہ بھی کوئی پریشانی والی بات ہے۔“ فخر نے جیسے مطمئن ہو کر کہا۔

”اور تم یہ بتاؤ تمہارے عزیزاں جان سہیلی کی آج مٹنی ہے، تمہیں تو وہاں ہونا چاہیے تھا، تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ وہی بات جس کو وہ صبح سے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ روانے کہہ کر جیسے اس کے کڑم کو کھڑچ ڈالا تھا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، تو میں نے پہلے ہی اس سے ایکسپوز کر لیا تھا۔“

”اچھا تو یہ نہ جانے کا صدمہ ہے۔“ روا کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”پتا ہے میں کیا سمجھی، اس صدی کا سب سے بڑا حادثہ ہو گیا، عفرات اور زہرہ کی لڑائی۔“ اس نے جیسے مزہ لیا تھا۔

”یہاں سب سے مس روا، یہ دونوں کبھی ناراض نہیں ہو سکتے۔“ فخر نے بڑے دعوے سے کہا تھا اور عفرات کا دل چاہہا تھا وہ اپنی آواز میں رد و ناشروع کر دے۔

”میں سونے جا رہی ہوں، سوری روا، میں تمہیں ناگم نہیں دے سکی۔“ اس نے اٹھتے ہوئے معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں، تم جاؤ، میں فخر بھائی کے ساتھ آؤں کریم کھانے جاؤں گی۔“

”چلو میری شامت فوراً آ جاتی ہے، وہ فاطمہ کدھر ہے۔“ جاتے جاتے اس نے سنا تو اسے خیال آیا، اس نے صبح سے فاطمہ کو نہیں دیکھا، فاطمہ



کے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ میسر کی طرف مڑ گئی تھی۔ دیوار کی اوٹ سے اس نے سامنے دیکھا۔ وہ گاڑی سے اتر رہی تھی اور اترتے ہوئے اس کی نظریں گیٹ سے ہوتی ہوئی میسر تک آئی تھیں اور پھر بائیں ہو کر وہ اندر مڑ گئی۔ وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ عفرانے بے ساختہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کا گلا گھونٹا تھا۔ کتنی دیر رونے کے بعد اس نے چہرے کو اچھی طرح صاف کیا اور فاطر کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ہلکی سی دستک کے بعد اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سامنے بیڈ پر لیٹا مسووی دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔

”ارے عفران سوئی نہیں تم، آؤ۔“ اب کے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور نظریں لی دی پر جمادیں۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔“ فاطر نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دیر ہونٹ چکاتی رہی، پھر بے ساختہ اس کے سینے میں سر چھپا کر رو پڑی۔ فاطر نے اسے روکا نہیں تھا۔ بس جگے سے اس کا سر چھپتا رہا۔ کافی دیر بعد جب اس کا رونا سکيوں میں بدلنے لگا تو اس نے خود سے الگ کیا اور پاس رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈال کر اس کے منہ سے لگایا۔

”کیا ہوا ہے، کیوں رو رہی ہو ایسے۔“ اس کے برعکس وہ بہت سکون میں تھا۔

”وہ آگئی ہے بھائی، اتنی خوب صورت لگ رہی ہے، وہ ہماری تھی وہ، کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے، مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا، آپ کچھ کرس بھائی، اسے لے آئیں، اس سے زبردستی نکاح کر لیں، پھر تو کوئی اسے نہیں چھین سکے گا نا۔“ اس کا ہاتھ چھپتا تھا فاطر کا ہاتھ رک گیا تھا۔

”پاگلوں جیسی باتیں مت کرو عفران۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

”میں ہوں پاگل، اس پر آپ کا حق ہے، میرا حق ہے، وہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔“ روتے ہوئے

اس کی ایک ہی رٹ تھی۔

”کیا آپ کو دکھ نہیں ہو رہا۔“ اس نے روتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

”اور تمہیں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ایک بات ہوئی پھر ختم ہو گئی۔ اس کو زندگی موت کا مسئلہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ بات کسی کو نہیں پتا، سوائے تمہارے

اور میرے، سب کے لیے سب پہلے جیسا ہے اور اگر میں تمہیں نہ بتاتا تو تم آج اپنی دوست کی مکتبی سے بڑی خوش خوشی لوٹ رہی ہو تیں، کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ میری وجہ سے تمہیں اپنی دوستی خراب کرنی چاہیے۔“

”آپ جھوٹ بول رہے ہیں بھائی! بالکل غلط، آپ اسے معاف کر سکتے ہیں، میں نہیں۔“ وہ ایک جھٹکے سے اس کے قریب سے اٹھی تھی اور اسی تیزی سے اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ فاطر نے گہرا سانس لیا اور لی وی آف کر دیا۔ پہلے کی نسبت اب اس کا چہرہ مضطرب تھا۔

”وہ اتنی خوب صورت لگ رہی تھی بھائی۔“ عفران کا ہلکا سا کان میں گونجا تھا۔ وہ بے ساختہ میسر پر کھڑا ہو گیا۔

”اس پر ہمارا حق تھا، وہ کسی اور کی کیسے ہو سکتی ہے۔“ اس کی نظریں سامنے میسر پر پڑ گئیں، جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور پھر وہاں روشنی پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ جتنی دیر لوگوں میں رہی اس نے پورے ضبط سے کام لیا تھا، لیکن گھر اترتے ہی عفران کا بند گیٹ اور سونا میسر دیکھ کر جیسے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ کسی کا بھی انتظار کیے بغیر اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی اور کمرے میں آتے ہی جیسے اس نے خود پر رکھا ضبط کھو دیا تھا۔ سب وہاں اس کی تعریف کر رہے تھے، لیکن اس کا ایک بار بھی خود کو دیکھنے کو دل نہیں چاہا تھا اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے میسر کے پاس کھڑی ہو گئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ لان کی روشنی میں

بعد میں فون کرے گا، تم بات کر لینا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر بولیں۔

”آپ بینک نہیں گئیں۔“

”نہیں آج موڈ نہیں تھا۔“

”ہوں۔“ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

”صائم بھابھی اور سفیان بھائی آئے تھے مبارک دینے۔“ اور زہرہ نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں اور ساتھ ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”اور عفران، وہ بھی آئی تھی۔“ اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

”نہیں بلکہ میں نے بھی عفران کو پوچھا تو انہوں نے بتایا اس کی طبیعت خراب ہے، میں یہ ہی کہنے آئی تھی، تم اس کا پتا کر آنا۔“ زہرہ نے گہرا سانس لے کر سر جھکا لیا۔

”اور ہاں۔“ وہ جیسے کچھ یاد آنے پر پائیں۔

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”ماما۔“ وہ ایک دم بولی۔

”میں کیا بات کروں گی۔“ اس کے چہرے پر گھبراہٹ صاف نظر آ رہی تھی۔

”آپ نے منع کر دینا تھا۔“ صفورہ نے پلٹ کر اس کا چہرہ دیکھا اور دوبارہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

”منع کیوں کرتی اور اس میں اتنا گھبرانے والی کیا بات ہے۔“

”ماما مجھے نہیں پتا، مجھے کیا بات کرنی چاہیے اور پھر اچھا نہیں لگتا۔“ وہ یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دیکھنے لگی۔

”کیا اچھا نہیں لگے گا، زہرہ میں تمہاری ماں تمہیں اجازت دے رہی ہوں، تمہیں کسی کے اچھایا برا لگنے کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔“ وہ اس کا کندھا چھپتا کر اٹھ گئیں، جبکہ وہ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

وہ بچے آئی تو شرہ بڑے خوش گوار موڈ میں کسی سے باتیں کرنے میں مشغول تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کچن کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“

”زہرہ کی طرف بڑھنے لگی، جب شرہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔“



”مجھے یاد کر رہی تھیں۔“ اس کی خاموشی پر وہ شرارت سے بولا۔

”جی۔“ وہ بے وحیانی میں بولی۔

”واقعی۔“ وہ جیسے حیران ہوا۔

”نہیں میرا مطلب ہے ویسے ہی وہ۔“ وہ ایک دم شرمندہ ہو کر صفائی دینے لگی۔

”کیا یار تھوڑی دیر تو خوش رہنے دیتیں؟“ اب کی بار وہ کچھ نہیں بولی۔

”لیکن میں تو ساری رات نہیں سویا، بار بار تمہارا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا، انتظار تھا جلدی صبح ہو تو تمہاری آواز ہی سن لوں، تم بھی کچھ بولو نا۔“

”میں کیا بولوں۔“

”کچھ نہیں بولنے کو۔“ وہ جیسے مایوس ہوا۔

”اچھا۔“ یہ بتاؤ مجھے کس کیا؟“ زہرہ کو اب الجھن ہونے لگی تھی۔

”بتاؤ۔“

”چاہ نہیں۔“ اس کی بے زاری کو دوسری طرف اس کے شرمیلے پن سے ملحوظ کیا گیا تھا۔

”تم کتنا شرماتی ہو، جبکہ شرمہ بھی تمہاری بہن ہے، اتنا فرتنگی بات کرتی ہے، مزہ آ جاتا ہے۔“

اب وہ اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی، گہری سانس لے کر وہ گئی۔

”تمہارے پاس موبائل ہے نا۔“

”جی۔۔۔۔۔ تو اپنا نمبر بتاؤ ڈائریکٹ فون کروں گا۔“ زہرہ نے پریشانی سے پاس بیٹھی شرمہ کو دیکھا۔

”میں ماما سے پوچھ لوں۔“

”کیا؟“ دوسری طرف وہ چنچا تھا۔

”تمہیں فون نمبر بتانے کے لیے ماما سے پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ اب ناراضی سے بولا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے گہرا سانس لیا۔

”ٹھیک ہے، آئی سے پوچھ کر مجھے میسج کر دینا اور میرا نمبر آنٹی کے پاس بھی ہے اور شرمہ کے پاس بھی۔“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا، زہرہ نے ہونٹ جھنجھکیے، یقیناً زوہیب کو اس کی باتیں اچھی

نہیں لگی تھیں۔

☆☆☆

صائمہ نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”آپ آج کہہ تو ٹھیک رہی ہیں، لیکن میرا ارادہ عفران کی پہلے کرنے کا ہے۔“ ان کی بات سن کر بتول نے جائے کاگ واپس میز پر رکھ دیا۔ تو میں نے کب منع کیا ہے، کرو اللہ عفران کے نصیب اچھے کرے۔ لیکن تم خود سوچو صبا اور ردا، عفران سے بڑی ہیں اور میں تو بچپن سے ہی تمہیں کہہ چکی تھی کہ میری دونوں بیٹیاں تمہارے گھر کی بہنیں کی۔ اب تو صبا بھی فارغ ہے اور ردا بھی تمہارے بہنوئی بار بار کہتے ہیں اپنی بہن سے بات کرو، نہیں تو ان کے نتیجے اور بھانجے بھی ہیں اور تم جانتی ہو میری آج تک اپنی جیٹھانی اور نندہ سے نہیں بنی۔ وہ ناگواری سے بولیں۔ اور سب سے اہم بات صبا اور ردا کا رجحان بھی تمہاری طرف ہی ہے۔“

”آپا میں کہہ تو رہی ہوں مجھے کوئی اعتراض نہیں، لیکن بچوں سے بھی پوچھنا ضروری ہے نا۔“

”کمال کی بات کہتی ہو صائمہ، کیا تم نے فخر اور فاطمہ سے بات نہیں کی کبھی۔“

”آپا بچہ کون تو بھی خاص طور پر ایسا ذکر نہیں ہوا، لیکن آپ فکر نہیں کریں میں فخر اور فاطمہ سے بات کرتی ہوں وہ مان جائیں گے۔“

”اور اگر وہ نہ مانے تو۔“ بتول ماتھے پر تل ڈال کر بولیں۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں آپا، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ صائمہ نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تو وہ خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

شام کو وہ سب ٹی وی لائونج میں اکٹھے تھے جب صائمہ چائے کے ساتھ پکڑے بھی لے کر آئیں۔

”واہ مہمانی تو آپ نے کمال کا کام کیا۔“ سب سے پہلے فخر اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ صائمہ نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی، فخر پکڑے کھاتے ہوئے ٹی

وی دیکھ رہا تھا، جبکہ فاطمہ اور سفیان پیالی تھامے سیاست رہ گئے تو گھر رہے تھے اور عفران پکڑے کھاتے ہوئے بھی ٹی وی اور کبھی باپ اور بھائی کو نرہ رہی تھی۔

”آج بتول آیا آئی تھیں۔“ ان کے اچانک اطلاع دینے پر سب انہیں دیکھنے لگے۔

”یہ کیوں بنی بات ہے ماما۔“ عفران نہ بنا کر بولی۔

”نئی بات یہ ہے کہ وہ صبا اور ردا کی شادی کرنا چاہتی ہیں تو اس مقصد کے لیے وہ ہمارے گھر آئی تھیں۔“ اب کے سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگے۔

”صبا اور ردا کی شادی سے ہمارا کیا مطلب ہے۔“ فاطمہ نے کافی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔ صائمہ نے غور سے فاطمہ کی شکل دیکھی۔

”آپا نے شروع سے ہی مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ صبا اور ردا کی شادی تم لوگوں سے ہوگی اور دیکھا جائے تو ٹھیک بھی ہے، وہ میری بھانجیاں ہیں، بچپن سے انہیں جانتی ہوں، مجھے پسند ہیں وہ۔“

”سفیان آپ کا کیا خیال ہے؟“ صائمہ نے اب اپنے شوہر سے پوچھا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، دونوں بچیاں اچھی ہیں۔“

”ہیں نا۔“ صائمہ خوش ہو کر بولیں۔ عفران نے اپنے دونوں بھائیوں کی شکل دیکھی۔

”پھر کیا کہتے ہیں آپا کو ہاں کہہ دوں۔“ انہوں نے تا ثیدی انداز میں سفیان کو دیکھا۔

”اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں صائمہ بیگم۔“

”آپ کو ابھی بھی جلد بازی لگ رہی ہے، آپا تو پر ہو جانے پر ناراض ہو رہی تھیں اور پھر آپ کو اور مجھے پسند ہیں صبا اور ردا۔“

”یہاں بات تمہاری اور میری پسند کی نہیں، جنہوں نے زندگی گزارنی ہے ان سے پوچھو۔“ انہوں نے فخر اور فاطمہ کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں فخر بولو، تمہیں صبا اور ردا میں سے کون پسند ہے۔“ صائمہ نے اب سیدھا فخر سے پوچھا تو وہ

گڑبڑا کر ماں کو دیکھنے لگا۔

”ماما وہ دونوں میری کزنز ہیں، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”فخر۔“ صائمہ غصے سے بولیں۔

”میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ میرا ارادہ صبا کو بہو بنانے کا ہے، تب تم کیوں نہیں بولے۔“

”مہمانی نے ہاں بھی نہیں کی تھی۔“

”تمہیں کوئی اور پسند ہے۔“ اب کے سوال سفیان کی طرف سے آیا تھا، فخر جواب دینے کے بجائے خاموش ہو گیا تھا۔

”میری ایک بات کان کھول کر سن لو فخر، اگر تم صبا سے شادی نہیں کرو گے تو پھر اپنی پسند کی لڑکی سے بھی تم شادی نہیں کر سکتے۔“

”سفیان غصے سے بولے۔“

”زندگی فخر نے کرنی ہے ماما تو اسے پورا حق ہے، وہ اپنی پسند کو نظر رکھے۔“ اب فاطمہ بھی بولا تھا۔

”تم اس کی اتنی حمایت کر رہے ہو، یقیناً تم نے بھی کوئی پسند کر رکھی ہوگی۔“

”میری بات چھوڑیں، مجھے اگر کوئی پسند ہوتی تو مجھے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔“ عفران نے بے ساختہ فاطمہ کی طرف دیکھا۔

”تو تمہیں ردا پسند ہے۔“

”اب میں نے یہ بھی نہیں کہا۔“

”اور وہ جو تمہاری ردا سے اتنی دوستی ہے۔“

”ماما آپ بات کو کہاں سے کہاں لے کر جا رہی ہیں۔ کزن ہے وہ ہماری، اچھے طریقے سے بات کرنے یا ٹیسی مذاق کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم شادی پلان کر کے بیٹھے ہیں، ردا میری کزن ہے بس اور لائف پارٹنر کے لیے میرے ذہن میں جو لڑکی ہے ردا اس سے بہت مختلف ہے۔“ صائمہ نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا اور دوپٹے میں چہرہ چھپا کر رونے لگیں۔

کمال ہے ماما۔۔۔۔۔ فاطمہ دونوں ناگوں پر ہاتھ



مارتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا اور سر جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔

”اب میں آیا کو کیا منہ دکھاؤ گی؟“ وہ اب اور زور سے رونے لگیں، پتھر نے بے بسی سے باپ کو دیکھا، جنہوں نے آنکھ کے اشارے سے انہیں جانے کو کہا تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ اٹھ کر صائے کے قریب بیٹھ گئے، وہ آہستہ آہستہ انہیں سمجھا رہے تھے۔

☆☆☆

”بھائی چائے۔“ وہ اپنی وارڈروب میں گھسا شرٹ منتخب کر رہا تھا، جب اپنے پیچھے عفرہ کی آواز سن کر مڑا، جو چائے کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

”تھینک یو ڈیر۔“ وہ اس کے سر پر ہینٹ لگاتا ہو لگ لے کر ٹیس کی طرف آ گیا۔

”ایک بات پوچھوں بھائی؟“

”ایک کیوں تم دس باتیں پوچھ سکتی ہو۔“ وہ اب لیپ ٹاپ آن کرتے ہوئے بولا۔

”آپ نے ردا کے لیے منع کیوں کیا۔“ فاطمہ سر اٹھا کر عفرہ کو دیکھنے لگا۔

”میں نے وجہ بتا دی ہے۔“

”وہ وجہ مہا کے لیے تھی۔“

”تو کیا تمہارے لیے وجہ کچھ اور ہے۔“ وہ مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”جی میرے خیال میں اس کی وجہ وہ ہے۔“

عفرہ کیا ہو گیا ہے تمہیں کیوں بے وقوف والی باتیں کر رہی ہو۔“

”میں یوں بے وقوف بھائی۔“ وہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔

”میں آپ کو کبھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”عفرہ۔“ فاطمہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا، تم رو کیوں رہی ہو۔“ اس نے اس کے قریب بیٹھ کر اسے گلے لگایا تھا۔

”بھائی وہ اتنی جلدی آپ کے حواسوں سے نہیں اترے گی۔ وہ آپ کو پاگل کر دے گی، جیسے مجھے کر رہی ہے، آپ کو اسے بھولنا ہوگا۔“ فاطمہ نے کچھ لحوں کے لیے بولا نہیں گیا تھا۔

”تمہیں لگتا ہے میں اس کی وجہ سے شادی نہیں کر رہا۔“ فاطمہ کے پوچھنے پر وہ خاموشی سے آنسو بہانی رہی تھی۔

”گدھی ہو تم، میں فخر سے پہلے شادی تو نہیں کر سکتا اور ابھی مجھے واپس آ سڑا گیا جانا ہے، میں شادی کے بارے میں فی الحال سوچ بھی نہیں سکتا، بس اتنی سی بات ہے اور میں نے شادی سے منع تو نہیں کیا، میں نے ردا سے شادی کے لیے منع کیا ہے اور اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتے نہیں۔“ فاطمہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر واپس لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھ گیا۔

”تم اس سے ملتی نہیں؟“ اس کے سامنے دیکھنے پر فاطمہ نے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اور وہ بھی نہیں؟“ فاطمہ کی نظریں لیپ ٹاپ پر ہی تھیں۔

”یونیورسٹی میں دو تین بار ملی تھی، پر میرا اس سے بات کرنے کو دل نہیں کرتا۔“

”بری بات ہے عفرہ، تمہیں ملنا چاہیے۔“

”کیوں ملوں میں، ناراض ہوں میں اس سے۔“ عفرہ ناراضی سے بولی۔

”تو پھر روئی کیوں ہو۔“ فاطمہ نے مسکرا کر پوچھا۔

”کیا آپ اس سے ناراض نہیں؟“

”نہیں۔“ فاطمہ نے اسے دیکھ کر کہا اور لیپ ٹاپ بند کر دیا۔

”میں باہر جا رہا ہوں مہا کو بتا دینا۔“ وہ اپنے بیڈ کی سائڈ سے چائیاں اٹھا کر باہر نکل گیا، جبکہ وہ دہاں کھڑی کتنی دیر تک سامنے والے ٹیس کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

”تو اجازت مل گئی ماما سے۔“ اس کے ویلو کہتے ہی دوسرے طرف سے زہرا کی طرف سے آواز سنائی دی، تو زہرا کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی اور شاید دوسری طرف اسے خود ہی اپنے لہجے کا احساس ہوا تھا۔

”کیسی ہو تم۔“

”ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں۔“

”میں تو ٹھیک نہیں۔“

”کیوں کیا ہوا۔“ وہ بے ساختہ بولی تو وہ ٹیس پڑا۔

”سن کر بہت اچھا لگا کہ تمہیں میری فکر ہے۔“

”اچھی بے ساختگی پر زہرہ نے فوراً ہونٹوں کو بچھ لیا تھا۔

”کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ نہیں، ٹی دی دیکھ رہی تھی۔“

”یونیورسٹی نہیں جا رہیں۔“

”کیوں۔“

”ویسے ہی۔“

”ہوں میں دو تین بار تمہارے ڈیپارٹمنٹ گیا، تم نظر نہیں آئیں، تمہاری اکلوتی سہیلی سے پوچھا، اس نے تو مجھے دیکھ کر منہ پھیر لیا، آئی ایم سر پرائزڈ۔۔۔۔۔ انتظار لگتا ہوں میں اسے۔“

”نہیں، اس نے آپ کو بچانا نہیں ہوگا۔“

”وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہے۔“

دوسری طرف جب اسے بتایا گیا تو وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔

”اب بولو تو۔“ وہ طویل خاموشی سے بے زار ہو کر بولا۔

”کیا بولوں۔“

”بولنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے زہرہ، کیا تم واقعی اتنا کم بولتی ہو یا مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں؟“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”تو کیسی بات ہے زہرہ، منگنی کو ایک ماہ ہونے کو آیا ہے، میں ہی فون کرتا ہوں، وہ بھی تم انٹینڈ نہیں کرتیں، بیچ کا جواب نہیں آتا، پہلے مجھے لگا تم شرماتی ہو، لیکن شرم میں اور گریز میں فرق ہوتا ہے۔“

”بات کرتے کرتے اس کا لہجہ اونچا ہو گیا تھا۔ زہرہ کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے تھے۔

”بہت فرق ہے تم میں اور شرمہ میں، اس سے بات کر کے اچھا لگتا ہے

اور تمہاری طرح دبو بھی نہیں۔“ زہرہ نے آنکھوں کو زور سے پچھ کر آنسو صاف کیے، دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی۔

”تم رو رہی ہو۔“ اب کے اس کا لہجہ نرم تھا۔ وہ چپ رہی۔

”سوری زہرہ، میں زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی رومانٹک ہوں۔ میرا دل کرتا ہے میں ہر وقت تم سے باتیں کرتا رہوں، تم خود دیکھو، یہ جو منگنی کا عرصہ ہوتا ہے یہ انجوائے کرنا چاہیے، میں ہر روز اٹھتے ہی سوچتا ہوں، تم سے یہ کہوں گا، وہ کہوں گا، لیکن جب بھی فون کرتا ہوں چ۔۔۔۔۔ اس نے آنسو سے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”خیر۔۔۔۔۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں اور پلیز منع مت کرنا۔“ وہ منہ کھول کر نہیں کہنے والی تھی، جب اس نے ٹوک دیا۔

”اب یقیناً تم نے اس بات کے لیے بھی ماما کی اجازت لینی ہوگی، لیکن اس بار میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا، تمہیں آنا ہوگا اکیلے، آنے میں اگر پرالیم ہے تو شرمہ کے ساتھ آ جاؤ، میں اس سے بات کر لیتا ہوں، ٹھیک ہے نا۔“ اپنی کہنے کے بعد اس کے لیے کچھ چھوڑا ہی کہاں تھا، اس نے ہوں کہنے کے بعد فون واپس رکھ دیا۔



ایسے کیوں بیٹھی ہو زہرہ۔ وہ میری جیوں پر بیٹھی  
ایک ٹک سامنے لگے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔ جب  
صفورہ کی آواز پر چونک کر پلٹی۔

”کچھ نہیں ماما۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر پھر سامنے  
دیکھنے لگی تو صفورہ بھی اس کے ساتھ میز پر بیٹھ گئیں۔  
”اتنی شام کو لان میں نہیں بیٹھتے۔“ ان کے  
کہنے پر بھی وہ خاموش رہی۔

”زہرہ کیا بات ہے۔“ اب کے انہوں نے رخ  
اس کی طرف موڑ لیا۔ زہرہ نے گہرا سانس لے کر سر  
ان کی طرف گھمایا۔

”ماما آج زوہیب کا فون آیا تھا۔“  
”اچھا تو اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔“  
وہ مسکرا کر بولیں۔

”مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ماما۔“  
”کیا بات سمجھ میں نہیں آرہی میری گڑیا کو۔“  
انہوں نے اس کا سر سہلایا تو اس نے سر ان کی گود  
میں رکھ دیا۔

”ماما میں لوگوں کو سمجھ نہیں پاتی بالوک مجھے نہیں  
سمجھتے۔“ اس کا سر سہلایا صفورہ کا ہاتھ رک گیا تھا۔  
”مجھ سے کوئی خوش نہیں ہوتا، میں کسی کی خوشی  
کا باعث نہیں بن پاتی، مجھ میں کیا خرابی ہے ماما کہ  
کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔“

”کیا ہوا ہے زہرہ، زوہیب نے کچھ کہا ہے۔“  
صفورہ نے اس سے سنجیدگی سے پوچھا، لیکن وہ اپنی  
دھن میں تھی۔

”بچپن سے ایسا ہی ہوتا آرہا ہے، ہمیشہ آپ کی کو  
مجھ سے زیادہ توجہ اور محبت ملی، لیکن اس کے باوجود وہ  
مجھ سے میری ہر خوشی چھیننے کی کوشش کرتی ہیں، ہر کوئی  
میرا مقابلہ ان سے کرتا ہے، کیا میری اپنی کوئی پہچان  
نہیں، کیا کوئی مجھے میری پہچان کی بنا پر میری عادتوں  
اور سیرت سے محبت نہیں کر سکتا، کیا آنے والی زندگی  
میں مجھے کمزور و مائوس کرنا پڑے گا، مجھے محبت نہیں ملے  
گی، عزت نہیں ملے گی، آگے بھی مجھے ڈر ڈر کر چھینا

پڑے گا۔“

”ہوا کیا ہے زہرہ۔“ صفورہ نے پریشانی  
اسے جھنجھوڑا لیا تھا۔ زہرہ نے چونک کر انہیں دیکھا  
جو پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”بیٹاؤ مجھے، زوہیب نے کچھ کہا ہے یا شمرہ نے  
کچھ کر دیا ہے۔“ زہرہ نے بے ساختہ سر جھٹکا۔

”نہیں ماما۔“ اس نے بے ساختہ ماتھا سہلایا۔  
”زوہیب بار بار مجھے فون کرتے ہیں۔ مجھے  
کچھ میں نہیں آتا، کیا بات کروں، یہ ہی ڈر رہتا ہے،  
کوئی غلط بات نہ کہہ دوں جو انہیں بری لگ جائے  
اور وہ اس بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔“

”اور شمرہ کے بارے میں کیا کہہ رہی تھیں۔“  
”کچھ نہیں ماما۔“  
”مجھے بتاؤ زہرہ۔“ وہ اب غصے سے بولیں۔

”میرے خیال میں آپنی زوہیب سے باتیں  
کرتی ہیں تو انہیں بھی گلے لگائے آپنی مجھ سے بہتر  
ہیں۔“ صفورہ کے ہونٹ چمچنے لگے تھے۔

”اب زوہیب نے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، وہ بھی  
آپنی کے ساتھ اور مجھے لگتا ہے آپنی ملتی بھی ہیں۔“ اب  
کے زہرہ نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں  
آنسوؤں سے بھری تھیں۔ صفورہ نے گہرا سانس لیا۔

”تم پریشان نہ ہو، میں دیکھ لوں گی سب، تم  
زوہیب سے بات کر کے اسے کلیئر کر دو، غلط فہمی کو  
جتنی جلدی ختم کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے اور  
ہاں۔“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئیں۔

”جو محبت نصیب میں لکھی ہوئی ہو اسے کوئی  
نہیں چھین سکتا، جو تمہارا ہے وہ تمہارا ہی رہے گا اور  
جو تمہارا نہیں وہ تمہارا ہو کر بھی تمہیں نہیں مل سکے گا۔  
اللہ پر یقین رکھو، وہ اچھوں کے ساتھ اچھا کرتا ہے  
اور یہ جو آزمائشیں زندگی میں آتی ہیں، یہ انسان کو  
کندن بنا دیتی ہیں، تمہیں کسی سے ڈرنے کی  
ضرورت نہیں اور نہ تم کسی سے کم ہو، تم میری سب  
سے اچھی اور پیاری بیٹی ہو۔“ انہوں نے کہہ کر اسے  
دوبارہ ساتھ لگا لیا۔

”اسج زوہیب کا فون آیا تھا وہ زہرہ سے ملنا  
چاہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے میں بھی زہرہ کے ساتھ  
آؤں۔“ کھانا کھاتے ہوئے شمرہ نے بڑے مطمئن  
انداز میں اطلاع دی تھی۔ اور صفورہ اسی وقت کا  
انتظار کر رہی تھیں، انہوں نے اپنا چہرہ پلیٹ میں رکھ  
کر اسے دیکھا۔

”زوہیب نے تمہیں فون کیوں کیا۔“ اب کے  
شمرہ نے چونک کر دیکھا، وقار، صفورہ اور زہرہ تینوں  
اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں، اس  
سے پوچھیں۔“

”تمہیں یاد ہے نا زوہیب، زہرہ کا مگتیر ہے؟“  
”آپ کا مطلب کیا ہے؟“ اب کے شمرہ نے  
ماتھے پر ہل ڈال کر پوچھا۔

”میرا مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو، کیوں تم  
زوہیب سے ملتی ہو، اس سے باتیں کرتی ہو۔“ وقار  
نے چونک کر صفورہ کو دیکھا۔

”مجھے کوئی شوق نہیں اس سے ملنے یا بات  
کرنے کا، وہ کرتا ہے مجھے فون، میں نے تو اس کی  
وجہ سے اس سے بات کی تھی۔“ اس نے زہرہ کی  
طرف اشارہ کیا۔

”شمرہ! ڈانٹ بھی دس گھر چھوڑ دیتی ہے، تم  
اپنی بیٹی کی بہن کے پیچھے پڑ گئی ہو۔“ شمرہ نے غصے  
سے پلیٹ پیچھے کھٹکائی۔

”کیا ہو گیا ہے، کیوں فضول بولتی جا رہی  
ہو۔“ وقار نے انہیں ٹوکا تھا۔

”آپ تو جب ہی رہیں پاپا۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر  
بدتمیزی سے بولی۔ ”تجگ آگئی ہوں میں آپ لوگوں  
کی روز، روز کی چی چی سے، یہ مت کرو، وہ مت کرو،  
ہر وقت زہرہ آپ لوگوں کے ذہن پر سوار رہتی ہے،  
اس ٹیک بی بی کے کارنامے تو کسی کو دکھائی نہیں  
دیتے، کسی کو میری قربانی نظر نہیں آتی، میں بڑی  
ہوں، لیکن منگنی شدہ یہ ہے۔“

”قربانی؟ کون سی قربانی دی ہے تم نے، میں تو  
زہرہ کی منگنی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، تم نے مجھے فورس کیا  
تھا، مجھے تو پسند بھی فاطمہ تھا، تم نے زوہیب کا کہا تھا زہرہ  
الواو ہے زوہیب میں۔“ زہرہ کے سر پر دھماکا  
ہوا تھا، اس نے بے نیکی سے اپنی سگی بہن کو دیکھا۔  
”تو کیا غلط کہا تھا زوہیب نے اسے خود  
پر دلوں کیا تھا، اس کی مرضی تھی تو وہ گھر تک آیا تھا اور  
یہاں تو آپ کو پاپا کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور  
جب میں نے عدیل کا کہا تھا آپ دونوں کیسے  
میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کے گھر والوں سے  
ملنے سے انکار کر دیا۔ میں بہت کچھ کر سکتی تھی، آپ  
کی عزت کی دھجیاں اڑا سکتی تھی، لیکن دیکھیں  
خاموش ہو گئی اسے قربانی کہتے ہیں۔“ تیز تیز بولتے  
اس کا سانس پھولنے لگا تھا، اس کا خوب صورت چہرہ  
نفرت سے عجیب سا ہو گیا تھا۔  
”وہ کسی قابل ہوتا تو میں خوش خوشی تمہاری  
خوشی پوری کر دیتی، لیکن وہ کسی کام کا نہیں۔“  
”آپ کو اب الہام بھی ہونے لگے ہیں۔“ وہ  
طنز پر انداز میں ہنس کر بولی۔  
”الہام نہیں پتا کروایا ہے۔“  
”واہ۔“ شمرہ نے تالی بجاتی۔  
”کون ہے آپ کا ذلیل بیٹو تم کیا جانتی ہو  
اس کے بارے میں۔“ اب یہ سوال وقار نے کیا تھا۔  
”یہ کیا کم ہے کہ وہ آپ سب سے زیادہ مجھ  
سے سینئر ہے۔“  
”تمہیں لگتا ہے ماں باپ سے زیادہ بھی کوئی  
تم سے پیار کر سکتا ہے۔“  
”ہاں مجھے لگتا ہے۔“ وقار نے افسوس سے شمرہ  
کو دیکھا۔  
”اس کا کریکٹر اچھا نہیں شمرہ، وہ ایسے ہی  
لڑکیوں کو پھانتا ہے، تم سے پہلے وہ ایک شادی  
کر چکا ہے اور ایک لڑکی کو ایسے ہی تباہ کر چکا ہے۔“  
”بکواس، آپ جھوٹ بول رہی ہیں، تا کہ میں  
عدیل سے بدظن ہو جاؤں، لیکن اپنی اس غلط فہمی کو  
دور کر لیں، خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”مجھے اس

زہرہ کی منگنی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، تم نے مجھے فورس کیا  
تھا، مجھے تو پسند بھی فاطمہ تھا، تم نے زوہیب کا کہا تھا زہرہ  
الواو ہے زوہیب میں۔“ زہرہ کے سر پر دھماکا  
ہوا تھا، اس نے بے نیکی سے اپنی سگی بہن کو دیکھا۔  
”تو کیا غلط کہا تھا زوہیب نے اسے خود  
پر دلوں کیا تھا، اس کی مرضی تھی تو وہ گھر تک آیا تھا اور  
یہاں تو آپ کو پاپا کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور  
جب میں نے عدیل کا کہا تھا آپ دونوں کیسے  
میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کے گھر والوں سے  
ملنے سے انکار کر دیا۔ میں بہت کچھ کر سکتی تھی، آپ  
کی عزت کی دھجیاں اڑا سکتی تھی، لیکن دیکھیں  
خاموش ہو گئی اسے قربانی کہتے ہیں۔“ تیز تیز بولتے  
اس کا سانس پھولنے لگا تھا، اس کا خوب صورت چہرہ  
نفرت سے عجیب سا ہو گیا تھا۔  
”وہ کسی قابل ہوتا تو میں خوش خوشی تمہاری  
خوشی پوری کر دیتی، لیکن وہ کسی کام کا نہیں۔“  
”آپ کو اب الہام بھی ہونے لگے ہیں۔“ وہ  
طنز پر انداز میں ہنس کر بولی۔  
”الہام نہیں پتا کروایا ہے۔“  
”واہ۔“ شمرہ نے تالی بجاتی۔  
”کون ہے آپ کا ذلیل بیٹو تم کیا جانتی ہو  
اس کے بارے میں۔“ اب یہ سوال وقار نے کیا تھا۔  
”یہ کیا کم ہے کہ وہ آپ سب سے زیادہ مجھ  
سے سینئر ہے۔“  
”تمہیں لگتا ہے ماں باپ سے زیادہ بھی کوئی  
تم سے پیار کر سکتا ہے۔“  
”ہاں مجھے لگتا ہے۔“ وقار نے افسوس سے شمرہ  
کو دیکھا۔  
”اس کا کریکٹر اچھا نہیں شمرہ، وہ ایسے ہی  
لڑکیوں کو پھانتا ہے، تم سے پہلے وہ ایک شادی  
کر چکا ہے اور ایک لڑکی کو ایسے ہی تباہ کر چکا ہے۔“  
”بکواس، آپ جھوٹ بول رہی ہیں، تا کہ میں  
عدیل سے بدظن ہو جاؤں، لیکن اپنی اس غلط فہمی کو  
دور کر لیں، خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”مجھے اس

زہرہ کی منگنی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، تم نے مجھے فورس کیا  
تھا، مجھے تو پسند بھی فاطمہ تھا، تم نے زوہیب کا کہا تھا زہرہ  
الواو ہے زوہیب میں۔“ زہرہ کے سر پر دھماکا  
ہوا تھا، اس نے بے نیکی سے اپنی سگی بہن کو دیکھا۔  
”تو کیا غلط کہا تھا زوہیب نے اسے خود  
پر دلوں کیا تھا، اس کی مرضی تھی تو وہ گھر تک آیا تھا اور  
یہاں تو آپ کو پاپا کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا اور  
جب میں نے عدیل کا کہا تھا آپ دونوں کیسے  
میرے خلاف ہو گئے تھے۔ اس کے گھر والوں سے  
ملنے سے انکار کر دیا۔ میں بہت کچھ کر سکتی تھی، آپ  
کی عزت کی دھجیاں اڑا سکتی تھی، لیکن دیکھیں  
خاموش ہو گئی اسے قربانی کہتے ہیں۔“ تیز تیز بولتے  
اس کا سانس پھولنے لگا تھا، اس کا خوب صورت چہرہ  
نفرت سے عجیب سا ہو گیا تھا۔  
”وہ کسی قابل ہوتا تو میں خوش خوشی تمہاری  
خوشی پوری کر دیتی، لیکن وہ کسی کام کا نہیں۔“  
”آپ کو اب الہام بھی ہونے لگے ہیں۔“ وہ  
طنز پر انداز میں ہنس کر بولی۔  
”الہام نہیں پتا کروایا ہے۔“  
”واہ۔“ شمرہ نے تالی بجاتی۔  
”کون ہے آپ کا ذلیل بیٹو تم کیا جانتی ہو  
اس کے بارے میں۔“ اب یہ سوال وقار نے کیا تھا۔  
”یہ کیا کم ہے کہ وہ آپ سب سے زیادہ مجھ  
سے سینئر ہے۔“  
”تمہیں لگتا ہے ماں باپ سے زیادہ بھی کوئی  
تم سے پیار کر سکتا ہے۔“  
”ہاں مجھے لگتا ہے۔“ وقار نے افسوس سے شمرہ  
کو دیکھا۔  
”اس کا کریکٹر اچھا نہیں شمرہ، وہ ایسے ہی  
لڑکیوں کو پھانتا ہے، تم سے پہلے وہ ایک شادی  
کر چکا ہے اور ایک لڑکی کو ایسے ہی تباہ کر چکا ہے۔“  
”بکواس، آپ جھوٹ بول رہی ہیں، تا کہ میں  
عدیل سے بدظن ہو جاؤں، لیکن اپنی اس غلط فہمی کو  
دور کر لیں، خیر۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”مجھے اس



بارے میں بحث نہیں کرنی، مجھے صرف یہ بتانیں  
زہرہ کل میرے ساتھ جاری ہے یا میں زہرہ کو منع  
کردوں۔“ صفورہ نے دانت پر دانت رکھ کر خود پر  
ضبط کیا تھا۔ وقار نے ایک نظر صفورہ کو دیکھا اور  
دوسری نظر صم شہی زہرہ پر ڈالی۔

”زہرہ جانے گی کل تمہارے ساتھ، لیکن بہتر  
ہوگا تم زہرہ سے زیادہ فری نہ ہو، کیونکہ آگے  
جا کر تمہاری بہن کو مسئلہ ہو سکتا ہے۔“ زہرہ نے ابرو  
اچکا کر وقار کو دیکھا۔

”واہ پاپا..... آپ کو بھی زہرہ زہرہ کرنے کی  
عادت پڑ گئی ہے۔ واہ بھی زہرہ تمہارے چاہنے  
والے تو ہر جگہ نظر آنے لگے ہیں، گھر میں، گھر کے  
سامنے، گھر سے دور، واہ بھی کیا قسمت ہے۔“ وہ داد  
دیتے ہوئے کرسی دھکیل کر بیڑھیاں چڑھ گئی، جبکہ  
صفورہ نے بے بسی سے سر ہٹا لیا اور وقار بھی پریشانی  
سے بیڑھیوں کی طرف دیکھتے رہے جہاں ان کی  
لاڈلی بیٹی گئی تھی۔

☆☆☆

”پلیز نٹ سر پرائز۔“ ان دونوں کو دیکھ کر وہ  
کھڑا ہو گیا تھا۔

”مجھے بالکل امید نہیں تھی تم آؤ گی۔“  
زہرہ کی پرشوق نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں  
جو اس کی طرف دیکھتے سے گریزاں تھی۔

”یہ کریڈٹ مجھے جاتا ہے۔“ اس کے ساتھ  
کھڑی ٹیبلر کو آ کر رکھ کر اسے متوجہ کروانا پڑا۔

”ٹینکس ٹو یو مائی ڈیزر سالی صاحبہ۔“ وہ جھک  
کر بولا۔

”اب یہ مت بھولنا سالی آدھی گھر والی بھی  
ہوتی ہے۔“

”ارے آپ کے لیے تو پورا گھر حاضر ہے۔“  
”دھیان سے کہیں، ایسا نہ ہو میں واقعی پورے  
گھر پر قبضہ کر لوں۔“ وہ دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے،  
جبکہ زہرہ کو ان کے مذاق سے انجھن ہونے لگی تھی۔

”سالی صاحبہ آپ تو اتنا اچھا بولتی ہیں، یہ

محترمہ اتنی گم صم کیوں رہتی ہیں۔“

”کیونکہ ان محترمہ کا دل اور دھیان کہیں اور  
رہتا ہے۔“

”کیا مطلب۔“ زہرہ نے چونک کر پوچھا  
تو زہرہ نے بے ساختہ شمرہ کو دیکھا۔

”کیوں زہرہ، بتا دوں زہرہ کو۔“ زہرہ بہم  
کر شمرہ کو دیکھنے لگی، پتا نہیں اب وہ کون سا تیر  
چھوڑنے والی تھی۔

”کیا بات ہے۔“ دوسری طرف زہرہ  
آنکھوں میں شکر لیے زہرہ کو دیکھنے لگا۔

”کچھ نہیں، مذاق کر رہی تھی، اب یوں ہی  
بیٹھے سوال کرتے رہو گے یا کچھ کھانے کا آرڈر بھی  
دو گے۔“

”ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے ایک نظر زہرہ کو دیکھ  
کر بیڑ کو بلانے لگا اچھا تو زہرہ سے بتاؤ تم دونوں  
پہلی بار کب اور کیسے ملے۔“ ویش کے سرو کرنے کے  
بعد شمرہ نے پھر سوالنامہ شروع کر دیا تھا۔

”زہرہ کا تو پتا نہیں، لیکن میں کافی عرصے سے  
محترمہ کو نظر میں رکھے ہوئے تھا۔ اس کی یہ بے

نیازی ہی مجھے زیادہ اثر دیکھ کر تھی، لیکن اب  
محسوس ہوتا ہے یہ نیازی نہیں بے حس ہے۔ زہرہ  
نے چونک کر زہرہ کو دیکھا۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ  
رہا تھا۔ شمرہ نے مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”آگ لگ چکی تھی، تھوڑا اور تیل ڈالنا تھا اسے۔“  
”یہ تو ہمیشہ سے ایسی ہی ہے بورنگ، تمہیں پتا

نہیں اس میں کیا نظر آیا، میں تو حیران ہوئی، جب  
تمہارے جیسے پنڈم لڑکے کا پروپوزل زہرہ کے لیے

آیا۔ آئی ایم سوری، لیکن مجھے تمہارے ٹیسٹ پر  
انکس ہو رہا ہے۔ وہ سوپ پیتے ہوئے کافی بے رحمانہ

تجزیہ کر رہی تھی۔ زہرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کسے  
اپنا دفاع کرے، اس کی زبان نالو سے چپک کر رہ گئی  
تھی اور آنکھیں اپنی بے عزتی پر بہنے کو تیار تھیں۔

”اب خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں، زہرہ بہت  
خوب صورت ہے، جس نے بھی زہرہ کو دیکھا اس

نے میری پسند کو داد دی تھی۔“ زہرہ نے مسکرا کر  
زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا تو شمرہ کا مسکراتا چہرہ سنجیدہ

ہو گیا تھا۔ اس کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا تھا۔ زہرہ کی  
کسی بات پر وہ مسکرائی تھی، جب اسے عجیب سا

احساس ہوا اسے لگا کوئی اسے دیکھ رہا ہے، اتنے غور  
سے کہ اسے اپنے چہرے پر پیش محسوس ہو رہی تھی،  
اس نے زہرہ کی طرف دیکھا، وہ اس کی طرف

متوجہ نہیں تھا۔ ”پھر کون۔“ اس نے دھیرے سے  
دائیں طرف دیکھا، ایسا کوئی نہیں تھا۔ اس نے

نظروں کو بائیں طرف گھمایا اور اسے لگا جیسے ساری  
دنیا گھوم گئی ہو۔ زہرہ کے پیچھے بائیں طرف والے  
ٹینبل پر فاطمہ بیٹھا تھا اور جس طرح وہ اسے گھور رہا تھا وہ

اندازہ کر سکتی تھی اس کا چہرہ کیوں جل رہا ہے۔ اس کے  
لیے ایک نوالہ کھانا بھی مشکل ہو گیا تھا۔

”ایکسیکوزی..... میں آئی ہوں۔“ وہ ایک دم  
کھڑی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا۔“ زہرہ اس کے یوں کھڑے  
ہونے پر حیران ہوا تھا۔

”مجھے واش روم جانا ہے۔“ اوکے دس وے  
”اس نے بائیں طرف اشارہ کیا۔

”ارے جاؤ، رک کیوں گئی ہو۔“ اسے ایسے  
ہی کھڑے دیکھ کر شمرہ نے ٹوکا تو وہ طوعاً کرہاً اپنی جگہ

سے اٹھی۔ فاطمہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس  
نے واضح طور پر اپنی ناغوں میں لرزش محسوس کی تھی۔

”ارے زہرہ۔“ فخر کی آواز پر وہ بے ساختہ  
مڑی تھی۔

”تم یہاں کہاں..... میں بھی کہوں یہ ملی  
اس ریسٹورنٹ میں آنے کے لیے اتنا زور کیوں

دے رہی تھی۔“ فخر اٹھ کر اس کے قریب آ گیا، اس  
نے مڑ کر ٹینبل کی طرف دیکھا، جہاں عفرات بیٹھی تھی

۔ اس کے دیکھنے پر عفرات نے منہ دوسری طرف پھیر لیا،  
جبکہ فاطمہ کی پہلے ہی اس کی طرف پشت تھی۔“

”واؤ کیا اتفاق ہے۔“  
”کیا۔“ شمرہ کے سامنے دیکھ کر مسکرانے پر

زہرہ نے بھی مڑ کر دیکھا، جہاں زہرہ ایک لڑکے  
کے سامنے کھڑی تھی۔

”یہ کون ہے۔“  
”یہ ہمارے بڑوسی ہیں، عفرات، زہرہ کی دوست

کو تو تم جانتے ہو گے نا، یہ اس کے بھائی ہیں، زہرہ کا  
ان کے گھر بہت آنا جاتا ہے، بلکہ کہنا چاہیے بہت  
محبت ہے۔ وہ جو بلیوئی شرٹ میں لڑکا بیٹھا ہے، اس

کا پروپوزل بھی آیا تھا زہرہ کے لیے، دونوں شاید  
ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔“ زہرہ نے غور  
سے اس لڑکے کو دیکھا جو ہونٹ پیچھے چادروں میں

چھپ چھپا رہا تھا۔  
”تو پھر اس کا پروپوزل قبول کیوں نہیں کیا؟“

زہرہ نے سنجیدگی سے شمرہ کو دیکھا۔  
”اچھا ٹیلی ماما اور ماما کو ایسی بے شرمی کی باتیں

پسند نہیں نا اور پھر عفرات کے گھر والے بھی نہیں مانے،  
انہیں خوب صورت لڑکی چاہیے تھی، میرے جیسی آئنی

تو میرا ہی رشتہ لینا چاہتی تھیں، پر میں نے منع کر دیا۔  
میرا یوں ذرا اونچا ہے۔“ اس نے ایک اداسے بال

پیچھے کرتے ہوئے کہا۔  
”اس لیے تمہیں کہہ رہی تھی، مجھے تمہارے

انتخاب پر حیرانی ہو رہی تھی۔“ زہرہ نے کوئی  
جواب نہیں دیا، اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا، زہرہ

وہاں سے جا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد شمرہ نے فاطمہ کو بھی  
اٹھ کر واش روم کی طرف جاتے دیکھا، تو اس کی

آنکھیں چمک اٹھیں۔  
”تم کہاں جا رہی ہو۔“ زہرہ نے چونک کر

اسے اٹھتے دیکھا۔ ”وہ بھی زہرہ کے پیچھے گیا ہے، مجھے  
انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا ہے۔“ زہرہ نے تو دنگ رہ گیا

تھا۔ زہرہ کا جواہج اس کی نظر میں تھا اس کی دھجیاں اڑ  
رہی تھیں۔ وہ بھی اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ شمس کے

سامنے کھڑے ہو کر اس نے غور سے اپنا چہرہ دیکھا،  
اسے بے حد رونما آ رہا تھا، عفرات کی اتنی نفرت، فاطمہ کی

نظروں کی جھپن، یہ سب باتیں اس سے برداشت نہیں  
ہو پا رہی تھیں، اس نے گہرا سانس لے کر پانی کے



چھٹنے منہ پر مارے تو جلتی آنکھوں کو کچھ سکون ملا۔ وہ باہر نکلی تو وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ بے ساختہ دونوں کی نظریں ملی تھیں، صرف ایک لمحے کے لیے اور دونوں ہی نظروں کا زاویہ بدل کر آگے بڑھ گئے، ابھی وہ کوریڈور سے لنگی تھی جب شرہ اور زوہیب اسے آتے دکھائی دیے۔ وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔

”تم نے اتنی دیر کر دی تو ہمیں آنا پڑا۔“ اس کے دیکھنے پر شرہ جلدی سے بولی۔

”لیکن مجھے تو صرف بائچ منٹ لگے ہوں گے۔“ اس نے سنجیدگی سے شرہ کو دیکھا۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو، تم دونوں باہر چلو، میں آتی ہوں۔“ شرہ ان دونوں کو جانے کا کہہ کر خود واش روم میں آ گئی، اس کا ارادہ آج فاطمہ سے بات کرنے کا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر عفرہ نے غصے سے پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

”یہ زہرہ کو کیا ہوا ہے۔“ اسے یوں جاتا دیکھ کر فخر کا فی حیران ہوا تھا۔

”مگنی کروا کے دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ عفرہ ایک ایک لفظ چپا کر بولی تو فخر نے غور سے اسے دیکھا۔

”اور تمہیں کیا ہوا، تم نے بھی اس سے بات نہیں کی اور اس کی مگنی پر بھی نہیں گئی تھیں اور اب وہ بھی ہمارے گھر نہیں آئی۔“

”یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں۔ وہ نہیں آئی، اس کی مرضی ہے۔“ اب فخر کو واقعی کسی گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

”چلیں۔“ فاطمہ نے آتے ہی کہا تھا۔

”یاد رہی تو آکس کریم کھائی تھی۔“

”پیک کروا لیتے ہیں، میرا موڈ نہیں۔“

”اور میرا بھی دل نہیں چاہ رہا۔“ عفرہ نے فاطمہ کی شکل دیکھ کر کہا تو فخر نے گہری نظر سے دونوں کی سوچی ہوئی شکلوں کو دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ پارکنگ کی طرف بڑھ رہے تھے، جب انہوں نے زہرہ اور زوہیب کو کار کے پاس کھڑے دیکھا۔ زوہیب کچھ

بول رہا تھا، جبکہ زہرہ کا چہرہ رونے والا ہو رہا تھا۔

”لگتا ہے زہرہ کے ساتھ کوئی پرابلم ہے۔“ فخر کو معاملہ عجیب لگا تھا۔

”وہ ان کا معاملہ ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر فخر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔“ اب کے وہ غصے سے بولا۔

”تم بیٹھو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ کہنے کے ساتھ فاطمہ نے تیزی سے بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

”ادھر کدھر جا رہے ہو۔“ اب کے فخر کو فاطمہ پر واقعی غصہ آنے لگا تھا۔ ان دونوں کے قریب سے فاطمہ نے اتنی تیزی سے کار گزاری کہ اگر وہ دونوں تیزی سے پیچھے نہ ہٹتے تو یقیناً ایک آدھ زخمی ہو جاتا۔

”اندھے ہو گیا۔“ اپنے پیچھے ان تینوں نے زوہیب کی عیسیٰ آواز سنی تھی۔

”فاطمہ تمہیں کیا ہوا ہے۔“ فخر نے چہرہ موڑ کر اس کا سخت چہرہ دیکھا۔

”مجھے کیا ہوتا ہے۔“

”تم دونوں مجھ سے کچھ جھباہے ہو۔“ اب کے فخر نے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھا۔ عفرہ نے کار کا شیشہ نیچے کر کے منہ پوری طرح باہر کر لیا، جبکہ فاطمہ نے فل والیوم میں گانے لگا دیے تھے۔ فخر اب غصے سے بول رہا تھا، جبکہ وہ دونوں گونگے اور بہرے ہو گئے تھے۔

”تمہیں کوئی اور پسند تھا زہرہ! تو تم مجھے بتا سکتی تھیں۔“ کار کی طرف بڑھتے ہوئے وہ اپنے خیالوں میں گم تھی۔ جب اس نے زوہیب کی سنجیدہ آواز سنی، وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”یہ آپ سے کس نے کہا؟“

”تمہارا اپنی ٹیڈی بتاتا ہے۔“

”آپ مجھے غلط سمجھ کر رہے ہیں، یہ بات آپ کتنی بار کہہ چکے ہیں، میں اس لیے نہیں بولی شاید آپ مذاق کر رہے ہیں، میں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں، بولی ورنی میں بھی میں ایسی ہی، اگر آپ کو یاد

ہو، آٹ ہمیشہ مجھے کبھی آپ سے، کبھی اپنی کسی کزن سے کبیر کرتے ہیں، مجھے اچھا نہیں لگتا، مجھے جیسی نیچر اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے، میں اسے بدل نہیں سکتی، کم گو ہوں، میری نیچر ہے، میں باتونی نہیں بن سکتی۔ سادگی میری نیچر میں ہے، میں فیشن ایبل نہیں بن سکتی۔ میں نے اچانک خود کو تبدیل نہیں کیا، آپ نے ایسے ہی دیکھ کر مجھے پسند کیا تھا۔“ وہ روہا سی ہو گئی تھی۔ اسے لگا اگر آج وہ نہ بولی تو کچھ غلط ہو جائے گا، لیکن شاید زوہیب مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”لیکن شرہ کا کہنا ہے تم کسی اور کو پسند کرتی ہو، وہ لڑکا جسے دیکھ کر تم پریشان ہو گئی تھیں اور جو تمہارے پیچھے بھی گیا تھا۔ شاید تم سے بات کرنے اور اس نے تمہیں پروپوز بھی کیا تھا۔“ زہرہ نے گہرا سانس لیا۔

”ہاں نہیں شرہ کو اس سے کیا پیر تھا، اس کی زندگی تباہ کرنے پر تھی۔“

”ایسا کچھ نہیں، وہ میری دوست کے بھائی ہیں۔ انہوں نے مجھے پروپوز نہیں کیا۔ میری مگنی آپ سے ہو چکی ہے، اس کا مطلب ہے میں نے آپ کو پسند کیا ہے۔“ زوہیب طنز پر انداز میں مسکراتا تھا۔

”یہ بات تم نے پہلے ہی بولی تو شاید میں خوشی سے پاگل ہو جاتا، لیکن اب میرا دل مطمئن نہیں ہو پا رہا۔“

”آپ کو میری بات پر یقین نہیں۔“ زوہیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”وہ تمہاری سگی بہن ہے، وہ کیوں جھوٹ بولے گی، کچھ تو ہے جو وہ یہ سب کہہ رہی ہے۔“ زہرہ نے مایوس ہو کر سر ہٹا دیا، اپنی طرف تیزی سے آئی گاڑی اسے دکھائی دی، لیکن وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے دیکھ کر اتنی حیران ہوئی کہ سوچنا بھول گئی۔

زوہیب نے بازو سے پکڑ کر اسے بھی پیچھے کیا اور خود بھی تیزی سے ہٹا تھا۔ گاڑی زن سے گزری تھی۔

”اندھے ہو گیا۔“ اس نے زوہیب کو پیچھے سنا، جبکہ اس کے حواس سن ہو گئے تھے۔ فاطمہ اسے مارنا چاہتا تھا یا زوہیب کو۔

”کہاں چلے گئے تھے تم دونوں، کب سے

ڈھونڈ رہی ہوں۔“ اچانک شرہ نے آ کر کہا، جبکہ وہ دونوں کچھ نہیں بولے۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی، وہ تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ شرہ کو انہوں سے ہوا تھا کہ وہ فاطمہ سے بات نہیں کر سکی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کیسے وہ فاطمہ سے بات کرے۔

وہ پکڑے بدل کر باہر نکلی تو زہرہ ہاتھ ملتی بیڈ پر بیٹھی اسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر زہرہ تیزی سے اٹھی۔ ”آپ کو کیا پرابلم ہے مجھ سے آپ! کیوں میری زندگی برباد کرنے پر تھی۔“

”اب کیا ہو گیا۔“ ششے کے سامنے کھڑے ہو کر شرہ بے زاری سے بولی۔

”آپ نے کیوں کہا زوہیب سے کہ فاطمہ بھائی نے مجھے پروپوز کیا۔ میں پسند کرتی ہوں انہیں، یہ مگنی میری مرضی سے نہیں ہوئی۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے ڈیر۔“

”آپلی پلینز..... میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، بس کریں، میرا نہیں تو ما، بابا کا ہی سوچ لیں، انہیں تکلیف ہوگی۔“ شرہ نے مسکرا کر اس کے جڑے ہاتھوں کو دیکھا اور رخ موڑ لیا۔

”تمہیں تکلیف میں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے زہرہ! جب جب تم فاطمہ کو دیکھتی ہو اور جو تکلیف تمہارے چہرے پر آتی ہے سچ مجھے بہت سکون ملتا ہے۔ مجھے بھی یہ برداشت نہیں ہوتا کہ میرے سامنے کوئی تمہیں خوب صورت کہے، کوئی میری موجودگی میں تمہیں پسند کر لے، تم کیا کہتی ہو زوہیب سے مگنی ہوگی، تم جیت گئیں، تم باہر گئی ہو زہرہ اور تمہاری باہر میں میری جیت ہے۔“

”اتنی نفرت کیوں آپلی میں آپ کی سگی بہن ہوں، مجھے نہیں یاد پڑتا میں نے بھی جانے انجانے میں آپ کو تکلیف دی ہو، میں آپ سے بہت پیار کرتی ہوں، میں جانتی ہوں آپ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہیں۔“

”جانتی ہوتی بات فاطمہ کو کیوں نہیں سمجھائی، یاد رکھو زہرہ اگر فاطمہ نے مجھے قبول نہ کیا تو میں



تمہاری زندگی کو بھی جہنم بنا دوں گی۔“ شرہ کی آنکھوں میں ایسا پتا نہیں کیا تھا کہ زہرہ وہیں مجھد ہو کر رہ گئی۔ یہ بے بسی اور لاچارگی کی انتہا تھی کہ اس کی آنکھ اب ڈراؤنے خواب سے کھلتی تھی اور جو آنکھ کھل جاتی تو پھر نیند نہیں آتی تھی۔ شرہ کا خوف اس کے حواسوں پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ جانتی تھی۔ فاطمہ کا جواب کیا ہوگا اور اس کے بعد شرہ کا راری ایکشن کیا ہوگا، یہ بھی سوچ سوچ کر اس کی راتوں کی نیندیں اور دن کا سکون ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے یہ بات صفورہ کو بتانی چاہیے تھی، اس کے دل کا بوجھ کچھ تو کم ہو۔ صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی تھی۔ منہ دھو کر جب وہ نیچے آئی صفورہ اور وقار کہیں جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

”آپ کہیں جا رہی ہیں ماما۔“ وہ ان کے سامنے بیٹھے ہوئے پوچھنے لگی۔

”ہم گوجرانوالہ جا رہے ہیں۔ وقار کے دوست کی بیٹی کی شادی ہے۔“

”ماما اچانک، کل تو آپ نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”تو بیٹا اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے، ہم رات تک واپس آ جائیں گے۔“ اب کہ

وقار نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”زینت ہے اور شرہ بھی یہیں ہے۔“ وہ کیا کہتی، خاموش ہو کر وقار کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”چلو صفورہ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ، میں کار نکالتا ہوں۔“

”کیا بات ہے زہرہ، کوئی پریشانی ہے۔“ صفورہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”نہیں ماما۔“ وہ زبردستی سب ٹھیک ہے والی مسکراہٹ ہونٹوں پر لائی تھی۔

”وہ اچانک آپ کے جانے کا سنا تو تھوڑا سا پریشان ہو گئی۔“

”میرا کوئی موڈ نہیں تھا بیٹا، پھر تمہارے پاپا فورس کرنے لگے تو میں نے بھی سوچا صبح اتوار ہے، ہو ہی آتی ہوں، لیکن تم پریشان نہ ہو زینت یہیں

رہے گی اور شرہ کو منع تو کیا ہے، لیکن آج اس کی سہیلی کی بھی برتھ ڈے ہے وہ جائے گی، لیکن میں اسے فون کر دوں گی، وہ جلدی آ جائے گی۔“ شرہ گھر میں نہیں ہوگی، اس نے سکون کی سانس لیا تھا۔

”آپ اطمینان سے جائیں ماما، میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اب مسکرا کر بولی۔

”اوکے بیٹا۔۔۔۔۔ اللہ حافظ۔“ وہ اس کا ہاتھ چوم کر باہر نکل گئیں۔ صفورہ اور وقار کے جاتے ہی اس نے

سارے ہاتھ روم سے تیز اب کی بوتلیں نکال کر باہر تالی میں بہا دیں اور پھر مطہین ہو کر کچن میں آ گئی، آج اس کا ارادہ کوئی نئی ڈش ترائی کرنے کا تھا۔

پرفیم کی خوش گوار مہک پر اس نے سر گھما کر سڑھیوں کی طرف دیکھا، جہاں اپنی بھرپور تیاری کے ساتھ شرہ بیچہ اتر رہی تھی۔

”میں جا رہی ہوں، آتے ہوئے دیر ہو جائے گی۔“ اس نے زہرہ کو اطلاع دی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ شرہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا، جو کافی مطمئن تھی۔ حالانکہ اس کے خیال کے مطابق اسے پریشان ہونا چاہیے تھا۔

”تم کیا کر رہی آتی دیر۔“ شرہ نے موبائل چیک کرتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں، ٹی وی دیکھو گی اور پھر سو جاؤں گی، آپ کتنی دیر تک آئیں گی؟“

”پتا نہیں، میرا انتظار نہ کرنا، میں گیٹ کی دوسری چابی لے کر جا رہی ہوں۔“ وہ کہہ کر باہر نکل

گئی تو زہرہ نے گہرا سانس لے کر سر موڑ لیا۔

”آئی کھانا لگا دیں، پھر ہم دونوں اچھی سی چائے پیئیں۔“ اس نے کچن کی طرف ہانک

لگا کر زینت سے کہا تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے بھی اب وہ بور ہونے لگی تھی۔ زینت آنٹی کب کی وہیں

کارپٹ پر میٹرز بچھا کر سو گئی تھیں، وہی پورے گھر میں بے چینی سے کھوم رہی تھی، بارہ بجتے والے تھے،

نہ شرہ آنٹی تھی اور نہ ہی صفورہ اور وقار۔ اس نے پہلے شرہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس کا موبائل بند جا رہا تھا۔ اس

نے جھپٹا کر صفورہ کا نمبر ترائی کیا۔ وہاں تیل جا رہی تھی، لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھیں، پھر اس نے وقار کا نمبر ڈائل کیا، وہاں بھی تیل جا رہی تھی۔

”زہرا بھی خیال نہیں ان لوگوں کو میرا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پریشانی سے ٹھہرنے لگی۔ دس منٹ بعد اس کے موبائل پر تیل بجی تھی۔ وقار کا نمبر تھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔“ اس نے کہتے ہوئے جلدی سے فون آن کیا۔

”ہیلو پاپا۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”ہیلو بیٹی۔۔۔۔۔ میں اسپیڈ نواز بات کر رہا ہوں۔“

”جی۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”آپ کون بات کر رہی ہیں؟“

”میں۔۔۔۔۔ یہ میرے پاپا کا فون ہے۔“ وہ ہکا کر بولی۔

”دیکھیے یہاں ہائی وے پر گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے، جس میں ایک عورت اور ایک آدمی تھے۔“

زہرہ کی سانس ”تھتھ“ میں ہی انک گئی تھی۔

”یہ فون اسی آدمی کی جیب سے نکلا ہے، آخری کال آپ کی تھی۔“

”وہ دونوں اب کہاں ہیں۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”یہاں قریبی اسپتال میں انہیں ایڈمٹ کروا دیا ہے۔“ اس نے اسپتال کا نام بتایا۔

”آپ جلدی سے آ جائیں۔“

”جی۔“ اس نے فون رکھا تھا اور زمین پر بیٹھ کر اونچی آواز میں رونے لگی، زینت ایک دم گہرا کر

اٹھی تھی۔

”بے بی کیا ہوا بے بی۔“ وہ حواس باختہ ہو کر اس کی طرف بڑھی۔

”آئی ماما، پاپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔“

”ہائے میرے ربا۔“ زینت نے بے اختیار

اپنے دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”نہیں جانا ہے آئی۔“ وہ آنصاف کرتی

تیزی سے کھڑی ہوئی۔

”کیسے جائیں گے بچے، شرہ بیٹی بھی گھر میں

نہیں۔ زینت بھی پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں، وہ کانپتی آنکھوں سے شرہ کا نمبر ڈائل کرے لگی، لیکن اس کا نمبر ابھی بند تھا۔

”آئی! آئی! آپ کا نمبر بند ہے، اب کیا کروں۔“ وہ رورور کرے حال ہو رہی تھی۔

”بیٹا یہ وقت ضائع کرنے کا نہیں، اس وقت ہمارے ساتھ کسی مرد کا ہونا بہت ضروری ہے، ایسا

کر دے سامنے سے کسی کو بلا لو، زہرہ رک کر زینت کو دیکھنے لگی۔ اور دوسری نظر گھڑی پر ڈالی ساڑھے بارہ

ہور ہے تھے۔

”بیٹا کچھ مت سوچو، جلدی جاؤ۔“ وہ بھی ایک لمحہ

ضائع کیے بغیر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے تیل پر ہاتھ رکھا، دور تک آواز سنائی دی تھی۔ دو منٹ بعد

اس نے پھر تیل دی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اضطرابی انداز میں چکر بھی لگا رہی تھی، کچھ دیر بعد اسے ٹی وی

لاؤنچ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔ اس نے تیزی سے نکلے آنصاف کیے گیٹ کھولنے والا فاطمہ تھا۔

اس کو یوں آدھی رات کو آنسو سے تر چہرہ لیے دیکھ کر وہ پہلے حیران اور پھر پریشان ہو کر دیکھنے لگا۔

”کیا ہوا ہے۔“ فاطمہ نے اس کے پیچھے کھلے گھر کے گیٹ کو دیکھ کر پوچھا۔

”وہ ماما، پاپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، وہ دونوں اسپتال میں ہیں، اگر سفیان اگلے ہیں تو

پلیز انہیں چکا دیں۔“ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، پر آنسوؤں پر جیسے اسے قابو نہیں رہا تھا۔

”گھر میں کوئی نہیں، سب اسلام آباد گئے ہیں۔ زہرہ کے آنسوؤں میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

اس نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا، فاطمہ نے گہرا سانس لیا۔

”گھر لاک کر لو، میں کپڑے چننے کر کے آتا ہوں۔“ وہ اس کی نظروں کی زبان سمجھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے بھاگی تھی، زینت پہلے سے تیار بیٹھی تھی۔

”آئی آئی! لاک کرتے ہوئے اس نے زینت سے پوچھا۔



”چھوڑو بیٹا، جس ذمہ داری کا اس نے ثبوت دیا ہے اس کے بعد اسے بتانے کا کوئی فائدہ ہے جو ان جہان لڑکی رات کے ایک بجے تک گھر سے باہر ہے اور پھر سے موبائل آف، حد ہوتی ہے۔“ زینت آنٹی کو پریشانی میں اور غصہ آ رہا تھا۔ فاطر نے گاڑی باہر نکال کر اپنا گیت لاک کیا۔

”آنٹی آپ آگے بیٹھ جائیں۔“ ان دونوں کو آتا دیکھ کر فاطر نے کہا تو زہرہ اس کی لمبی چوڑی پشت دیکھ کر رہ گئی۔

”بہت مہربانی بیٹا اور بڑی معذرت چاہتے ہیں اتنی رات کو ہمیں تکلیف دی، پر کیا کرتے، ہم لوگوں کے علاوہ اور ان کا یہاں ہے کبھی کون۔ اگر ابھی نہ جاتے تو اس بے چاری بچی نے رو رو کر خود کو ہلکان کر لیتا تھا اور وہ بڑی اس کا تو کچھ پتا نہیں، آدھی رات کو کہاں ہے۔“ زینت آنٹی کو بولنے کا موقع ملا تھا، تو وہ بس شروع ہو گئی تھیں، جبکہ وہ پیچھے دیباں پڑھنے کے ساتھ مسلسل شہر کا نمبر بھی ملا رہی تھی۔ وہ مطلوبہ اسپتال پہنچے تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ صفورہ اور وقار کو کافی چوٹیں آئی تھیں۔ ان کی حالت دیکھ کر اسے خود پر قابو نہیں رہا تھا۔

”بے بی یوں نہیں روتے، اللہ کا شکر ادا کرو اس نے دونوں کی زندگی رکھ لی۔ زینت اسے ساتھ لگائے حوصلہ دینے لگیں، لیکن اس کو کسی پل قرار نہیں تھا۔ وہ دونوں اس وقت بے ہوش تھے۔

”آپ ان کے ساتھ ہیں۔“ نرس نے اس کے قریب آ کر پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ”وہاں ریسپشن یہ کچھ فارمیٹیز پوری کرنی ہیں اور ملے کرنا ہے، تاکہ ان کو روم میں شفٹ کیا جاسکے۔ نرس تو کہہ کر چلی گئی، لیکن وہ پریشان ہو کر زینت کا منہ دیکھنے لگی۔ گھر سے نکلنے وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے خیال ہی نہیں رہا کہ پیسوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔

”پیسے نہیں لائیں؟“ زینت اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گئی۔

”ہوش آیا انکل آنٹی کو؟“ تب ہی فاطر اندر آیا تھا۔

”نہیں بیٹا! ابھی نہیں، وہ نرس کہہ کر گئی ہے کچھ پیسے ادا کرنے ہیں، لیکن بے بی پیسے لانا بھول گئی ہے۔“ زہرہ کو اس وقت بے حد شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ وہ نظریں اٹھانے کے قابل نہیں رہی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں سب کلیئر کروں گا، میں باہر ہی ہوں، کوئی چیز چاہیے ہو مجھے بتا دیجیے گا، ویسے میں نے فخر کو بھی فون کر دیا ہے، وہ بھی جج پہنچ جائے گا۔“

”تمہاری بہت مہربانی بیٹا۔ تم تو ہمارے لیے مہربان فرشتہ بن کر آئے ہو، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش اور آباد رکھے۔“ آنٹی کی دعاؤں کا سلسلہ طویل ہو گیا تو وہ رخ موڑ کر ماما، پاپا کو دیکھنے لگی۔ صبح کیسے ہنستے مسکراتے گئے تھے اور اب کیسے زخموں میں چور پڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑا فون بجنے لگا۔ اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا، انجان نمبر تھا۔

”میں لاہور ماڈل ٹاؤن تھانے سے بات کر رہا ہوں۔ شہرہ وقار نامی لڑکی ہمارے پاس ہے۔ کیا آپ اسے جانتی ہیں۔“ زہرہ کو لگا اسپتال کی چھت اس کے سر پر آگری ہے، وہ ایک دم لڑکھرائی تھی۔ کسی سہارے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا۔ فاطریات تو زینت سے کر رہا تھا پر اس کی نظریں اسی پر تھیں، اس نے زہرہ کے چہرے کے بدلتے رنگ اور پھر اسے لڑکھراتے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ زہرہ کو لگا وہ بہت زور سے گرے گی، لیکن کسی نے بڑی مضبوطی سے اسے تھام لیا تھا۔ اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے کھولیں، تاکہ نظروں کے سامنے کا اندھیرا چھٹ جائے اور اندھیرا چھٹے ہی فاطر کا چہرہ اتنے قریب سے نظر آیا کہ وہ بے اختیار رچل کر اس کے بازوؤں سے لگی۔

”کیا ہوا بے بی۔“ زینت بھی حواس باختہ ہو کر اس کے قریب بیٹھ گئیں، لیکن وہ کچھ کہنے کے

بجائے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ فاطر نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے جوا سے کہا گیا وہ اسے بھی پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

”اوکے، میں آتا ہوں۔“

”کیا ہو گیا بیٹا۔“

”آنٹی! شہرہ پولیس اسٹیشن میں ہے۔“

”اللہ۔“ زینت دل تھام کر بیٹھ گئی، آج تو لگتا تھا حد ہموں کا دن تھا۔

”پر کیوں بیٹا۔“ زہرہ کے دل کا سوال زینت نے کیا تھا۔

”وہ اپنی دوستوں کے ساتھ ڈرگ لیتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔“

”تو تو۔“ زینت نے باقاعدہ اپنے گال پیٹے۔

”یہ لڑکی تو اپنے ماں باپ کے لیے وبال ہے۔“ آنسو کرتے ہوئے انہوں نے زہرہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ جواب گھٹنوں میں سر دے سک رہی تھی۔

”بس..... بچی تو رو رو کر خود کو ہلکان کر رہی ہے۔ ماں باپ کی زندگی تندرستی کے لیے دعا کر۔“

پھر جو کوئی کسی کے لیے برا چاہتا ہے اللہ پھر اسے اسی برائی میں ملوث کر دیتا ہے۔ شہرہ، زہرہ کو کتنا تنگ کرتی تھی یہ تو سب جانتے تھے۔

”آنٹی آپ اس کا دھیان رکھیں۔ میں نے فخر کو فون کر دیا ہے وہ بھی صبح تک پہنچ جائے گا۔ میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔“

”جگ جگ جیو بیٹا۔“ فاطر نے ایک نظر اس کے ہلتے وجود پر ڈالی اور تیزی سے مڑ گیا۔

☆ ☆ ☆

صفورہ اور وقار کو ہوش آ گیا تھا اور انہیں پرائیویٹ کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

”زہرہ اس طرح رو کر تم مجھے پریشان کر رہی ہو، دیکھو میں اور تمہارے پاپا اب ٹھیک ہیں۔“ صفورہ نے اس کے بال سہلائے جو ان کے سینے پر سر رکھے کب سے سک رہی تھی۔

”زہرہ! وقار کی آواز پر اس نے سر اٹھایا۔

”جی پاپا۔“ وہ کھڑی بھی ہو گئی تھی۔

”ہم ٹھیک ہیں، بیٹا اب روتا بند کرو، شاہاش۔“ زہرہ نے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں اور گالوں کو صاف کیا تھا۔

”شہرہ نظر نہیں آ رہی۔“ وقار کے سوال پر اس نے بوکھلا کر زینت کو دیکھا۔

”وہ آنے والی ہے بھائی صاحب، دفتر ہوتا ہے تا اس کا وہاں اطلاع دینی بھی ضروری تھی۔“

”اچھا۔“ وہ دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

”السلام علیکم۔“ سلام کر کے اندر داخل ہونے والا فخر تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت سی لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔

”کیسی ہیں آنٹی۔“

”ٹھیک ہوں بیٹا، تم یہاں کیسے۔“

”مجھے فاطر کا رات کو فون آیا تھا۔ ہم اسلام آباد میں تھے۔ اطلاع ملتے ہی میں سیدھا ادھر آ گیا۔“ صفورہ نے نمونہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بیٹا میں تمہارا اور فاطر کا احسان کیسے چکا سکوں گی، مجھے زینت نے بتایا کیسے آدھی رات کو وہ بچہ اپنی نیند خراب کر کے یہاں آیا، پردہ مجھے نظر نہیں آیا۔“ فخر نے بھی سوالیہ نظروں سے زہرہ کو دیکھا تو وہ نظریں چرا کر خواہ مخواہ وقار کی دوا میں دیکھنے لگی۔

”یہ کون ہے۔“ صفورہ نے خاموش کھڑی اس لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

”آنٹی یہ طوطی ہے، میری کو لیگ، میں نے اسے بتایا کہ میرے انکل، آنٹی اسپتال میں ہیں، تو یہ بھی آپ کی عیادت کے لیے آ گئی۔“

”شکر یہ بیٹا آپ کا۔“ صفورہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”پلیز آنٹی، مجھے شرمندہ مت کریں، فخر آپ سب کا خاص طور پر زہرہ کا بہت ذکر کرتے ہیں، تو میں نے سوچا آپ لوگوں کی عیادت کے ساتھ میں زہرہ سے بھی مل لوں گی۔“ زہرہ نے حیرت سے فخر کو



دیکھا، جو اس کی حیرت دیکھ کر مسکرا دیا تھا۔  
”السلام علیکم!“ کی آواز پر سب نے  
دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سفیان، صائمہ اور  
عفرا کھڑے تھے۔

”آپ لوگوں نے تو ڈراما بجا بھی۔“ سفیان  
نے ہاتھ میں پکڑی باسکٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔  
”اتنی رات کو سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی  
صفورہ۔“ صائمہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”مجھے زہرہ کی فکر تھی، وہ اسکیلے میں ڈرتی ہے،  
اسی لیے رات کو نکل پڑے۔“ جبکہ زہرہ ان کے  
بچائے عفرا کو دیکھ رہی تھی۔ عفرا جو اسے اگور کر رہی  
تھی۔ اس کے لیے اب مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے  
نظریں گھما کر زہرہ کو دیکھا جو آنکھوں میں آنسو لیے  
بڑی آس سے اسے دیکھ رہی تھی۔ عفرا کو صرف ایک  
لمحہ لگا تھا گلے لگے وہ زہرہ کے گلے لگ گئی۔

”یہ تم دونوں کو کیا ہوا ہے، ایسے گلے لگ کر رو  
رہی ہو جیسے کب کی پکڑی ہو۔“ عفرا نے مذاق کیا تھا،  
لیکن وہ دونوں تو جانتی تھیں، وہ کب کی پکڑی ہیں۔

☆☆☆

”جینکس کہ تم آگے۔ اتنی گندگی تھی وہاں، تے  
آ رہی تھی مجھے۔“ گاڑی میں بیٹھتے ہی شمرہ نے بالوں  
میں برش کرتے ہوئے پڑی اداسے فاطمہ کو دیکھا۔  
”مجھے امید نہیں تھی تم آؤ گے۔“ اسے مسلسل  
خاموش دیکھ کر وہ دوبارہ بولی۔

”تم بات کیوں نہیں کر رہے۔“ آخر اس سے  
رہا نہیں گیا، تو وہ منہ بنا کر بولی۔

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے، تمہیں اپنے  
کرتوؤں پر کوئی شرمندگی نہیں۔“

”واٹ کر توت۔“ وہ ایک دم بھڑک کر بولی۔  
”ان لوگوں کو غلط فہمی ہوتی تھی۔“

”یہ تو غلط فہمی تھی، لیکن آدھی رات کو تمہارا باہر  
رہنا یہ بھی غلط فہمی ہے، کیا شریف لڑکیوں کو زیب دینا  
ہے کہ وہ ایک رات پولیس اسٹیشن میں گزریں۔“  
اب کے شمرہ کو گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

”ایسا پہلی بار ہوا ہے، میں تو کبھی رات کو باہر  
نکل ہی نہیں اور میری دوستیں ایسی ہیں، مجھے پتا ہی  
نہیں تھا۔“ وہ ایک دم بھولی بن کر بولی، لیکن فاطمہ  
نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”یہ راستہ گھر کو تو نہیں جاتا۔“ وہ ارد گرد دیکھتے  
ہوئے بولی۔

”ہم اسپتال جا رہے ہیں۔“  
”کیوں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”انکل، آئی کا ایکڈنٹ ہو گیا تھا۔“  
”کب۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”جب تمہارا فون آف تھا۔“ وہ طنز کرنا نہیں  
چاہتا تھا، پر اسے اس لڑکی کی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔

”وہ اب ٹھیک ہیں۔“  
”پتا نہیں، میں نہیں لینے آ گیا تھا۔“

”یعنی اس کو میری فکر ہے۔“ وہ دل میں  
مسکرائی، اپنے آگے اسے اپنے ماں، باپ کی

خیریت کی بھی پروا نہیں تھی۔  
”مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

شمرہ نے چہرہ اس کی طرف گھما کر کہا۔  
”زہرہ نے تم سے بات کی ہوگی؟“

”کون سی بات؟“ وہ سیدھا دیکھتے ہوئے  
بولا۔ شمرہ کو اس کی بے نیازی پر غصہ تو بہت آیا، پر اس

وقت وہ غصہ نہیں کر سکتی تھی۔  
”یہی کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم سے

شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ فاطمہ کا پاؤں بے ساختہ  
پر یک پر گیا تھا۔ وہ اچانک جھٹکے کے لیے تیار نہیں

تھی۔ اس کا سر سیدھا ڈنٹس بورڈ سے ٹکرایا۔  
”واٹ رش۔“ وہ سر پکڑ کر چیخی۔

”یہی میں کہنے والا تھا واٹ رش۔“ اب  
کے فاطمہ نے ماتھے پر ہیل ڈال کر اسے دیکھا۔

”رش۔“ یہ سمجھیں رش لگ رہا ہے، ایک  
لڑکی خود تمہیں پروپوز کر رہی ہے، وہ بھی اتنی خوب

صورت لڑکی۔“  
”تم سے کس نے کہا، تم خوب صورت ہو، خوب

صورت وہ ہوتا ہے جس کا باطن بھی خوب صورت ہو،  
جبکہ تم ایک بدتمیز خود پسند اور مطلبی لڑکی ہو، جس کو کم از کم  
میں تو بالکل پسند نہیں کر سکتا اور شادی نہور۔“ کہہ کر اس  
نے کار اشارت کر دی، اب کی بار اس کی اسپنڈ بہت تیز

تھی۔ وہ جلد از جلد اس سے نجات چاہتا تھا۔  
”تو تمہارے نزدیک خوب صورت کون

ہے۔“ کچھ دیر بعد اس نے شمرہ کی آواز سنی۔  
”میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”لیکن میں جانتی ہوں تمہارے نزدیک زہرہ  
خوب صورت ہے۔ مگر بڑے افسوس کا مقام ہے

تمہارے لیے کہ اس نے تمہیں رجحیک کر کے کسی  
اور کو پسند کر لیا۔“ شمرہ نے اسے اشتعال دلانے کے

لیے طنز یہ انداز اختیار کیا تھا۔ وہ خاموش رہا تھا۔  
”تم لوزر ہو۔“ وہ دوبارہ بولی، لیکن اس بار بھی

وہ ری ایکٹ کیے بغیر کار چلاتا رہا۔ اسپتال کے  
سامنے اس نے کار روکی۔

”آؤٹ۔“ اس ایک لفظ میں اس کے لیے اتنی  
حقارت تھی کہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کر

ڈالے، وہ بہت غصے میں کار سے اتری تھی۔ کار ڈور  
میں چلتے ہوئے اس نے زہیب کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

”ہیلو زہیب، شمرہ بات کر رہی ہوں۔“  
☆☆☆

عفرا کی ناراضی ختم ہوئی تو اسے لگ رہا تھا  
جیسے سب صحیح ہو گیا، شمرہ کا ڈور بھی جیسے کہیں جا سویا

تھا۔ اپنی خوشی میں اس نے شمرہ کا عجیب انداز نوٹ بھی  
نہیں کیا۔ صفورہ اور وقار کو ڈس چارج کر دیا گیا تھا۔ وہ

ان کی چیزیں سمیٹ رہی تھی جب خیر اندر آیا۔  
”وہ واٹ روم کی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں پارکنگ میں انتظار کر رہا  
ہوں، تم آئی کو لے آنا، سامان یہیں چھوڑ دو فاطمہ

آ رہا ہے، وہ لے آئے گا۔“  
”جی۔“ وہ سر ہلا کر باقی چیزیں اکٹھی کرنے

لگی۔ دروازہ بند ہونے پر اس نے سرسری نظر پیچھے  
ڈالی، جہاں شمرہ بازو پیچھے موڑے دروازے سے

ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

”آئی آپ کی نہیں۔“ وہ صفورہ کی چادر طے  
کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگی۔

”جانے کی باری تمہاری ہے۔“ چادر طے کرتا  
زہرہ کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ شمرہ دو قدم چل کے

آگے آ گئی تھی۔  
”میں نے تم سے کہا تھا نا اگر تم نے مجھ سے جھوٹ

بولایا فاطمہ نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کیا تو میں  
تمہاری زندگی جہنم بنا دوں گی۔“ اس کی آنکھوں میں اتنی

نفرت تھی کہ زہرہ گھبرا کر پیچھے ہٹنے لگی۔  
”آئی پلیز میری بات سنیں، اس میں میرا کوئی

قصور نہیں۔“  
”قصور صرف تمہارا ہی ہے۔ فاطمہ کو لگتا ہے تم

خوب صورت ہو۔“ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولی۔  
”تم ساری عمر مجھ سے پیچھے رہیں اور اچانک

سب کو گلے لگا ہے تم خوب صورت ہو، زہیب نے  
تمہیں پسند کیا، فاطمہ نے تمہیں پسند کیا، حالانکہ میں

تم سے زیادہ خوب صورت ہوں، پھر کوئی مجھے چھوڑ کر  
تمہیں کیسے پسند کر سکتا ہے۔“ ماما کی اچھی بیٹی صرف تم

ہو اور میں، میں کچھ نہیں، پاپا کو مجھ سے پیار تھا، وہ بھی  
اب تم سے پیار کرنے لگے ہیں۔ تم میری بار ہو اور

ہارنا مجھے پسند نہیں، یہ جو تمہارا چہرہ ہے تا میں اسے اتنا  
بھیا نک بنا دوں گی، سب تم سے نفرت کریں گے۔“

وہ بازو آگے کرتے ہوئے بولی۔ اس کے ہاتھ میں  
تیزاب کی بوتل تھی۔ دہشت کے مارے زہرہ کی

آنکھیں پھیل گئی تھیں۔  
”آئی پلیز۔“ اسے بڑھتا دیکھ کر وہ بری طرح

چپنے لگی تھی۔  
”زہرہ۔“ اس کی آواز سن کر صفورہ گھبرا کر

واٹ روم سے نکلی تھیں۔  
”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ انہوں نے حیرت سے

دونوں کو دیکھا۔  
”ماما پلیز۔“ مجھے بچالیں، آئی مجھے تیزاب

سے جلانا چاہتی ہیں۔“ حیرت کے مارے صفورہ کا



منہ کھل گیا تھا۔

”دامخ ٹھیک ہے تمہارا شرہ، پاگل تو نہیں ہو گئیں۔“ صفورہ جلدی سے آگے بڑھیں۔

”وہیں رک جائیں ماما، ورنہ میں آپ کا بھی لحاظ نہیں کروں گی۔“ اس نے بوتل کا ڈھکن کھولتے ہوئے کہا۔

”شرہ میری بیٹی! پاگل نہ بنو، ایسے بھی کوئی کرتا ہے، یہ تمہاری بہن ہے۔“

”نہیں ہے یہ میری بہن۔“ صفورہ بھاگنے کے انداز میں آگے آئیں تو شرہ نے بوتل کو بلاک سا جھٹکا دیا۔ تیزاب اچھل کر باہر آیا تھا۔ صفورہ اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئیں، جبکہ زہرہ بری طرح چیختے لگی تھی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا۔ فاطمہ نے حیرت سے اندر کے منظر کو دیکھا۔

”فاطمہ پکڑو اسے، اس کے ہاتھ میں الیڈ ہے۔“ فاطمہ نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے بازوؤں سے مضبوطی سے تھام لیا۔

”چھوڑو مجھے، میں تمہیں بھی جلا دوں گی۔ وہ اس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کے لیے بری طرح پھٹنے لگی۔ صفورہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر زوردار چھڑا کر شرہ کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کو جیسے اسٹاپ لگ گیا تھا۔ صفورہ نے اس کے ہاتھ سے بوتل لینی چاہی، تب ہی وہ ایک بار پھر بجلی، تیزاب اچھل کر اس کی ٹانگ اور پاؤں پر بہتا چلا گیا۔ اس کے منہ سے دل خراش چیخ نکلی تھی اور فاطمہ نے بے ساختہ اسے چھوڑا تھا۔ وہ اب زمین پر گر کر بری طرح تڑپ رہی تھی۔

صفورہ بے تاب ہو کر اس کی طرف جھکیں، جبکہ فاطمہ گھبرا کر باہر ڈاکٹر کو بلانے بھاگا تھا۔ آنکھیں اور منہ کھولے زہرہ جیسے ساکت ہو گئی اور اگلے ہی بل وہ زمین پر ڈھیر ہوئی گی۔

☆☆☆

”ان دونوں نے مجھے میری بہن کے آگے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ صائمہ نے ناراض نظروں سے سامنے بیٹھے فخر اور فاطمہ کو دیکھا۔

☆☆☆

”ان دونوں نے مجھے میری بہن کے آگے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ صائمہ نے ناراض نظروں سے سامنے بیٹھے فخر اور فاطمہ کو دیکھا۔

”یہ کوئی زبردستی والی بات تو نہیں صائمہ بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔“ سفیان نے ٹھنڈے لہجے میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا آپ پوچھ سکتے ہیں انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“ سفیان صاحب نے فخر کو بولنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کیا۔

”ماما اس دن اسپتال میں..... میں نے آپ کو طوبی سے ملوایا تھا، میں اس کو پسند کرتا ہوں۔“

”دیکھا دیکھا آپ نے۔“ صائمہ نے غصے سے سفیان کو دیکھا۔

”ریلیکس صائمہ۔“ سفیان نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔

”دیکھو صائمہ اس میں کوئی حرج نہیں، طوبی سے میں ملا ہوں، وہ اچھی لڑکی ہے۔ ڈاکٹر ہے اور اچھی طبی سے ہے اور کیا چاہیے ہمیں اور سب سے ضروری بات تمہاری بھانجیوں کی بات طے ہو گئی ہے، پھر کیوں تم اپنے بیٹے کی خوش خراب کرنا چاہتی ہو۔“

”میری بہن ناراض ہے مجھ سے۔“

”کتنی دیر ناراض رہے گی، مان جائے گی، تم بس اپنے بچوں کی فکر کرو، ہم کل ہی جائیں گے، طوبی کے گھر رشتہ لینے کے لیے..... کیوں فخر ٹھیک ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر فخر سے پوچھا، جس نے انگوٹھے سے انہیں تھینک لیا کیا تھا۔

”اب جب آپ باپ بیٹے فیصلہ کر چکے ہیں تو میری ہاں ناکی کیا ضرورت ہے۔“

”ماما آپ کی مرضی میرے لیے بہت اہم ہے۔“ فخر نے انہیں بازو کے گھیرے میں لیا تو وہ کچھ بول نہیں سکیں۔

”اب اس سے بھی پوچھ لیں نفیقہ اس نے بھی کوئی پسند کر رہی ہوگی۔“ انہوں نے فاطمہ کی طرف اشارہ کیا جو سر جھکا کر کسی سوچ میں گم تھا۔

”فاطمہ بولو یار..... اچھا موقع ہے، چپ رہے تو پھر ماں کی پسند پر ساری عمر ٹھٹھکا پڑے گی۔“ سفیان نے مذاق کیا تھا، دوسرا اٹھا کر انہیں دیکھنے لگا۔

”نی الحال آپ فخر کے بارے میں سوچیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔

☆☆☆

جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ذہیب اور اس کی والدہ خاموش سر جھکائے بیٹھے تھے۔ وہ سلام کرتی ہوئی ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے پریشان نظر اپنے ماں باپ کے اترے ہوئے چہروں پر ڈالی۔

”ہم نے بہت چاہت سے یہ رشتہ کیا تھا۔“ ذہیب کو گلہ تھا زہرہ جیسی لڑکی شاید ہی اس دنیا میں ہو، لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کی ایسی پرورش کی ہے۔“

”ایک بیٹی آپ کی ڈرگ کیس میں حوالا ت رہ کر آئی ہے۔ دوسری کا کسی اور سے چکر ہے اور حد تو یہ کہ آپ لوگ انہوں کو ہی تیزاب سے جھلسا دیتے ہیں، ہمیں تو آپ لوگ معاف رہیں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔“ ذہیب کی والدہ نے غصے سے ان تینوں کو دیکھا۔

”آپ لوگ غلط سمجھ رہے ہیں۔“ زہرہ کو ہی ہمت کر کے بولنا پڑا۔

”ابھی بھی تم میں اتنی ہمت ہے زہرہ! کہ تم ہمیں غلط کہو، میں خود گواہ ہوں تمہارے رویے کا، اگر واقعی تم اس منگنی سے خوش ہوتیں تو تم مجھ سے یوں کچھ کچھ نہ ریتیں اور تمہاری بہن کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی اور سب سے بڑی بات انسان تکلیف میں ہمیشہ اسے یاد کرتا ہے، مجھے وہ کچھ سمجھتا ہے۔ اگلے، آنٹی کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر تم مجھے بھی فون کر سکتی تھیں، لیکن نہیں، تم سیدی اس کے پاس دوڑی گئیں، کیوں؟ کچھ تھانا جو تم اتنے مان سے اس کے پاس گئی تھیں، میں کچھ بھی پروا نہ کر سکتا ہوں، لیکن دل کی شراکت نہیں، میں یہ رشتہ ابھی اور اسی وقت ختم کر رہا ہوں۔“ اس نے انگوٹھی نمیل پر رکھ دی۔ زہرہ نے پریشانی سے اپنے ماں باپ کو دیکھا۔

”میری بات سنیں آنٹی۔“ وہ اپنی انداز میں ان کی طرف بڑھی۔

”رکوز ہرہ۔“ وقار نے اونچی آواز میں اسے پکارا۔

”کوئی ضرورت نہیں، کسی کو کوئی وضاحت دینے کی، تم کیا ہو، ہم بہت اچھی طرح جانتے ہیں اور جس شخص کو تم برا بھلا کہتی ہیں اس کے ساتھ ساری زندگی کیسے نبھاؤ گی، کتنی بار وضاحت دو گی۔ ہماری طرف سے بھی یہ رشتہ ختم، آپ لوگ جاسکتے ہیں۔“ دونوں ماں، بیٹیوں نے جتنی نظر اس پر ڈالی اور چلے گئے۔ صفورہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

”ماما۔“

”رو تے نہیں بیٹا، اس میں کوئی بہتری ہی ہو گی۔“ صفورہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

”تمہارا دامخ ٹھیک ہے عفرہ۔“ صائمہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

”ماما اس میں غلط کیا ہے۔“

”تمہیں تو کبھی غلط لگے گا نہیں، کیونکہ وہ تمہاری دوست ہے، لیکن تمہاری دوستی کے لیے میں فاطمہ کی زندگی خراب نہیں کر سکتی، اس کی منگنی ٹوٹی ہے، اللہ جانے کیا عیب دیکھے ہیں ان لوگوں نے جو اتنی چاہت سے کی ہوئی منگنی توڑ دی اور وہ اس کی بہن وہ تو دامخ مر بیٹھ ہے، مجھ سے تو یہ امید بالکل نہیں رکھنا۔“ عفرہ نے شکایتی نظر خاموش بیٹھے فاطمہ پر ڈالی۔

”تم نے رشتہ نہیں کرنا تو نہ کرو صائمہ! میری بہن کے بارے میں غلط الفاظ استعمال نہ کرو، ہم بچپن سے اس بچی کو جانتے ہیں اور اس کے اچھے کردار کے گواہ ہیں ہم۔“ سفیان کو ان کا انداز بہت برا لگا تھا۔

”جو بھی ہے، میں نے فاطمہ کے لیے ایک لڑکی دیکھ رکھی ہے۔“

”پاپا آپ اور ماما کی طرف جارہے ہیں میرا پرد پوزل لے کر۔“

”فاطمہ۔“ صائمہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”اور ماما مجھے ہر صورت میں ہاں چاہیے، آپ سمجھ رہی ہیں نا۔“ وہ کہہ کر اٹھ گیا تھا، جبکہ وہاں بیٹھے سفیان، فخر، صائمہ تینوں حیران تھے، صرف عفرہ ہی



جو مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے ساتھ معجزے ہوتے ہیں، لیکن آج جب اس کے ساتھ معجزہ ہوا تھا تو وہ بے یقین تھی، وہ زہرہ دقار سے سبز ہرہ فاطمہ بن گئی تھی، لیکن بے یقینی بے یقینی تھی۔ عفر اور اس کی ایک کزن اسے اس کی طرف لے کر جا رہے تھے۔ اس نے ذرا سی نظر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ وہ شان دار شخص جو اس کے لیے ہمیشہ ایک تمنا تھا۔ آج اس کا ہو چکا تھا۔ ابھی اسی لمحے میں محسوس ہوا کہ وہ اس سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ جسے خود سے چھپاتے چھپاتے وہ خود زخمی ہو گئی تھی۔ اس کے پہلو میں بیٹھتے ہی دل نے جو دھڑکننا شروع کیا تو اس کی آواز اسے اپنے کانوں میں سنائی دینے لگی، وہ سرشار سی بیٹھی تھی۔ اپنے ساتھ ساری دنیا اسے خوش لگ رہی تھی، لیکن تھوڑی دیر بعد یہ خوشی ماند پڑنے لگی تھی۔ ان کے ساتھ فخر اور طوطی کا بھی نکاح تھا، وہ دونوں کتنے خوش تھے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد فخر بھائی ایک رومانٹک سا جملہ کہہ دیتے تھے اور طوطی کی کلکھلائی ہنسی سنائی دیتی، لیکن اس کے ساتھ بیٹھی اس کی محبت شاید پتھر ہو چکی تھی۔ وہ اس سے بے نیاز تھا اور اگر محبت نہیں تھی تو نکاح کیوں کیا، کی سوال اس کے دل میں تھی۔

☆☆☆

”کچھ چاہیے تھا آپ۔“ اسے بیڈ سے اٹھتے دیکھ کر وہ رک گئی تھی۔

”ہاں وہ بس کتاب لینی تھی۔“ شرہ نے سامنے شلیف کی طرف اشارہ کیا۔ زہرہ اس کی مطلوبہ کتاب بے کراس کے پاس آ گئی اور اس کی ٹانگ دیکھنے لگی۔

”آج آپ نے کریم نہیں لگائی نا۔“ وہ کریم کا ڈھکن کھول کر کریم اس کی ٹانگ پر لٹنے لگی۔

”اب آپ کا زخم کافی بہتر ہو گیا ہے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ گردن اٹھا کر اسے دیکھا تو کریم لگا تا اس کا ہاتھ رک گیا۔

”آپ کیا ہوا؟ درد ہو رہا ہے۔“ اسے روٹا دیکھ

کر وہ فوراً کھڑی ہوئی تھی۔ ”نہیں“ شرہ نے سر میں ہلا کر اسے اپنے قریب بیٹھایا۔

”میں اپنے رویے پر رورہی ہوں زہرہ! میں نے تمہیں بہت دکھ دیے ہیں، میں حسد میں اندھی ہو گئی تھی کہ بھول گئی، تم میری اپنی بہن ہو، مجھ سے اتنا پیار کرتی ہے۔“

”برائی باتیں چھوڑیں آپ۔“

”نہیں بھولنا کچھ بھی زہرہ، میں نے ماما، پاپا سے بھی اتنی بدتمیزی کی اور دیکھو ان کا دل دکھانے کی سزا میں نے اپنی جگہ سی ہوئی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

”ماما، پاپا آپ سے بہت پیار کرتے ہیں آپ اور انہوں نے بھی آپ کو بددعا نہیں دی۔“

”جانتی ہوں، لیکن اللہ کو تو دل دکھانا پسند نہیں۔“ وہ گھر اسانس لے کر بولی۔

”تم مجھے معاف کر دینا زہرہ۔“

”آپلی پلزز ایسی باتیں نہ کریں، میں آپ سے بالکل بھی ناراض نہیں۔“

”پتا ہے زہرہ تم واقعی بہت خوب صورت ہو عفر اب جھنجھلا کر بولی تو زہرہ نے دوبارہ گلاس ڈور اسی لیے تو تمہیں فاطمہ جیسا شریک حیات ملا۔“ وہ جو کہ مسکرا کر شرہ کو دیکھ رہی تھی۔ فوراً سر جھکا گئی آنسو چھپانے کے لیے۔

”آپ آپ زیادہ خوب صورت ہیں، اسی لیے تو فاطمہ کے دوست کی تم نے آپ کو پسند کر لیا ہے۔“

فاطمہ آئے تھے ماما، پاپا سے بات کرنے، میں نے دیکھی ہے تصویر بڑے پیڈم ہیں بابر بھائی آرہے ہیں میں میں شرہ مسکراتے مسکراتے چپ ہو گئی۔

”کیا ہوا آپ۔“ آپ کو پسند نہیں آیا۔“

”کیا انہیں میرے اس زخم کا پتا ہے، کیا انہیں پتا ہے میری ٹانگ اتنی بھدی نظر آتی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں آپ، ہم نے کچھ نہیں چھپایا اور فاطمہ نے انہیں پوری سلی دی ہے۔“

”میں پھر کہوں گی زہرہ تم بہت لگی ہو، جس طرح کی تم ہو اسی طرح کا فاطمہ ہے، اسی لیے کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنے ہیں، میں نے تم لوگوں

کا الگ کرنے کی کتنی کوشش کی، لیکن دیکھو اللہ کو تم کوں کا ساتھ منظور تھا۔“

”آپ اب آرام کریں آپ، پرسوں وہ لوگ آپ کو دیکھنے آرہے ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھپتھا کر اندھی ہو گئی تھی کہ بھول گئی، تم میری اپنی بہن ہو، مجھ سے اتنا پیار کرتی ہے۔“

☆☆☆

”تمہیں کیا ہوا ہے، منہ پر بارہ کیوں بن رہے ہیں؟“ وہ ایک ٹک سامنے دیکھ رہی تھی، جب عفر

بھی اتنی بدتمیزی کی اور دیکھو ان کا دل دکھانے کی سزا میں نے اپنی جگہ سی ہوئی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

”ماما، پاپا آپ سے بہت پیار کرتے ہیں آپ اور انہوں نے بھی آپ کو بددعا نہیں دی۔“

”جانتی ہوں، لیکن اللہ کو تو دل دکھانا پسند نہیں۔“ وہ گھر اسانس لے کر بولی۔

”تم مجھے معاف کر دینا زہرہ۔“

”آپلی پلزز ایسی باتیں نہ کریں، میں آپ سے بالکل بھی ناراض نہیں۔“

”پتا ہے زہرہ تم واقعی بہت خوب صورت ہو عفر اب جھنجھلا کر بولی تو زہرہ نے دوبارہ گلاس ڈور اسی لیے تو تمہیں فاطمہ جیسا شریک حیات ملا۔“ وہ جو کہ مسکرا کر شرہ کو دیکھ رہی تھی۔ فوراً سر جھکا گئی آنسو چھپانے کے لیے۔

”آپ آپ زیادہ خوب صورت ہیں، اسی لیے تو فاطمہ کے دوست کی تم نے آپ کو پسند کر لیا ہے۔“

فاطمہ آئے تھے ماما، پاپا سے بات کرنے، میں نے دیکھی ہے تصویر بڑے پیڈم ہیں بابر بھائی آرہے ہیں میں میں شرہ مسکراتے مسکراتے چپ ہو گئی۔

”کیا ہوا آپ۔“ آپ کو پسند نہیں آیا۔“

”کیا انہیں میرے اس زخم کا پتا ہے، کیا انہیں پتا ہے میری ٹانگ اتنی بھدی نظر آتی ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں آپ، ہم نے کچھ نہیں چھپایا اور فاطمہ نے انہیں پوری سلی دی ہے۔“

”میں پھر کہوں گی زہرہ تم بہت لگی ہو، جس طرح کی تم ہو اسی طرح کا فاطمہ ہے، اسی لیے کہتے ہیں جوڑے آسمانوں پر بنے ہیں، میں نے تم لوگوں

اکٹھے کر رہے ہیں۔ ہم بھی شادی کی شائنگ کرنے آئے ہیں، لیکن دیکھو کیسے میں یہاں اکیلی اور وہ وہاں سب کے ساتھ دانت نکالتے ہوئے۔“ آخر میں روتے روتے وہ دانت پیس کر بولی تو پریشانی میں بھی عفر کو ہنسی آ گئی۔

”ہاں ہنسو، تمہیں تو ہنسی آئے گی اپنے بھائی کی بہن جو ہو۔“

”اولیٰ کی بھائی سے زیادہ میں تمہاری دوست ہوں۔“

”تم نے کیا زبردستی انہیں مجھ سے نکاح کرنے پر مجبور کیا تھا۔“ زہرہ نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

”تو بہرہ بھائی کو جانتی ہو نا، کون انہیں مجبور کر سکتا ہے۔“ میں پوچھوں بھائی سے۔“

”پاکل ہوئی ہو۔“ زہرہ نے ایک دم گھبرا کر اس کا بازو تھاما۔

”مجھے کچھ نہیں پوچھنا، تم چلو میرے ساتھ۔“ آپلی کی منگنی کے لیے ڈریس پہن کر تھامے۔“

”زہرہ کچھ کھاؤ گی۔“ وہ طوطی کو گھر چھوڑ کر واپس جا رہے تھے۔ جب فخر نے اس سے پوچھا۔

”نہیں بھائی، مجھے بھوک نہیں۔“ اس کے کہنے کی دیر بھی، فاطمہ نے گاڑی برگر شاپ پر روک دی، زہرہ نے شکایتی نظروں سے عفر کو دیکھا۔

”دیکھا۔“ اس نے نظروں سے کہا۔ فاطمہ کے اترتے ہی عفر ابھی اتر گئی تھی۔

”بھائی۔“

”ہاں۔“ وہ سر کر کے دیکھنے لگا۔

”ان کو کیا ہوا۔“ فخر نے حیرت سے اپنے بہن، بھائی کو دیکھا۔

”میں آتا ہوں زہرہ۔“ وہ بھی باہر نکل گیا، جبکہ زہرہ زوہاسی ہو کر رہ گئی، یقیناً عفر اب کمزور سب اگل دے گی، وہ پریشانی سے انگلیاں ملنے لگی۔

”آپ کے ساتھ پرالم کیا ہے، کیوں آپ زہرہ کے ساتھ ایسے ہی بیو کر رہے ہیں۔“



”میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ کندھے اچکا کر پوچھنے لگا۔ فریحی قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

”زہرہ کے ساتھ نکاح آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے، پھر آپ ایسے کیوں بی ہو کر رہے ہیں، جیسے آپ نے مجبوری میں نکاح کیا ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے عفر، فاطمہ اتنا روڈی بی ہو کر رہے ہو اس سے، وہ پہلے ہی تم سے ڈرتی ہے۔“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”وہ مظلوم نہیں، معصوم ہے۔“

”ہاں اتنی معصوم ہے کہ میرے پروپوزل کے باوجود اس نے کسی اور سے منگنی کر لی۔“

”بھائی۔“ عفرانے ماتھا پیٹ لیا۔

”میں بتا چکی ہوں آپ کو کس طرح ایسے تارچر کیا تھا شمرہ آپ نے، وہ آپ کو پسند کرتی تھی، کرنی ہے اور اب آپ کی بیوی ہے تو مرتے دم تک آپ سے محبت کرتی رہے گی۔“

”مجھے ابھی بدلہ لینا ہے، کیونکہ اس نے میری محبت کی انسلٹ کی ہے۔“ اب کی بار وہ دھیمابولا تھا۔

”فاطمہ غلط کر رہے ہو، تمہاری طرف سے جو محبت تھی وہ اس سے ناواقف تھی، کون سا اس نے تم سے کٹمنٹ کی تھی، تمہیں وعدے کھائے تھے۔ جس سے وہ مکرگئی تھی اور جس بات کو تم نے انا کا مسئلہ بنالیا ہے، ایسے آپ کو ٹھیک کرو، یہ نہ ہو غلط فہمی اتنی بڑھ جائے کہ تمہاری محبت اسے ختم نہ کر سکے۔“

فریح نے بڑی سنجیدگی سے فاطمہ سے کہا اور عفر کا بازو پکڑ کر واپس مڑ گیا۔ فاطمہ نے ایک نظر گاڑی میں پھینچی زہرہ پر ڈالی اور سر جھٹکنا گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

”آج میں بہت خوش ہوں وقار، میرے دونوں فرض پورے ہو گئے، میری دونوں بیٹیوں کو چاہنے والے لوگ ملے ہیں۔ مجھے لگتا ہے میں نے ماں ہونے کا فرض ادا کر دیا، کیا اماں نے مجھے معاف کر دیا ہوگا۔“

”منفورہ تم ایک اچھی بیٹی اور بہترین ماں ہو اور ایک بہترین بیوی ہو، تمہاری اماں تم سے نہیں مجھ

سے ناراض تھیں، آج انہوں نے مجھے بھی معاف کر دیا ہوگا۔“ وقار کے کہنے پر منفورہ نے مسکرا کر سر ان کے کندھے پر رکھ دیا۔

شمرہ کی چٹکتی پروہ کتنے دل سے تیار ہوئی تھی۔ کیونکہ فاطمہ نے بھی آنا تھا، لیکن وہ آیا ضرور، سب سے پہلی مذاق کیا، سوائے اس کے، وہ دل موس کر رہ گئی۔ سب کے جانے کے بعد وہ چٹکی سی کمرے میں آ گئی۔ اس نے شیشے کے آگے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ سفید اور سلور کرتا شرارہ میں وہ کتنی پیاری لگ رہی تھی، لیکن وہ جس کے لیے تیار ہوئی تھی اس نے تو شاید دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ منہ بنا کر میسر پر آ گئی، اس کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی، جب وہ اچانک میسر پر آ گیا، وہ ہڑبڑا کر رہ گئی، سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔

”نہیں یہ کیا۔“ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی، وہ اسے گیٹ پر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ باگھوں کی طرح یونہی کھڑی رہی، یہاں تک کہ وہ اپنا گیٹ کھول کر ان کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا شرارہ پکڑ کر دبے پاؤں سڑیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ شمرہ کے کمرے سے کھلکھلانے کی آواز آرہی تھی، یقیناً بار بھائی کا فون تھا۔ وہ اسی انداز میں سڑھیاں اترنے لگی۔ گیٹ تک پہنچتے پہنچتے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ اس نے تیزی سے گیٹ کھول دیا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر اندر آ گیا۔ زہرہ نے تھوک نکل کر اپنے خشک حلق کو تر کیا۔

”بولو، کیا شکایتیں ہیں، تمہیں مجھ سے۔“ وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مجھے کچھ بھی نہیں۔“ وہ ہٹا کر بولی۔

”پھر تمہارے منہ پر بارہ کیوں بچے رہتے ہیں۔“

”تو کیا کرنا چاہیے مجھے۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔

”بارہ آپ کے منہ پر بچے رہتے ہیں، اگر میں آپ کو اتنی بری لگتی تھی تو پھر کیوں نکاح کیا مجھ سے۔“ وہ کہتے کہتے رو پڑی تھی۔

”ہر وقت میری آزمائش کیوں ہوتی ہے، ہر

کسی کو میں ہی فالتو نظر آتی ہوں، جس کا دل کرتا ہے، مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت میں ہی ہر ایک کو مناتی رہوں۔“ وہ سر جھٹکائے روٹی جا رہی تھی۔

”مجھے کب منایا تم نے۔“ اس نے روتے روتے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو دونوں بازو سینے پر لپیٹے مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

”ایک بار مٹا کر تو دیکھو۔“ وہ بالکل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اس کے بدلے تیر پر وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹی تھی۔“

”نہیں۔“ وہ ایک دم پٹلی، لیکن اس سے پہلے فاطمہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے واپس کھینچ لیا۔

”نہیں کیا، بات پوری کر کے جاؤ۔ مناؤ مجھے بڑے رومانٹک انداز میں، یقین کرو میں بڑی جلدی مان جاتا ہوں۔“ اس نے بازوؤں کا دائرہ بنا کر اسے دائرے میں قید کر لیا۔ زہرہ نے گھبرا کر لاؤنچ کے دروازے کی طرف دیکھا۔

”ماما، پاپا ابھی سوئے نہیں۔“ اس نے فاطمہ کو دیکھ کر کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، میں ان کے سونے کا ویٹ کر لیتا ہوں، تب تک تم یوں ہی پھرے قریب کھڑی رہو۔“ وہ ایک منٹ یوں ہی سانس روک کر کھڑی رہی، پھر سر اٹھا کر دیکھا۔

”اب میں جاؤں۔“

”کیوں، اب کیا ہوا ہے، میں تو ابھی بھی ناراض ہوں، تم نے مجھے منایا ہی نہیں۔“ صاف پتا چل رہا تھا، وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔

”ابھی میں جاؤں، بعد میں آپ کو منالوں گی۔“ اب کے وہ مسکراہٹ روک کر بولی۔

”دک؟“

”بعد میں۔“

”بعد میں کب۔“ وہ اس کے سر سے سرنگرا کر بولا۔

”جب منانے کا وقت آئے گا۔“ کہنے کے

ساتھ ہی وہ ایک جھٹکے سے جھک کر اس کے بازوؤں کے دائرے سے نکلی تھی۔

”وہ وقت جلد آنے والا ہے۔“ فاطمہ کے کہنے پر وہ مسکرا کر پیچھے ہٹی۔ اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں۔“ اس نے جھکی آنکھوں سے اپنا وہم دور کرنا چاہا۔ ”نہیں، میں ناراض نہیں، تھوڑا ہرٹ ہوا تھا، کیونکہ تمہیں چاہئے لگا تھا، بالکل اچانک اور مجھے لگتا تھا تمہیں پانا بھی بہت آسان ہے، لیکن جب تم نے انکار کر دیا، سچ کہوں مجھے بہت برا لگا تھا اور زوہیب کے ساتھ تمہیں دیکھنا میرے لیے اس سے زیادہ مشکل تھا۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔“

”تو پھر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے؟“ وہ شکایتی انداز میں بولی۔

”تنگ کر رہا تھا، سوچا تھا شادی والے دن سارے شکوے شکایتیں دور کر لیں گے، لیکن تم عفر کو سچ میں لے آئیں۔ اس نے میری جان عذاب میں ڈال رکھی تھی، میری دوست پریشان ہے۔ اب کوئی اسے یہ بتائے اس کی دوست میری بیوی، میری جان ہے۔“ زہرہ نے بے ساختہ اسے دیکھا۔ وہ شاندار شخص جس کی تنہا کی تھی دل نے، وہ کتنا چاہتا تھا اسے۔ وہ شرمناک سر جھٹکا۔

”اب آپ جا میں۔“

”جو حکم۔“ وہ مڑا، پھر دوبارہ اس کی طرف مڑا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“

”فاطمہ پلیز زیادہ پھیلیں مت، جائیں۔“ وہ شاید پہلی بار کھلکھلا کر ہنسی تھی۔

”جا رہا ہوں، نیند نہ آئے تو میسر پر آ جانا، میں بھی آ جاؤں گا۔“

”مجھے ابھی نیند آرہی ہے، میں سوؤں گی۔“

”اچھا سنو۔“

”فاطمہ پلیز۔“ اب کے اس نے اسے زبردستی باہر دھکیلا اور ہنستی ہوئی اندر بڑھ گی۔ اسے یقین تھا کہ اب زندگی میں سچی خوشیاں آنے والی ہیں، کیونکہ وہ تنہا سا شخص شریک زندگی بن گیا تھا۔





# دستک

”دوب مرنے کا مقام ہے ام حبیبہ تمہارے لیے یعنی کہ ہمارے خون سے، تمہارے بدن سے جنم لینے والی یہ لڑکی۔ یا اللہ! ہمیں موت کیوں نہیں آگیتی۔ ہم مر کیوں نہیں جاتے۔ ہماری یہ سفید داڑھی، یہ سفید کرتے، ہماری نمازیں کیسی اکارت گئی ہیں۔ ام حبیبہ! کیا جانو، تم کیسے سمجھ سکتی ہو بھلا۔“

مولانا کوثر جمیل کی داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ ٹپ ٹپ آنسو گر بیان بھگور رہے تھے اور دیوار سے لگی کھڑی چاب جمیل کی والدہ ام حبیبہ دوپٹے سے سر پر جمائے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ وہ جن کے دوپٹے کی پرچھائی تک کوئی ناخرم نہ پارکا تھا جن کی آواز سے صرف گھر کی دیواروں مانوس تھیں۔ آج ان کی اکلوتی بیٹی جو شریعت کے سارے اصولوں کے عین مطابق پالی گئی۔ پالنے میں ہی جسے سورۃ رحمن کی تلاوت سنا سنا کر محجوب و احد سے محبت کرنا سکھایا گیا تھا وہ ایک ناخرم کو خط لکھتی تھی۔ غیر مرد کی محبت میں مبتلا تھی۔

”جان من“، ”جان جہاں“ ان کا جہان تو مصلے سے شروع ہو کر قرآن کی تفسیر تک آ کر ختم ہو جاتا تھا۔ نہ کسی آئے فیشن کی خبر، نہ جاتے موسم سے لگاؤ۔ یہ دنیا تو عارضی ہے اور اس عارضی دنیا سے کیا دل لگانا مگر چاب کے عارضی کی محبوب نام کی شے سے دیکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

کہاں کی رہ گئی تھی، ان کے خاندان کی ناموس کی تو لوگ بھرے بازاروں میں قسمیں کھاتے تھے۔ جھوٹ، ملاوٹ، دنیا داری سے یہ خانوادہ کوسوں نہیں



دھیرے دھیرے محو سفر تھا۔ اس کے کمرے میں کتا بیس ویسی کی ویسی بھری پڑی تھیں اور بیڈ کے پاس رکھے سلپرز۔ وہ ننگے پیر فرش پر مغرب سے کھڑی تھی، البتہ دوپٹے سر پر دیے ہی جمنا تھا جیسے پیدائش سے لے کر آج اس کھڑی تک۔ پاک اسٹڈیز اردو ”بہار اردو“ حساب کا ہوم ورک ابھی رہتا تھا۔ دستے کے اوپر دھرا پین جس میں سے نیلی سیاہی نکل نکل کر پورے دستے پر پھیل چکی تھی۔ اب بھلے وہ پورے گھر کے کو اپنی لپٹ میں لے کر نیلا کر دے، پین اٹھانے۔ کتا بیس سمیٹ کے رکھنے سے کیا حاصل۔ اب وہ بھی اسکول نہیں جاسکے گی۔ وہ جانتی تھی اس کی دنیا تو پہلے بھی بے حد محدود تھی، اب گھر کی چار دیواری سے باہر کی دنیا بھلے

ساری نیلے رنگ کی ہو جائے یا پھر رنگ رنگ کی ہو کر اڑ جائے۔ اسے اس سے کوئی لیٹا دینا نہیں تھا، معافی کے دروازے کھلنے کی امید کرنا عیبت تھا۔ ”مہرین“

”اللہ“، ”شرہ سلیم“، ”نمرہ خرم“، ”فائزہ اختر“ سب کی حاضری لگتی تھی مگر چاب زہرہ غیر حاضر ہو گئی۔ ”ای جان! آپ مجھ سے ناراض ہیں۔“ گالوں پر آنسوؤں کی جگہ حیرانی جمی تھی۔ چمکیلے رنگ مرمر کے سفید فرش پر اس کے سلپرز گھسٹتے تھے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی، ہات پاٹ میں اس کے لیے پر اٹھا ہوگا، فلاسک میں چائے اور اور بس..... اسے اسکول کے چاٹ چنے شدت سے یاد آئے۔

”ای جان! آپ اتنی خاموش کیوں ہیں۔“



اسے ان کے خاموش رہنے پر بھی اعتراض تھا۔  
”تم نے ایسا کیوں کیا؟“ امی جان کا جواب سوال تھا۔

”وہ مجھے اچھا لگا تھا۔“ اس کی آنکھیں جھکی تھیں، صرف لب ہلے تھے اور ام حبیبہ پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

”تمہیں ہزاروں سال جہنم کی آگ میں جلنا کیوں پسند آیا تھا؟“ وہ آنکھیں نہ جہنم کی بھڑکتی آگ سے ڈرتی دکھائی دیتی تھیں، نہ جنت کی طلب گار لگی تھیں۔

”میرا خواب تھا کہ تم بہت سارا پڑھ لکھ لیتیں، تم دنیا کی رنگینوں کو محسوس کرتیں۔ تمہیں..... انوس کون سا رنگ پسند آیا دکھتا جہنم۔“ امی جان سے معافی مانگنا فضول تھا۔

روز اتنے سارے بچوں کی چہل پہل دیکھنے والی اندر سے اکیلی تھی، اپنا کیلا پن بانٹنے آئی تھی مگر وہ اٹھ کر جا چکی تھیں۔ صرف جائے نماز پر بیچ بھول گئی تھیں، سرخ دکتے دانے۔ سارے برتن دھل کر اپنی جگہ پر تھے، پراٹھا اور چائے موجود تھی مگر بھوک کا نام و نشان نہیں تھا۔ کچن کینٹ میں وہ نہ جانے کیا تلاشی تھی، اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

امی جان صرف بابا جان کے ڈر سے اس کی پڑھائی کے حق میں نہیں ہوتی تھیں اور اندر وہ بھی۔ چھٹا کے سے اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا، اتنے زور سے کہ دو آنکھیں گرم پانیوں سے بھر اور یا بن گئیں۔

”میں نے اسے دیکھا تھا، وہ گرٹ برکھارڈ تھا۔ میرے لیے نہیں، وہ شریہ کا بھائی تھا۔ شریہ کے لیے آتا تھا، اس لیے۔ شریہ نے ہی مجھے بتایا کہ وہ عمیر ہے، مجھے اسی نے بتایا تھا۔ اس نے تو مجھے بھی دیکھا بھی نہیں، وہ میری شکل، آنکھوں کی اٹھان تک سے واقف نہیں پھر میں نے ایک نہیں، کئی خط لکھے، روز لکھے، دن رات لکھے۔ مگر امی جان! ایک خط بھی اسے دیا نہیں، نہ ہی وہ میرے ان خطوط سے متعلق

کچھ جانتا ہے۔ کیا میری غلطی معاف ہو سکتی ہے۔“ اس ٹھنڈے رخ ماحول سے اندر جلتے میٹر کی حدت میں بھی حجاب کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اپنی غلطی، اپنی محبت کا اعتراف جو اس کے گلے کا چھندا بنے جا رہی تھی۔ اسے یہ چھندا گلے سے نکالنے کا یہ ہی راستہ بھائی دیا تھا۔ یہیں سے روشنی کی کرن دکھتی تھی۔

باقی سارے دروازے اس سختی سے بند تھے کہ کھولنے کی کوشش میں صرف اسی کی انگلیاں زخمی ہو سکتی تھیں۔ اپنے لبوکا تماشا اس نے کئی روز سہا تھا۔ کل حیر اس کی کلاس فیلو سے بتا کر گئی تھی کہ بابا جان اس کا نام تک خارج کر دئے تھے۔ وہ وجہ جانا چاہتی تھی، وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ رہی تھی۔ آنسو ایک داستان لکھ رہے تھے، اس کے چہرے پر، اس کے دل کی کوری دیواروں پر بے بسی کی بے بسی تھی۔ کیا حجاب زہرہ کی زندگی کا عمر تاریک ہو چکا ہے۔

یہ سوال لیے اپنی جھولی امی جان کے حضور جا پھیلائی تھی۔

”میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گی۔“ اگر آنسو ایک روانی میں بہتے تو آسانی سے اس کے لیے رستہ بنا لیتے، جڑے ہوئے ہاتھ، پکپکاتے لب سو جی آنکھیں۔ یہ صرف اسکول جانے کا سوال ہے، کسی محبت کی بھیک نہیں مانگی گئی۔

”کیا بے نام محبت کی معافی مل سکتی ہے۔ کیا مل سکتی ہے؟“ امی جان نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا

تھا، ان کے نرم، انگلیوں کا بالوں میں چلنا حجاب کو سکون پہنچا رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ رہی تھیں، ہمیشہ سے سچ بولنے کی تربیت دینے والی امی جان جانتی تھیں کہ یہ سچ ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں۔ مگر وہ بے بس تھیں اور بے بسی سے بڑا درد کوئی نہیں۔

پھر اس کی زندگی تاریک تو نہیں ہو سکتی تھی، کچھ روشن روشنی ہو چلی تھی۔ عبد الرحمن، اس کا دوست

بن گیا تھا۔

”بابا جان کو پتا چلا کہ آپ شوہر کے بجائے دوست بنے ہوئے ہیں تو انہیں کیسا لگا، پتا نہیں۔“ اس نے عبد الرحمن اپنے دوست سے ہر بات چھپائی بھی۔

”ہم اس گلی سے چلیں۔“ یعنی بل کھاتی گلی کے تقریباً سارے کونے آلو چھو لے، سمو لے، پکڑ لے بیچے والوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پچھلی طرف والی گھر کی کیڑے کی جالی ذرا اکڑی ہوئی تھی۔ کلاس روم سڑک سے اتنے اونچے تھے کہ ایڑیاں اٹھا کر اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ اس نے بھی یہی کیا۔ ایڑیوں کے بل اندر جھانکنے لگی، کسی نے اسے نہیں پہچانا۔ سب اپنے کاموں میں مصروف تھے، خاموش ماحول میں شاید کوئی ٹیٹ ہو رہا تھا۔ دو مہینوں میں کتنا کچھ بدل سکتا تھا مگر وہ بہت تبدیل ہو چکی تھی۔

زہرہ خاتون، اس کی ساس حجاب زہرہ کو پا کر بہت خوش تھیں۔ مولانا کوثر بیل کی بیٹی ان کی خوش نصیبی نہیں تو کیا ہے بھلا۔ آہستہ آہستہ وہ سب بھولنے لگی اور ان ہی بھول بھولیوں میں وہ بھی بابا جان کی عزت کو ہی مقدم جانے لگی تھی۔ انہوں نے برائی کے راستے سے اسے بچھ نکالا تھا، کتنا اچھا کیا تھا ناں۔ ہر باپ ہی یہی چاہتا ہے کہ اس کی بیٹی پر زمانے کی دھول تک نہ چھٹے پائے اور وہ چاہے سوچوں میں ہی کسی برا سوچ تو رہی ہی تھی ناں، کیا پتا کچھ غلط کر بھی ڈالتی۔

وقت گزرتا رہا۔ مولانا صاحب اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ چہرے کا نور بڑھتا جا رہا تھا، بیٹی سے محبت بھی بڑھی ہی بڑھی تھی۔ دعاؤں کے مضبوط حصار اس کے گرد باندھتے رہتے۔ شوہر کی طرف سے اس نے کوئی تکلیف دہ لمحہ نہیں پایا تھا۔ ساس بھی جب تک ساتھ رہیں پھر رخصت ہوئیں، تب بھی کوئی لال نہ دے کر گئیں، اولاد بھی رب نے خوب

صورت، خوب سیرت عطا کی تھی، ام کلثوم اور فاطمہ میں اس کی جان تھی۔ ام کلثوم اب کالج میں تھی، اس کی جان تب لگی جب کلثوم کو رات کے اندر حیرے میں اس نے اپنے کمرے میں نہیں پایا۔

وقت کتنا گزر چکا تھا، ایک پرانا لمحہ ساکت سامنے تھا، وہی خوشبو تھی۔ عبد الرحمن اور اس کا بیٹا حبیب الرحمن بڑے کمرے میں خواستہ راحت تھے۔ بڑی گہری نیند بھی بس اسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔ فاطمہ بے سدھ بڑی سو رہی تھی، کبیل سر تک کھینچا تھا صرف ام کلثوم کا بستر خالی تھا۔ بے اختیار اس کے دل کی دھڑکن بڑھی تھی۔

”ام کلثوم۔“ اس کے لبوں نے بے آواز جیش کی، کوئی کراہ نہیں نکلی۔ سارا وجود کراہ درد بن چکا تھا۔ کھڑکی کے پار نیچے کالی چوڑی سڑک پر مدھم سا بلبل جل رہا تھا۔ آنسو بھی آنکھوں نے کھڑکی کی جھری سے ام کلثوم کا ہیولہ محسوس کیا۔ ابھی اسے نکلے صرف رات کی تاریکی نے ہی محسوس کیا تھا، ساری کھڑکیاں، روشن دان تاریک تھے۔ صرف اس کی بد نصیبی کا در کھلا رہ گیا تھا، جادہ لپیٹ کر بے دھڑک قدموں سے نکلے پیر وہ ام کلثوم کے پیچھے بھاگی۔ یہ

## خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے، بھول کے لیے ایک اور ماہول



دستِ مکی  
چھپیمیا

قیمت - 400 روپے

نکلتا ہے  
مکتبہ برائے ادب - 37 - اسلام آباد - فون نمبر 32735021



new  
**freedom**  
Ultra thin sanitary napkins

اب مخصوص دن بھی گزاریں خوشگوار!!!

Ultra Thin  
Extra Long



Ultra Thin  
Long



A product of

**H&P**

Health and Hygiene products

تھا۔ پہلی بار اور وہ آیا بھی نہیں تھا، یہیں کھڑا رہتا تھا۔ اس نے اشارہ کیا تھا مجھے میں نیچے اتری تو کوئی نہیں تھا۔ سچ کہہ رہی ہوں امی ہیرا یقین کریں۔  
”ایک انجان آدمی کے لیے کتنی پاگل ہو تم ام کلثوم!“ سامنے موجود حجاب جمیل اب بڑھائے کی دہلیز تھا نے کوئی اور ام کلثوم جوانی کی خوشبو میں اچھی نادانی کی حدود عبور کرتی، اپنا مستقبل برباد کرنے کے لیے تیار تھی۔

وہ ام کلثوم کا چہرہ دیکھ دیکھ کر تھک چکی تھی، کمر گھپ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ یہ چوتھا اندھیرا تھا جو اکیلا تھا، رات گہری تھی جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ کھلی ہاری ام کلثوم اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔  
”آپ جو فیصلہ کریں، امی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا جو آپ کہیں گی وہی کروں گی اب۔ بس اب آپ اٹھ جائیں امی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

”ایسا کوئی قدم مت اٹھاؤ ام کلثوم کہ تمہیں پچھتاہٹا پڑے۔ سمجھو گی، ضرور سمجھو گی ایک دن۔ اچھی کتنا نہیں پڑھا کرو، کوئی دنیا کی خبر رکھنے کا بھی انتظام کروانی ہوں۔ کوئی دیوی وغیرہ۔ ٹھیک ہے ناں، چلو اب اٹھو۔ جاؤ، کھانا کھاؤ۔ کاج تمہیں میں لے جایا کروں گی اور لا تا تمہارے بھائی کی ذمہ داری ہوگی۔ فیصلہ بہت مشکل ہے مگر تمہارے حق میں ہے، محنت کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔ اپنی ماں کی دنیا سے سوچ سے بھی آگے۔ خود کو محدود نہ کرو۔ اپنے پر پھیلاؤ ام کلثوم ما دنیا بہت بڑی ہے۔ گھٹیا عشق محبت جو اس کا عین کڑوا ہے غلاظت کا۔“ کھلی ہاری ام کلثوم ماں کو دیکھنے لگی، جو کسی گہری سوچ میں گم تھی مگر چہرے پر کوئی داستان لکھی جا رہی تھی جس نے نجانے کون سی دستک کا جواب دیا تھا۔

اس کا رقبہ، یہ معصومیت جو پنا نہیں کس غلاظت کا شکار ہونے کو تھی، اسے بجانے کا وقت تھا۔  
”ام کلثوم!“ اس کے لہجے میں اپنی ماں کا سا درد سمٹ آیا تھا۔

جودل کا کلز اتھی۔ دل کے کلزے کرنے چلی تھی، اس نے اپنی سانسوں تک کو بے آواز کر لیا تھا۔ دروازہ اس طرح بند ہو چکا تھا جیسے رات کے اندھیرے میں کبھی کھلا ہی نہ ہو۔ کسی کو اس بات کی بھٹک بھی نہ پڑ سکتی تھی۔ مگر اب وہ بے خبر نہیں رہتا چاہتی تھی، گھر میں ٹھن بہت زیادہ تھی۔ دنیا سے بے خبری بہت بڑھ گئی تھی۔

ام کلثوم کو بہت ساری شکایتیں تھیں، شکایت تو اسے بھی تھی، وہ کیا کرنے چلی تھی۔ سارے پچھلے پرانے خوابوں کی دھجیاں اڑانے لگی تھی۔ عبدالرحمن کی بہن نصیر نے ام کلثوم کو اپنے بیٹے عثمان کے لیے کتنی بار مانگا تھا۔

اسے یاد آیا تھا پوری جزیات سے، وہ جملہ ”ام کلثوم کو میری بیٹی بنا دیں۔“  
اب ہاں کرنے کا وقت تھا، بوجہ اتار بھینکنے کی گھڑی تھی۔ موبائل پر نمبر ملائے، وہ نصیر کی خط لکھی۔ سینٹرل ٹیلی پر کتنا نہیں اونگھ بڑی تھیں۔ آنکھیں کتاہوں میں اچھ کر رہ گئیں۔ نیکی بہتی ہوئی سیاہی دتے۔

”امی میں پڑھنا چاہتی ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں ورنہ میرا مسٹر ز کرنے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔ میں ٹوٹ جاؤں گی۔ میں آئندہ ایسی حرکت بھی نہیں کروں گی۔ امی! بس ایک بار.....“ ام کلثوم اور وہ کمرے میں موجود تھے۔ ایک جیسے خواب، ایک پہلے ٹوٹ گیا، دوسرا ٹوٹنے کو تھا۔

”اولاد سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ آپ پلیز امی۔“ ام کلثوم بھی امی جیسی ہی تھی۔

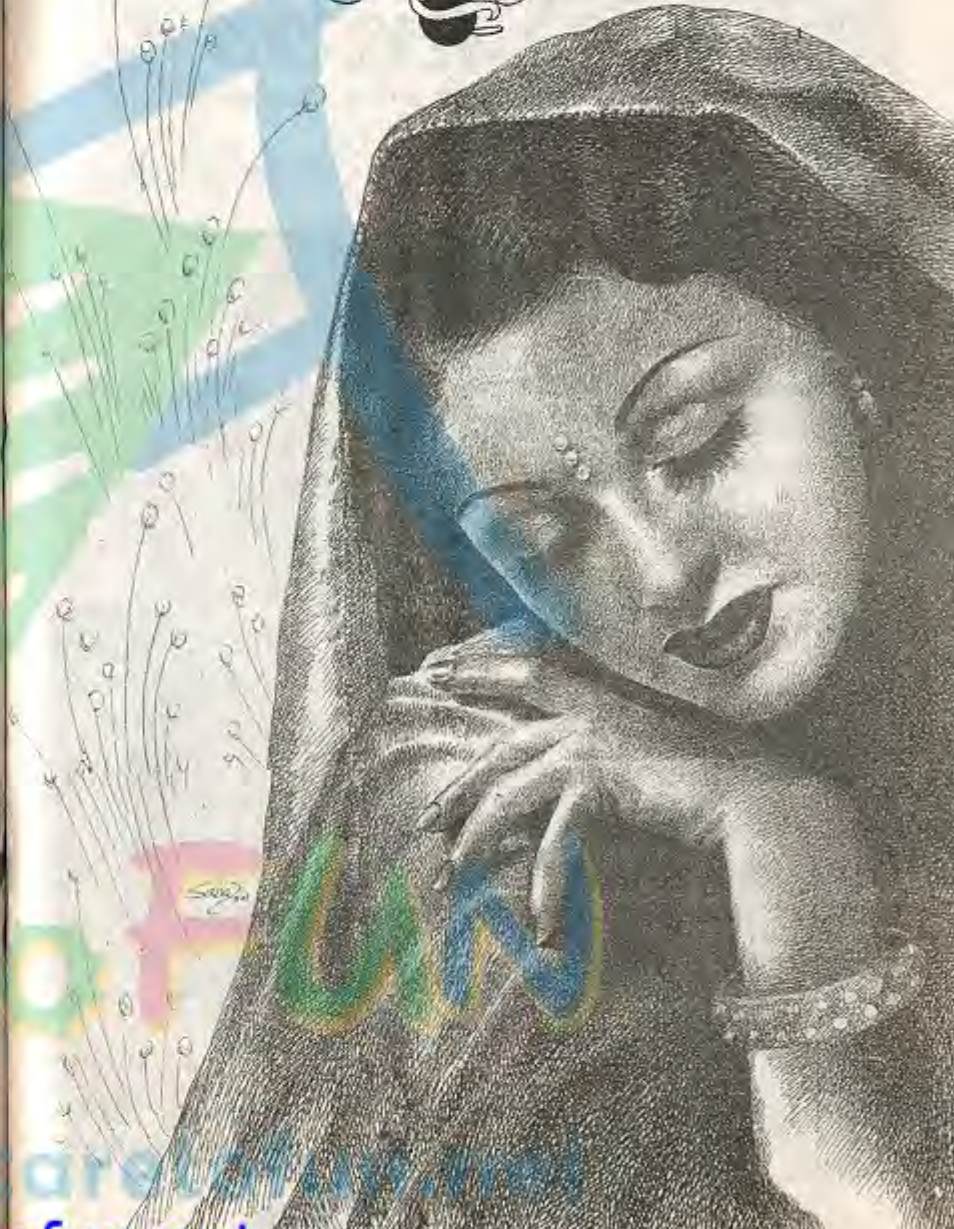
”وہ کوئی نہیں تھا امی! آپ چاہے قسم لیں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملی، آج ہی اس نے بلایا



aretofun.



# طریق عشق



آج کے دن.....

جج پر جانے والے خوش نصیب ہیں، لیکن بد نصیب وہ بھی نہیں۔ یوم جمعہ ہے..... اذان ظہر سے پہلے، قیام جمعہ سے پہلے، غلیفہ کے شاہی دستے آگے اور پیچھے، دائیں اور بائیں چلتے ہوئے، فخر یہ اس اعلا نسل اونٹ کے ساتھ آرہے ہیں جس کی سعادت مند کوہان پر ”محمل شریف“ سوار ہے.....

عرش کا نشان، زمین کا جلال..... ”بیت اللہ“ کا کسوۃ الکعبہ (غلاف)

کلاموں میں کلام..... ابن کلام..... قرآن پاک.....

اس شاہی قافلے کو دیکھنے کے لیے قاہرہ کے لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں، گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئے ہیں۔ جھولوں کے بچے تک نہیں چھوڑے گئے، وہ بھی اس وقت اپنی ماؤں کی گودوں میں ہنستے ہوئے بمحل شریف کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ جن گھروں سے قافلہ دکھائی دینے والا ہے،

مکمل ٹول

نیل گواہ عصا ہے..... وقت کے لمحے اور دریا کی لہریں ایک جیسی نہیں رہیں لیکن وہ پانی کہیں نہ کہیں تو موجود ہوگا جس نے عصائی کی ضرب پر لپٹ کر کہا ہوگا..... لپٹ کر کہنے، بیت اللہ کا جج کرنے، حاجی قاہرہ کی زمین پر قافلہ در قافلہ اتر رہے ہیں..... صبح کا پیام، دن کے بیان میں بدل چکا ہے۔ مصر کے قاہرہ میں، گرم موسم میں، ٹھنڈی ہوا کی آمد کو حجاج کرام کی خوش قدمی قرار دیا گیا ہے۔ گھوڑوں کے ٹاپوں کی دھب، جھوم کے جو شیعے نعروں کا شور، گلی کوچوں، بازاروں، اونچے نیچے راستوں اور زمین کے خالی قطعوں پر کھڑے قاہرہ کے لوگوں کا صبر قابل دید ہے۔

”محمل شریف“ کے لیے آنکھیں نم اور دل محبت کی گرمی سے نرم ہیں۔ سر پر شیرینی کے نوکرے رکھے، خواجہ فروشوں کی آوازوں کے لفظ وہی ہیں بس تاثیر بدلتی ہوئی ہے..... آج کے دن..... ایک





ان گھروں کی چھتوں پر پرندے تو بہت پر مار رہے ہیں لیکن عورتیں کسی کو پر نہیں مارنے دے رہیں اور منڈیر کی طرف کسی مائی کے لال، پیلے، نیلے کو کھڑا نہیں ہونے دے رہیں۔ وہ صبح سویرے جا چکی ہیں، اپنے کام ختم کیے ہیں، کپڑے بدل کر، خوشبو لگا کر، باؤسو ہو کر چھتوں پر آکر مطلوبہ جگہ پر قبضہ کیا ہے۔ اب جو آنے میں دیر کر چکے ہیں، بہتر ہے کہ اگلے سال تک انتظار ہی کریں۔

ہو اسے ان کی چادریں اور لباس کے دامن پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ خطہ زمین پھولوں سے خالی ہو چکا ہے، قاہرہ والیوں نے اپنی جھولیاں پھولوں سے بھر لی ہیں۔ بہت اللہ کی دیواریں چومنے خوش نصیب جا رہے ہیں لیکن بد نصیب وہ بھی نہیں ہیں۔

خیر کو اپنے دامن میں سمیٹ کر، مل دار سڑھیاں چڑھ کر، ہانپتے ہوئے وہ بھی چھت تک پہنچ چکی ہیں۔ ان کی جھولیاں بھی پھولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ وہ بھی باؤسو ہیں، خوشبو لگا کر، دل میں رب کائنات کی تسبیح بیان کرتے ہوئے، وہ بھی کاروان حج کے ساتھ جانے والے غلاف کعبہ اور کلام پاک کو دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔

جنت.....

آمنہ.....

اور عزیزہ.....

دن کے بیان میں حج پر جانے والے تبرکات کا قیام شامل ہو چکا ہے۔ موسم گرم ہے اور گرم ہی قاہرہ والیوں کا مزاج ہو رہا ہے۔ پانچ بیس قاہرہ میں اتنی عورتیں کہاں سے نکل آئی تھیں۔ اوپر آسمان تو کھلا تھا لیکن چھتوں پر دم گھٹ رہا تھا۔ منڈیر کی طرف کھڑی قاہرئیں، جلالی، فسادی، جلی بھی کبابی بنی ہوئی تھیں۔ انہیں ہاتھ لگانے کی دیر ہوئی تھی اور وہ بھڑک کر کہنی دے رہی تھیں۔ پیچھے والیاں ایڑیاں اچکا اچکا کر دیکھنے کی کوشش کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ وہ تینوں بھی اسی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھیں لیکن وہ ہلاک بھی ہو جائیں تو بھی انہیں حمل

شریف دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کی روح آسمان کی طرف پرواز کرتے ہوئے پکڑ دیکھ لیتی۔

”مہربانی ہوگی آپ کی، ذرا آگے کھسک جائیں۔“ عزیزہ نے بڑے منت بھرے انداز میں ضعیفہ سے کہا تھا۔ وہ قاہرہ میں تو پرانی تھی لیکن ایسی چھتوں پر چڑھنے میں نئی تھی ورنہ ایسی منت کرنے کی غلطی نہ کرتی۔

”مجھ سے نرمی کی امید نہ رکھنا، سارا سال انتظار کیا ہے میں نے۔ آج جی بھر کر دیکھوں گی اور کسی کا ٹیظ نہیں کروں گی۔“ ضعیفہ نے روکھے انداز میں کہا۔

عزیزہ نے گردن موڑ کر جنت اور آمنہ کو دیکھا کہ اب کیا کریں۔ یہ ان کا چھٹا گھر تھا جس کی چھت پر وہ آئی تھیں۔ پچھلے پانچ گھروں کی چھتوں پر بھی ان کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ راستے کے اُس اور اس طرف جتنے گھر دکھائی دے رہے تھے سب کی چھتوں کا یہی حال تھا۔ درویش کا گھر، شہر کے کونے میں تھا، وہاں سے حمل کو نہیں گزرتا تھا۔ جہاں سے گزرتا تھا وہاں کھڑے ہونے کی جگہ تو مل رہی تھی لیکن جگہ کو حمل دیکھنے کی نہیں۔ انہوں نے آنے میں دیر بھی نہیں کی تھی، پھر بھی.....

ایک بار پھر سے عزیزہ نے آگے ہونے کی ناکام کوشش کی اور جواب میں بڑی عمر کی خواتین کے ہاتھوں، کہنیاں، دھکے، دھمو کے اور نوج کھسوت وصول پائی۔ وہ ایسے تندہ کی عادی نہیں تھی، اس لیے ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ایک نے تو اس کے بال کھینچ کر کہا تھا۔

”مجھ بے چاری بوڑھی کو دیکھ لینے دو، تم تو جوان جہان ہو، انہی تو بہت دیر تک زندہ رہو گی۔ میری کیا خبر آج یہاں بیٹھی ہوں، اگلے سال قبرستان میں لیٹی ہوں۔“ مجھ بڑھیا کو دیکھ لینے دو.....“ عاجز بڑھیا نے، قاہرہ جادو بن کر کہا۔

”یہ بات سنتے سنتے میں نانی بن گئی، میرے

یہ بال سفید ہو گئے، لیکن تم ابھی تک نہیں مریں خالہ! تم ہمیں مار کر نہیں مرو گی لیکن ہمیں جلا کر ضرور مرو گی۔“ کسی ایک نے جل کر کہا تو ساری عورتیں تھپتھپانے لگیں۔

”تم نے اب حیات پائی نہیں لیکن سوگھا ضرور ہے۔ اب وہ پیالہ تو ابھی ڈالو خالہ!“

”تمہارے سر سے پھوڑ کر توڑ دوں؟ سب جلتی ہو مجھ سے۔“

جلی ہوئی عزیزہ بھنا بھی گئی۔ اس کی چادر عورتوں کے ہجوم میں پھنس گئی تھی، اس نے چادر چھڑوانے کی کوشش کی، اسے زور لگا کر کھینچا تو وہ ریشم کی طرح پھسل اور وہ دور جا گری..... عورتوں نے ذرا کی ذرا ملٹ کر اسے دیکھا اور پھر بے ضعیفہ سے مذاق کرنے لگیں۔ وہ اپنے کھنکھنے ملنے لگی تھی۔ جنت اور آمنہ کھکی کھی کر رہی تھیں۔

”ساری تکلیفیں میں ہی سہوں، عورتوں کی ضوئیں بھی کھاؤں اور پھنچ بھی۔“ اس کی گھٹی کالی بھنوں، اس کے چہرے کی سب سے نمایاں شے..... اس کی گھٹی کو خراب کر رہی تھیں۔ اس کی جھولی سے گر کر نکھرے پھول۔

عورتوں کے غول سے لچھ کر گری پوری کی پوری وہ..... جنت کو اس پر بہت پیار آیا اور آگے بڑھ کر وہ اس کے پھول سینے لگی۔

”میری بیٹائی کمزور ہے۔ میں دن کے اندھے پن کا شکار ہوں۔ مجھے جگہ دے دیں۔“ آمنہ نے اس صفائی سے جھوٹ بولا تھا کہ کھنکھنے ملتی عزیزہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ پھول سینتی جنت کے ہاتھ ساکت ہو گئے تھے۔ وہ گردن کو خم دے کر ”حیرت پن“ سے، دن کے ”اندھے پن“ کا شکار آمنہ کو دیکھ رہی تھی۔

”میں رات کے بھرے پن کا شکار ہوں۔ مجھے دن کے اندھوں کی باتیں سنائی نہیں دیتیں۔“ اس کے آگے کھڑی عورتیں بھی جھوٹ کا منہ توڑنا چاہتی تھیں۔

عزیزہ اور جنت کی ہنسی ایک دم سے چھوٹی تھی۔ ”اوون کے اندھے پن کا شکار لڑکی! ایسے ہولناک جھوٹ بول کر بھی جگہ نہیں ملی، ڈوب مرو۔“

عزیزہ اپنے گھٹنے کی تکلیف پر صبر کر چکی تھی۔ کیا فائدہ ہوا زخمی ہونے کا، جھوٹ گھڑنے کا۔ کسی نے پھر بھی ہمدردی میں اسے آگے آنے کی جگہ نہیں دی۔

”قاہرہ کی عورتیں پتھر دل ہیں۔“ عزیزہ نے ایک آخری کوشش کی تھی عورتوں کو شرم دلانے کی۔

”قاہرہ کی عورتیں دریا دل بھی ہیں، ڈبو ڈبو کر مارتی ہیں۔“ ایک نے پلٹ کر اطمینان سے، شرمائے بغیر کہا۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ منڈیر کے قریب بیٹھی عورتیں جوش سے نعرے لگا رہی تھیں۔ تینوں نے حسرت سے انہیں دیکھا۔ کیسے بد اخلاق لوگ تھے، تین بے چاری لڑکیوں کو تحمل شریف دیکھنے کے شرف سے محروم رکھ رہے تھے۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ با اخلاق لڑکی نے کھڑے ہوتے ہوئے، چلا کر کہا۔ جنت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سڑھیاں اترنے لگی۔ ہوا کے تیز جھونکے ان کی چادروں میں ساگنے اور انہیں لہرانے لگے۔

”کہاں جا رہی ہو عزیزہ!“ سڑھیاں اترتے، ہانپتے، کانپتے، دن کے اندھے پن کا شکار آمنہ پوچھ رہی تھی۔

”مسجد.....“ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اس نے کہا۔ سڑھیاں وہ اتر چکی تھیں، اب گھر سے باہر نکل رہی تھی۔

”ہم اور مسجد..... کچھ خدا کا خوف کرو..... اللہ کا گھر ہے وہ۔“ شوری وجہ سے آمنہ کو چلا کر کہنا پڑا تھا۔

”ہم بھی اللہ کے ہی بندے ہیں۔ دیکھنا سب سے بلند جگہ ملے گی ہمیں۔ پھول سیدھے حمل پر



# الف لیلہ ہزار داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں  
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

فی کتاب- 1200/- روپے  
ڈسکاؤنٹ- 300/- روپے  
آج ہی - 950/- روپے  
مئی آؤ رارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوائے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

بھی گھر سے زیادہ بلندی پر موجود تھیں۔ چھ گھروں سے انہیں دیکھنے اسی لیے ملے تھے، تاکہ وہ ساتویں گھر، اللہ کے گھر سے، اللہ کے گھر جانے والا کسوۃ الکعبہ اور کلام پاک دیکھ لیں۔ نیت ورنہ ارادہ باندھ لیں۔ تیز ہوا سے ان کے دامن پھڑ پھڑا رہے تھے۔ شدت جذبات سے محبت اتر رہی تھی۔

محمل شریف (اہرام مصر کی ساخت کا بنا ڈھانچہ، جس میں کلام پاک اور غلاف کعبہ ہوتا ہے) قاہرہ کا جہوم اور شاہی دستے قریب آ رہے تھے۔ حج پر نصیب والے جاتے ہیں، جو پیچھے رہ جاتے ہیں وہ نصیب جاگ جانے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ دور سے آنے والے، پیچھے رہ جانے والوں کی آنکھوں کے قریب آ رہے تھے۔ غیر محسوس طریقے سے تینوں نے چادریں سچ کر چہروں کو چھپا لینا چاہا۔ حیرت کات کو ایسے کھلے منہ دیکھنے سے انہیں شرم آئی۔ انہیں یقین تو حاصل تھا لیکن شک بھی ان کے ساتھ تھا کہ وہ ان حیرت کات کو دیکھ سکتی ہیں اور نہیں بھی۔

حافظ قرآن ماؤں کے حافظ قرآن مصوم دل بچے، غلاف کعبہ کے لیے کپڑا بننے ہیں، پھر اس پر آیات لکھتے ہیں۔ حافظ قرآن بابوں کے حافظ قرآن بچے، بیت اللہ جانے والا ”کلام پاک“ لکھتے ہیں۔

ایسی حفظ، حفظ محبت سے..... ایسے والہانہ سیاہ رنگ عشق سے آنکھیں چار کرنے سے انہیں شرم آئی.....

لیکن تینوں کی نظر ایک ساتھ محمل شریف پر پڑی تھی۔ وقت پر نہ جانے کیا گزری لیکن ان کے لیے ہستی جاہ و جلال، ہستی روح و کمال، خاک ہوئی..... تینوں کی سواری، عاجزی کی نشانی، چوپایوں میں اور ویش چو پائے اونٹ نے سرائٹھایا۔

انہوں نے سر جھکایا اور دیکھا۔ وہ قاہرہ سے ہی تھیں لیکن شہر کے دوسرے کنارے سے۔ انہوں نے کبھی محمل کو دیکھنے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ وہ کلام پاک، غلاف پاک کو اپنی ناپاک نظروں سے دور ہی

کیسے جاسکتی ہیں بھلا.....؟ جنت نے اداس ہو کر کہا۔ ”جیسے مسجد کی طرف بھاگی جا رہی ہو، ویسے ہی اللہ کے گھر کی طرف بھی بھاگ کر چلی جاؤ۔ میرے تو گھٹنوں نے بے وفائی کی ورنہ میں تو کب کی جا چکی ہوتی۔“

”وہڑ کر صحرایہ پار کر لیتیں؟“ آنے والے وقت کے بہرے پن کا شکار لڑکی، حیران ہوئی۔

”میں تو اڑ کر آسان بھی پار کر لیتی..... بس کم ہمتی لے ڈوبی..... تم یہ کم ہمتی نہ کھانا.....“ پتا نہیں مذاق تھا یا صلاح۔ خاتون سنجیدہ تھی..... خاتون دانہ تھی..... خاتون فرشتہ تھی..... خاتون بیابان تھی۔

سارا قاہرہ، سارا عالم کا روانہ حج کے ساتھ ”بیت اللہ“ جاسکتا تھا لیکن وہ نہیں..... وہ نہیں..... وہ واقف حال تھیں۔

بچے مسجد کے قریب دیوار میں بھاگے پھر رہے تھے۔ نعرے لگا رہے تھے۔ وہ مسجد کی سمت بھاگ گئیں۔ اوپر کی طرف جانی سیڑھیاں چڑھ کر، شکل سے ہی سمجھ لیں وہ مسجد کے گنبد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ انہوں نے بھی دیواریں وغیرہ پھلائی تو نہیں تھیں لیکن اب ایک دوسرے کے ہاتھوں کا سہارا لے کر وہ دیواریں پھلانگ کر گنبد کے چبوترے تک پہنچ چکی تھیں۔ سب سے پہلے عزیزہ کھڑی ہوئی تھی اور اس کا منہ حیرت سے ٹھلارہ گیا تھا.....

اتنی بلندی سے شہر کے نظارے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا۔ یہ خیال قاہرہ کی عورتوں کو کیوں نہیں آیا تھا۔ یہاں سے محمل صاف دکھائی دے سکتا تھا۔ پھول بھی عین اس کے اوپر چھٹکے جاسکتے تھے۔ گول گنبد کے کنارے کھڑے ہونے کی جگہ کم تھی، اگر ان کے قدم ڈگمگا جاتے تو وہ سیدھی نیچے گرتیں۔ محمل کے قدموں میں..... لیکن.....

لیکن فی الحال وہ گنبد کی منڈ پر پرکھڑی تھیں۔ ان کے شفاف چہرے، اور روشن آنکھیں، سورج کی گرمی اور نرمی سے نبرد آزما تھیں۔ وہ قاہرہ کے کما

گریں گے۔“ بچوں، مردوں، عورتوں کو دیکھتے ہوئے وہ مسجد کی سمت تقریباً بھاگتی ہوئی جا رہی تھی۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ محمل بس قریب ہی ہے۔

”آج کے دن بھی یہی ہلاکت خیز گناہ ہوں گے.....“ تیزی سے بھاگتے ہوئے وہ ایک محترمہ سے ٹکرائی، جس نے جل کر کہا۔

”مجھے معاف کر دیں.....“ اس کے ایسے کپیلے انداز پر عزیزہ ہنس دی۔ صبح سے اسے دیکھنے ہی مل رہے تھے تو دو چار اس نے بھی لوٹا دیے..... حساب برابر رکھنا چاہیے ناں۔

”دانت نکال کر مجھ سے معذرت کر رہی ہو اور یہ تم کہاں بھاگی پھر رہی ہو؟“

”ہمیں کہیں جگہ نہیں ملی تھی تو ہم مسجد کی طرف جا رہی ہیں، شاید وہاں.....“ آمنہ نے دانہ بننے ہوئے کہا جیسے یہ خیال اسے ہی تو آیا تھا۔ عزیزہ، آمنہ کو گھورے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”بڑی چالاک ہو، یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا..... پر میرے گھٹنے مجھے سیڑھیاں نہیں چڑھنے دیں گے۔“

”اور دیواریں پھلانگتے بھی.....“ کہتے ہوئے عزیزہ اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی لیکن اس نے.....

”تم ہو کون؟ تمہیں پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔“ نظر آمنہ اور جنت پر، سوال عزیزہ سے۔

عزیزہ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ غیر محسوس انداز میں تینوں نے اپنے چہرے پر نقاب پہنچ لینے کی کوشش کی۔ ان کے پاس جواب تو تھا لیکن جرات نہیں تھی۔ وہ آج کے دن..... محمل کو دیکھنے کے دن..... حاجیوں سے بھرے قاہرہ..... قاہرہ میں تیار کاروان حج کے دن.....

کیسے بتا دیتیں کہ وہ کون ہیں..... ”کاروان کے ساتھ ہو؟ ہاں مہمان ہی گئی ہو، وہاں جا کر میرے لیے بھی دعا کرنا۔“ ”ہم کاروان میں شامل نہیں ہیں۔ ہم وہاں



رکھنا چاہتی تھیں۔ تب ان کے نام کچھ اور تھے لیکن اب وہ نام بدل چکی تھیں۔ تو یہ کہہ کر کے تاب ہو چکی تھیں۔ شہر کے دوسرے کنارے سے اس کنارے کی طرف ہجرت کر چکی تھیں۔

شہر کا وہ کنارہ جو ”قبر خانہ“ کہلاتا ہے۔ شہر کا یہ کنارہ جہاں محل اپنی شان دکھاتا ہے۔ جیسے زمین کے کنارے، ویسے آسمان کے کنارے، نہ ستون، نہ سیرھیاں، بس درجے اور منزلیں۔۔۔۔۔

نماز شرف ملاقات۔۔۔۔۔ حج شرف عشق دیوانہ وار ہے۔۔۔۔۔

☆☆☆

کلام پاک، غلاف پاک، نے ان کی بے نور آنکھوں کو نور، نور کر دیا تھا۔ قاہرہ کے رہنے والوں کی آوازیں حیرت و شام سے معطر تھیں۔ وہ بھی زیر لب حمد و ثناء کر رہی تھیں۔ دیوانہ وار پھول پھینک رہی تھیں۔ ”سبحان اللہ۔“ بے ساختہ آمنہ نے تعریف کی۔

”الحمد للہ۔“ جنت نے اب جانا تھا کہ شکر کا لمحہ کب آتا ہے۔

”ان شاء اللہ۔“ عزیزہ نے دل کی دعا، روح کی نیت پر کہا۔

انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی خوشی حاصل نہیں کی تھی، جو اس وقت کر چکی تھیں۔ جب تک محل نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، وہ وہیں کھڑی رہی تھیں۔ پھر تینوں ایک ایک کر کے گنبد کے چبوترے سے کود گئیں۔ نماز جمعہ کا وقت ہونے والا تھا۔ مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

”تم سب کہاں سے آرہی ہو؟“ وہ مسجد کی سیرھیاں اُتر کر وضو کے لیے حوض کی سمت جا رہی تھیں کہ مسجد کے خادم نے حیران پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہم اوپر تھیں۔۔۔۔۔ محل شریف دیکھنے گئی تھیں۔“ عزیزہ جرات مند تھی۔ حق پر بھی تھی۔

خادم کا منہ بن گیا۔

”یہ مسجد ہے، اہرام نہیں کہ تم کو دتی پھلاگتی اوپر چڑھ جاؤ۔“

”یہ اللہ کا گھر ہے اور اللہ کے گھر پر اللہ کے ہر بندے کا حق ہے۔ ہم نے مسجد کے کسی بھی حصے کی بے حرمتی نہیں کی۔“

خادم حیران عزیزہ کو دیکھ رہا تھا۔ ”تمہاری زبان فتنی کی طرح چل رہی ہے۔“

”یہ سچی باتیں کاٹ نہ دے۔ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ، ہمیں نماز بھی پڑھنی ہے۔“ جنت دونوں کے درمیان میں سے جگہ بناتے ہوئے حوض کی سمت بڑھ گئی۔

مسجد میں حج پر جانے والے نمازیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ عورتوں کا حصہ بھی کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ تینوں ایک ایک کونفر سے دیکھ رہی تھیں۔

”آپ تو بہت خوش ہوں گی ناں؟“ نماز جمعہ کے بعد وہ ایک سیاہ فام عورت کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ پوچھے بغیر رہا نہیں گیا تھا۔

عورت عاجزی سے ہنس دی۔ ”الحمد للہ! کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام عزیزہ ہے، میں ایک بہادر لڑکی ہوں۔ یہ جنت ہے، اس جتنی ڈر پوک لڑکی پورے مصر میں نہیں ملے گی۔ اور یہ آمنہ ہے، یہ کسی نہ کسی بیماری کا شکار رہتی ہے، کچھ دیر پہلے یہ اندھے پن کا شکار تھی، کچھ دیر بعد یہ لنگڑے پن کا شکار ہو جائے گی۔ یہ صورت حال کے ساتھ ساتھ اپنی بیماریاں بدلتی ہے، ویسے اس کی سب سے بڑی بیماری اس کا انسان ہونا ہے۔“

عورت ہلکی سی دیر تک ہنستی رہی۔ ”بہنیں ہو؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ سہیلیاں۔۔۔۔۔ بہت خوش قسمت ہیں آپ، ایسا کریں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔“ عزیزہ نے جھجکے بغیر کہا۔

”میرے اختیار میں ہو تو میں ایک ایک

مسلمان کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ وہاں جا کر میں تم تینوں کے لیے دعا کروں گی۔ تم تینوں کا نام لے کر کروں گی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے قافلے گزر کر گزر کر جایا کرتے تھے تو میں بھی چلا چلا کر ایک ایک سے کہتی تھی کہ ام بانی کا نام لے کر دعا کرنا کہ وہ اللہ کے گھر کا سفر اختیار کرے۔ پتا نہیں کس کی دعا مجھے لگ گئی ہے۔ میں نے اور میرے شوہر نے نو سال مٹی کے برتن بنائے ہیں پھر بھی کسی قافلے کے ساتھ آنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ ہم نے اپنے پیٹ نہیں کاٹے، نفس کاٹے ہیں۔

ایک بار سب چوری ہو گیا تھا۔ میرے جانور مر گئے، بارشوں نے گھر تباہ کر دیا۔ یہ دسواں سال تھا، پھر گیارہویں سال میں نے اسباب کے بجائے اعمال جوڑنے شروع کر دیے۔ میں نے ضد کے گھڑے کو چاہت کے پانی میں بدل دیا۔ سفر کے شوق کو محبت کی لہک میں اور ایسے میرا رخ بدل گیا۔

میرے شہر کی صاحب حیثیت عورت نے میرا سفر خرچ ادا کیا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہے، حکم بس ایک کا ہی چلتا ہے اور تب ہی سب ہوتا ہے۔“

محبت کا لہک۔۔۔۔۔ حکم۔۔۔۔۔ عمل۔۔۔۔۔ چاہت کا پانی۔۔۔۔۔

سب سوال اور سب جواب ختم ہو گئے۔ تینوں چپ چاپ، مسجد سے باہر آ گئی تھیں۔ بازار سے ہو کر، گلیوں سے گزر کر، شہر کے اجازت کنارے پر آباد، درویش کے درویش مفت گھر کی سمت۔۔۔۔۔ میدان میں بچے فرضی شیطان کو ننگریاں مار رہے تھے۔

”میں حج پر جانا چاہتی ہوں۔“ جلتے جلتے رک کر عزیزہ نے کہا۔ ”وہ ہمارے رب کا گھر ہے، اس پر ہمارا بھی حق ہے۔“

”ہم صاحب اعمال نہیں ہیں عزیزہ! ہم صاحب گناہ ہیں۔“ آمنہ کو عزیزہ کی بات سن کر حیرت ہوئی تھی۔

”ہمارا ماضی ہمارے فرائض کے راستے میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ تو یہ میری ذہال بن چکی ہے، اس

پر مایوسی کا ہتھیار نہ چلاؤ۔ ہم بھی کسی عام مسلمان کی طرح کی انسان ہیں۔ ماضی ہمارا انجام ملے نہیں کر سکتا۔ وہ ہمارا سامان سفر، تاجہ و بریاؤ نہیں کر سکتا۔

دونوں اس کی شکل دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔

”میں نے اس رب کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا، اس نے مجھے ہدایت دی تو میں نے بھی ”لیک“ کہا۔ میرے گناہ سیاہ سمندر، اس کا رحم بے کنار بحر۔ میرے گناہ زمین سے آسمان، اس کی بخشش ساتوں آسمان۔۔۔۔۔

”بے شک!“ آمنہ نے بے ساختہ کہا۔

”کیا تم دونوں نے بھی یہی نہیں کیا؟ میرا حسن جو چاند کا کھڑا تھا، میں نے اسے کمتر سمجھا تو کس لیے؟ مخلوق سے نکل کر خود کو خاک کیا تو کس کے لیے؟ کس چیز نے مجھے ایسے بدرنگ چمٹے پرانے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا؟ وہ کیا ہے جس کے آگے ریم و خواب بے حیثیت ہیں؟ میرے جواہر پتھر کے ٹکڑے ہیں؟“

کھیل کود کرتے بچوں کے شور کی وجہ سے اسے اپنی آواز بلند کرنی پڑی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔

”کیا یہ سب میں نے اپنے رب کے لیے نہیں کیا؟ راہ حق پر چلنے کے لیے میں نے ایک بار بھی پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ کسی چیز کے لالچ نے میرا دامن نہیں چھینا۔ ہمارا رب۔۔۔۔۔ جس کی محبت میں ہم نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ دنیا کو خاک کیا اور عرش والے کے لیے اہتمام کیا۔ نماز قائم کی اور روزوں کے لیے تیاری کی۔ تو کیا اس رب کے گھر کے طواف پر ہمارا حق نہیں؟“

”ہم کا روانہ حج میں شامل نہیں ہو سکتے نا اس سال نہ آنے والے کسی سال۔“ جنت کو اس کی نیت توڑنی ہی پڑی۔

”یہ اہتمام اللہ کو کر لینے دو۔“ اس کی نیت ارادے میں بدل چکی تھی۔

”ہمیں یہ سفر کوئی اختیار کرنے نہیں دے گا۔“ آمنہ نے حقیقت بیان کی۔

2010



”یہ اختیار، اختیار والا دیکھ لے گا۔۔۔۔۔ اس نے ”یقین“ کی ترجمانی کی۔

عزیزہ ان دونوں سے عمر میں چھوٹی تھی، اپنے گھنے بالوں کو وہ دو حصوں میں بانٹ کر بل دے کر نیچے گرہ لگا لیتی تھی۔ خاموش رہتی تھی تو بہت بھولی بھالی لگتی تھی، بولتی تھی تو ہوش اڑا دیتی تھی۔ یہ وہی تھی جس نے درویش کی تبلیغ پر توبہ میں پہل کی تھی۔ یہ وہی تھی جس کی وجہ سے وہ دونوں آج اس کے ساتھ تھیں۔ شہر کے اُس کنارے سے دور، شہر کے اُس کنارے میں مشغول، درویش کے گھر، مسجد کے پڑوس میں، بد رنگ کپڑوں میں لیکن اعلیٰ روح کے ساتھ۔

☆☆☆

”میں جانتا تھا کہ میرا امتحان آنے والا ہے۔“ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے درویش پانی سے بھری رکابی میں بھجورہا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ کھانا تھا۔ اس کا اصل نام منان یوسف تھا لیکن وہ درویش کے لقب سے مشہور تھا۔

”امتحان خوش نصیبوں کو نصیب ہوتے ہیں۔“ بے ساختہ عزیزہ کے منہ سے نکلا تھا۔

”تم حج پر کیوں جانا چاہتی ہو؟“ وہ متیوں سے پوچھ رہا تھا۔ یہ سب لوگ چولہے کے پاس بیٹھے تھے۔ درویش کی بیوی روٹیاں پکا رہی تھی۔ جنت سب کو کھانا نکال نکال کر دے رہی تھی۔ عزیزہ کھانچکی اور آمنت کا دل کھانے سے اٹھ چکا تھا۔

”بتاؤ جنت! کیوں جانا چاہتی ہو؟ تم تو صاحب حیثیت بھی نہیں ہو؟“ پہلا نوالہ اٹھا کر درویش نے اپنی بڑی بیٹی کی طرف بڑھایا اور اس کے منہ میں ڈال دیا۔

”میں صاحب چاہت ہوں درویش!“ اب جنت اپنے لیے کھانا نکال رہی تھی۔ درویش نے گہرا سانس لیا۔ ”اور تم آمنت؟ کیوں جانا چاہتی ہو؟“ ”فرض عبادتیں زمین کے کسی بھی حصے میں ادا

کی جاسکتی ہیں۔ نماز زمین کے کسی بھی ٹکڑے پر پڑھی جاسکتی ہے، پانی، پہاڑ، صحرا، جنگل۔۔۔۔۔ بارش، طوفان، گرمی، سردی۔۔۔۔۔ رمضان کے روزے اور زکوٰۃ کی ادائیگی بھی۔ لیکن حج صرف ایک مقام پر ادا ہوتا ہے۔ میں اس ”ایک گھر“ جانا چاہتی ہوں۔“ ”تو تم زیارت کرنا چاہتی ہو؟“ درویش نے دوسرا نوالہ چھوٹی بیٹی کے منہ میں ڈالا۔

”اللہ کو اجازت پسند ہے، سفر اور اہتمام سفر پسند ہے۔ ہمارا چل کر، دوڑ کر، بے تاب ہو کر، بے قرار ہو کر آتا۔ دنیا کے کناروں سے نکل کر مرکز کی طرف بھاگنا۔ قیامت کے دن بھی ایسا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ ہے نادر ویش۔۔۔۔۔“

”اور تم عزیزہ۔۔۔۔۔؟“ درویش اپنا کھانا ختم کر چکا تھا۔ لمبے وقفے کے بعد وہ عزیزہ سے پوچھ رہا تھا۔

”لیک کہنے درویش۔۔۔۔۔“ وہ اس سے زیادہ، اس سے کم کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ درویش ہزار بار پوچھتا، وہ ہزار بار یہی جواب دیتی۔

”لیک کہنے۔۔۔۔۔؟“ گھٹنے کھڑے کر کے، درویش نے سر کو دیوار کے ساتھ لگا لیا تھا۔

”تم نے ایسی باتیں کیسے سیکھ لیں عزیزہ؟“ وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

☆☆☆

امیر انج۔۔۔۔۔ امیر کارواں۔۔۔۔۔ برکات ابن موسیٰ کو سر کھانے کی فرصت نہیں تھی۔ تین دن بعد کارواں حج کی روانگی تھی۔ آج صبح اندلس سے آخری قافلہ بھی آچکا تھا۔ کارواں میں حاجیوں کی تعداد دس ہزار کے قریب پہنچ چکی تھی۔ یہ بلاشبہ اب تک کا سب سے بڑا کارواں تھا۔ عالم اسلام میں اس کارواں کی روانگی کی جتنی دھوم تھی، امیر انج پر اتنی ہی زیادہ ذمہ داریاں تھیں۔ کچھ حامدین جل رہے تھے کہ عالم اسلام کا اتنا بڑا کارواں ابن موسیٰ کی سربراہی میں جا رہا ہے۔ کچھ دل والے خوش تھے کہ یہ رتبہ ابن برکات کو حاصل ہو رہا ہے۔

رات کا آخری پہر تھا اور وہ میدان کارواں میں انتظامات دیکھنے میں مصروف تھا۔ اناج، جانور، شاہی دستے۔ دور، دور تک حاجیوں کے اونٹ ہی اونٹ دکھائی دے رہے تھے۔ خیمے تھے، گھوڑے، خچر اور کارواں کا سامان تھا۔ وہ یہ سب دیکھ کر پھولے نہیں سارہا تھا۔ اس کی سربراہی میں جانے والا یہ دوسرا کارواں حج تھا۔ پہلے کارواں کی واپسی پر، مصر میں اس کا شاندار استقبال کیا گیا تھا۔ اس نے بدوؤں کے حملے کو بری طرح سے پسپا کر دیا تھا۔ اس کی بہادری اور شجاعت کے ڈنکے بجنے لگے تھے۔

مصر میں وہ مقبول عام تھا۔ قاہرہ میں ہر دل عزیز تھا۔ لوگ اس سے محبت کرنے پر مجبور تھے۔ وہ ان کے دلوں کا سکون بن گیا تھا۔ بچے اسے دیکھ کر ”امیر انج“ بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔

”کیا آپ مجھے اپنے ساتھ حج پر لے جائیں گے۔“ اسے روک کر بچے یہ سوال کرنا پسند کرتے۔ ”لیکن تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔۔۔۔۔“ وہ گھٹنوں کے بل بچوں کے گردو کے پاس بیٹھ گیا۔

”کیا اللہ چھوٹے بچوں کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دیتا؟“

”بالکل دیتا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم اتنا لمبا سفر نہیں کر سکو گے۔۔۔۔۔ والدیا والدہ کے ساتھ جا سکتے ہو۔۔۔۔۔“

”والد کہتے ہیں وہ غریب ہیں، والدہ کہتی ہیں، وہ غریب کی زوجہ ہیں۔ میں دو غریبوں کا معصوم ”بیٹا“ ہوں، کیا کروں اب؟“

”اب تم دو غریبوں کے امیر ہونے کی دعا کرو۔“ برکات ابن موسیٰ بنے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

”آپ امیر انج کیسے بنے؟“ غریب بچے کے ساتھ کھڑے امیر بچے نے پوچھا۔

”میں۔۔۔۔۔؟ میری والدہ حج کرنے کے لیے گئی تھیں اور پھر واپس نہیں آسکی تھیں۔۔۔۔۔ گہرا سانس۔۔۔۔۔ گہری آہ۔۔۔۔۔

”آپ بدوؤں سے بدلہ لینے کے لیے امیر انج بنے؟ والد کہتے ہیں آپ نے بدوؤں کو مزا چکھا

دیا تھا۔“

وہ ہنس دیتا، رونا چھپا لیتا، وہ ساری دنیا کے بدوؤں کو مزا چکھا دیتا تو بھی والدہ کو واپس نہیں لاسکا تھا۔ جو اس کی پیشانی چوم کر اونٹ پر سوار ہوتی تھیں، وہ پھر فریضہ اجل کے ساتھ پرواز کر گئی تھیں۔ ان دنوں وہ ہر روز کارواں کی واپسی کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ شہر کے جس کنارے سے اس نے والدہ کو رخصت کیا تھا، اس کنارے پر کھڑا ہو کر وہ انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ بیوہ ماں کے بچوں کے پاس انتظار کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔ دکھائی دینے والی ایک صورت، سنائی دینے والی بس ایک آواز، تسلی دینے والا بس ایک دل۔۔۔۔۔ ساری زندگی کا سرمایہ بس ایک ”ماں“۔۔۔۔۔ یتیم بچوں کے دل کی ہر ایک دھڑکن ماں کے دل کے ساتھ دھڑکتی ہے۔

جس دن کارواں واپس آیا، وہ پاگلوں کی طرح کارواں کے پیچھے بھاگا تھا، سارا شہر استقبال کے لیے موجود تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ، ایک ایک حاجی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک ایک اونٹ کی سمت دیوانہ وار بھاگ رہا تھا لیکن اسے اپنی حاجن والدہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ سب حاجی اسے روک روک کر گلے سے لگا رہے تھے۔ اس کی پیشانی چوم رہے تھے، اس کی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہے تھے جو ماں کو دیکھنے کی ٹپ میں بہہ نکلے تھے۔

”تمہاری والدہ بدوؤں کے حملے میں شہید ہو چکی ہیں میرے بیٹے۔۔۔۔۔“

امیر انج اس کے پاس آ کر اسے سینے سے لگا کر بتا رہے تھے۔ حج بھی اور شہادت بھی۔۔۔۔۔ اتنے سارے حاجیوں کے سینے سے لٹنے کے باوجود، صبر کی اتنی زیادہ تمکیاں لٹنے کے باوجود وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔ زمین پر ڈھیر ہو کر، زمین کی مٹی سے مٹھیاں بھر کر۔

”اب زمین کی ہر شے مجھ سے زیادہ خوش قسمت کہلائے گی، وہ چولہے کی راکھ اور سوچی گھاس کا تنکا ہی کیوں نہ ہو۔“



وہ روتا جاتا تھا، کہتا جاتا تھا۔ اس نے ہمیشہ حج سے واپس آنے والے دیکھے تھے، حج سے شہید ہو کر واپس نہ آنے والے نہیں دیکھے تھے۔ دیکھا تو اپنی بی والدہ کو.....

حاجیوں نے اس کی جھولی مکر سے لائے تبرکات سے بھر دی تھی، امیر راج نے اسے تحائف دیے تھے لیکن..... دنیا میں ماں کا کوئی نعم البدل ہو سکتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ دنیا کے سارے خزانے اور سارے رتبے ایک ماں دے سکتے تو تڑپنا ہی کس بات کا تھا۔

وہ بھی یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ جو لوگ بے ضرر ہوتے ہیں، انہیں ہی سب سے زیادہ ضرر کیوں پہنچتے ہیں۔ جو اللہ کے راستے پر ہوتے ہیں انہیں ہی کیوں تکواریوں کے زخم ملتے ہیں۔ کیا بدو جانتے نہیں کہ حاجیوں کا کیا مقام ہوتا ہے۔ وہ کاروان حج کو کیسے لوٹ سکتے ہیں۔

وہ بدوؤں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ایسی بیوہ عورت جس نے جوانی کو بڑھایا کر لیا اور اگلی اولاد کی پرورش میں چکی نہیں چیں کر رزق کیا، ایسی عورت کو لوٹ کر، مار کر انہیں کیا ملا؟ کیا انہیں دکھائی نہیں دیا کہ اس کی پیشانی پر سجدوں کے نشان کتنے گہرے تھے، اور اس عورت کی عاجزی کیسی بلندی پر تھی۔ انہوں نے ایسی صابر عورت کو ہلاک کیوں کیا؟

اٹھارہ سال بعد وہ خود امیر راج بن چکا تھا۔ یہ عام رتبہ نہیں تھا، دمشق سے چلنے والا کاروان حج اور قاہرہ سے چلنے والا کاروان کسوة الکعبہ..... عالم اسلام کے یہ دونوں کارواں، عالم اسلام کا فخر تھے۔ ایسا بل جو عازمین حج کو ان کی منزل تک پہنچاتے تھے۔ مصر اور دمشق کو اپنے کاروانوں پر فخر تھا۔ امیر راج بھی بل پر جان رکھتا تھا اور خطروں کی شررگ پر تلواریں اس کی لیاقت اور سمجھ کو لاکارنا آسان نہیں تھا۔ خلیفہ امیر راج کو مقرر کرتا تھا، اور امیر راج حاجیوں کی آنکھ کا تارابن جاتا تھا۔

پہلے کاروان حج میں اس نے بدوؤں کے دو

حصول کو پس کر دیا تھا۔ اس نے کسی حاجی پر آنکھ آنے دی تھی۔ رات کا آسمان، آسمان کے چہرے گواہ تھے کہ اس نے ایک ایک حاجی کے حج سے برکت سمیٹی ہے۔ حاجی سفر کی جو داستانیں اپنے ساتھ لائے تھے، ان میں امیر راج کی شجاعت اور لیاقت کی داستانیں سب سے نمایاں تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مصر کی آنکھ کا ستارہ بن گیا تھا۔ خلیفہ اور سب بڑوں نے اس بار بھی کاروان کو اس کی سربراہی میں دیا تھا۔ اس کے نام پر اختلاف کی وجہ ہی نہیں بنی تھی۔

درویش اسی امیر راج کے پاس آیا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی صف میں ساتھ ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ مسجد میں حج پر جانے والوں سے صفیں بھری ہوئی تھیں۔ درویش دیکھ سکتا تھا کہ عرب و عجم ایک جماعت کا حصہ ہیں۔

”تم بلاشبہ خوش نصیب ہو امیر! تم پر خدا کی خاص رحمت ہے.....“

”رحم سے میرا تو آپ بھی نظر نہیں آتے.....“ ابن موسیٰ نے ہنس کر کہا۔ دونوں میں دوستی کی نوعیت ایسی تھی کہ ملاقاتیں زیادہ نہیں ہوتی تھیں لیکن جب بھی ہوتی تھیں محبت کی گرمی، اپنا سورج بلند رکھتی تھی۔

”دعا کے لیے ہاتھ مت گرانا امیر! پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو..... اللہ کو اپنا کون سا بندہ سب سے زیادہ عزیز ہوتا ہے؟“

”کوئی ایک بندہ تو عزیز نہیں ہوتا درویش!“ ابن موسیٰ حیران تھا کہ آج درویش اسے بار بار ”امیر“ کے لقب سے ہی کیوں بلاتا تھا۔

”وہ جواب دو جو اس وقت تمہارے دل میں ہے.....“

”جو خدا کے بندوں کو بلا تفریق تقسیم دے، نہ کوئی عربی، نہ عجمی..... نہ کالا نہ گورا..... فوقیت بس عمل کی، باقی سب برابری۔“

”مجھے تمہارا جواب پسند آیا، تم سے اسی جواب کی امید تھی، کیا میری عمر کا لحاظ کر کے تم میرا ایک کام

کر سکتے ہو امیر؟“

ابن موسیٰ نے قہقہہ لگایا۔

”آپ مجھے بار بار امیر کیوں کہہ رہے ہیں؟“

”کیونکہ میری حاجت امیر راج سے ہے، ابن موسیٰ سے نہیں۔ ابن موسیٰ میرا دوست ہے، اپنا دل ہی نکال کر رکھ دے گا۔“

”امیر راج بھی آپ کے لیے دل نکال کر رکھ سکتا ہے.....“ ابن موسیٰ نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا آپ پھر سے حج پر جانا چاہتے ہیں؟ اس کے لیے آپ کو اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”میں آپ کے لیے سواوی اور فرج کا انتظام کر سکتا ہوں۔“

”میں تین حصوں میں تقسیم ہوں..... کیا تم میرے تینوں حصے لے جاؤ گے۔“

”تین حصے..... یعنی تین لوگ..... ہاں میں تین حصوں کو لے جاؤں گا، لیکن آپ کے یہ تین حصے میری گردن پر زیادہ بھاری نہیں پڑنے چاہئیں۔ اسٹ کے کوہان کی عظمت بلند ہے لیکن امیر راج اپنی حد سے آگے عظمت نہیں دکھا سکتا۔“

”عظمت اپنی حد سے آگے گزر جاتا ہی ہوتا ہے امیر! قربانی اسے ہی کہتے ہیں جو ابراہیمؑ نے کیا، بھلا بیٹوں کی گردنوں پر چھریاں رکھی جاتی ہیں؟ حد میں رہ کر بھی کسی نے بھی عظمت پائی ہے؟“

ابن موسیٰ لا جواب ہو چکا تھا۔

”دیکھو، تم مسجد میں بیٹھے ہو، رحمان کے حضور موجود ہو، تم امیر راج ہو..... اپنے لفظوں سے نہ پھرنا۔“

”کسی کو زبان دے چکے ہیں آپ؟ ایسے پہلے کسی اصرار نہیں کیا.....“

”نہ زبان دی ہے نہ عہد کیا ہے..... ایک امتحان آیا ہے، اس پر کھرا اترتا ہے۔“

”آپ اور آپ کے امتحان درویش! اللہ والوں کو اپنی آزمائشوں کی بہت فکر رہتی ہے۔ مگر نہ کریں، آپ کسی ایک آزمائش میں ناکام ہو گئے تو

بھی آپ گناہ گار نہیں کہلائیں گے۔“

”تم سے ایسی بچکانہ بات کی امید نہیں تھی۔ انسان زندگی کے صحرا میں بھوکا پیاسا، در بدر پھرتا ہے اور پھر اسے رب کی محبت کا میٹھا پانی پینے کے لیے ملتا ہے۔ کیا وہ دیوانہ وار اس کی سمت نہیں بھاگے گا؟ کیا چیز اسے روک کر رکھے گی؟“

”وہ جو بھی ہیں، ان کے نام مجھے بتادیں، میں اندراج کروا دوں گا۔ میں انہیں اپنے ساتھ ضرور لے کر جاؤں گا۔“

درویش کی نظر مسجد کے منبر پر پڑھ گئی۔ ”تمہیں حج بتانا ضروری بھی ہے اور میرا فرض بھی۔ وہ تینوں مصر کی مشہور طوائفیں تھیں..... لیکن اب وہ تائب ہو چکی ہیں۔“

امیر راج نے بدو کی تلواریں گردن پر سہا تھا، شہرگ کٹتے کٹتے بچی تھی۔ اسے خوف آیا تھا نہ تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ اس کی شہرہ رگ پر ایک وار ہوا ہے۔ ”طوائفیں“ اس لفظ کا.....

”تھیں..... وہ تھیں..... چھ مہینے سے وہ میرے ساتھ میرے گھر پر ہیں۔ رات دن چکی ہیں کر محنت مزدوری کرتی ہیں۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہیں۔ رمضان کے روزے رکھتی ہیں، تہجد گزار اور فکر و عمل پر مائل ہیں۔ وہ تفسیر قرآن.....“

امیر راج نے ہاتھ بلند کر کے درویش کو روکا۔ اسے ان کی دینی لیاقت جاننے میں کوئی وجہ نہیں رہی تھی۔ ”درویش! مسجد میں بیٹھ کر ایسی باتیں نہ کریں.....“

”میں نے ان کے نام بدل دیے ہیں..... آئندہ..... جنت..... عزیزہ..... کیا یہ نام مسجد میں نہیں لیے جاسکتے؟“ درویش نے اطمینان سے پوچھا۔ ”گناہ ہو جانے پر اللہ انسان کو زمین کے کناروں سے باہر نکل جانے کے لیے نہیں کہتا، لیکن تم جیسا انسان کہتا ہے۔“

امیر راج بے یقینی سے درویش کو دیکھ رہا تھا۔



”کیا آپ پاگل ہو چکے ہیں۔ آپ جانتے بھی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں بالکل! میں جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ انہیں اپنے ساتھ جج پر لے جاؤ، اس سے بڑھ کر کیا نیکی ہوگی۔“

”نیکی؟ کیا آپ یہ اہتمام میری نیکی کے لیے کر رہے ہیں؟“ امیر نے طنز یہ پوچھا۔

”طنز نہ کرو ابن موسیٰ! تم اس خاتون کے بیٹے ہو جو صحرا میں شہید ہوئی، جس نے اکیس سال جج کی نیت باندھ کر رکھی اور محنت و مشقت کر کے تمہاری پرورش کی۔ تم اس خاتون کی اولاد ہو ابن موسیٰ! جس نے جج کا فریضہ ادا کیا اور شہادت کا درجہ پایا۔ تمہاری والدہ کی طرح انہوں نے بھی نیت باندھ لی ہے۔ بندگی کے صحرا میں، وہ بھی اس بیٹھے پانی کی طرف دوڑ کر، یا چل کر، یا ریک کر جانا چاہتی ہیں، جس سے سیرانی نصیب والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان پر یہ حد نہ لگاؤ کہ مسجد میں بیٹھ کر تم ان کا ذکر سننا گوارا نہ کرو، ایسی سخت نہ دکھاؤ، اتنے تکبر کا مظاہرہ نہ کرو۔“

ابن موسیٰ بری طرح سے جڑ بڑ ہوا، وہ سمجھ گیا کہ درویش اب اسے ابن موسیٰ کے نام سے کیوں بلانے لگا ہے۔ اب وہ اسے کارواں کا امیر نہیں سمجھ رہا، ایک عام انسان سمجھ رہا ہے۔ اس نے اسے اس عہدے سے برخواست کر دیا ہے۔

”درویش! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں امیر کارواں ہوں، خلیفہ نہیں۔۔۔۔۔ آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ کاروان جج کے ساتھ کسوة الکلبہ اور کلام پاک جا رہا ہے۔ عالم اسلام کو اس کاروان پر فخر ہے۔ مصر کے نیک سیرت، اعلا حسب نسب کے بچے منتخب کیے جاتے ہیں، انہیں حافظ قرآن بنایا جاتا ہے، پھر وہ غلاف کعبہ کے لیے کپڑا تیار کرتے ہیں۔ یہ وہ بچے ہیں جن کے منہ سے بھی کوئی گالی نہیں نکلی، جن کے والدین نیک چلن ہیں۔ عالم ہیں۔۔۔۔۔ شاکر ہیں، صابر ہیں۔“

”میں یہ سب جانتا ہوں ابن موسیٰ! تم مجھے یہ

کیوں بتا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں آپ کو یاد دلا رہا ہوں کہ یہ صرف حاجیوں کا کاروان نہیں ہے، یہ کارواں کسوة الکلبہ ہے اور اس کارواں کے ساتھ ”طوائفین“ نہیں جا سکتیں۔ خواہ وہ تابع ہی کیوں نہ ہو چکی ہوں۔ خلیفہ تک بات پہنچ گئی تو سارے عالم اسلام میں شرمندگی ہوگی۔ میں اپنے عہدے کی پرواہ نہیں کرتا، لیکن مصر کا فخر میرا فخر ہے۔“

”فخر۔۔۔۔۔؟ کیا فخر ابن موسیٰ! تین مسلمانوں کو تم اپنے کارواں میں شامل نہیں کرنا چاہتے اور بات کرتے ہو فخر کی۔ وہ تو یہ کر چکی ہیں۔ جسے ہمارا تمہارا رب قبول کر چکا ہے، تمہیں قبول کرنے میں کیا عار ہے؟ تم اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ توبہ کرنے والا نوسولود بچے کی طرح پاک صاف ہو جاتا ہے، چاہے اس کے گناہ زمین سے لے کر آسمان تک بلند ہی کیوں نہ ہوں۔“

ابن موسیٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”میں اس فرمان پر یقین رکھتا ہوں لیکن خلیفہ۔۔۔۔۔ حاجج کرام۔۔۔۔۔“

”اگر جج کے لیے جانے والوں کے دلوں میں اتنی وسعت نہیں تو انہیں اللہ کے گھر نہیں جانا چاہیے۔ اسلام آیا تھا تو باطل مٹ گیا تھا۔ باطل کو مٹا ہی رہے دو ابن موسیٰ! تمہاری یہ باتیں حق کے خلاف ہیں۔“

ابن موسیٰ آج سے پہلے کبھی اتنی مشکل صورت حال سے نہیں گزرا تھا۔

”ایک کام کریں، آپ انہیں کاروان سے الگ بھیج دیں۔ میں انتظام کر سکتا ہوں۔ وہاں پہنچ کر میں ان کا خیال رکھنے کی کوشش کروں گا۔“

درویش کی آنکھوں کی سختی درشتی میں بدل گئی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ خیال مجھے نہیں آیا ہوگا۔ میرے کچھ سوالوں کا جواب دو ابن موسیٰ! نماز کی فضیلت جماعت کے ساتھ ہے یا اکیلے میں۔۔۔۔۔؟ رمضان کے روزے آگے پیچھے ایک ہی مہینے میں کیوں

ہیں؟ وہ ہر سال کے ہر مہینے میں دو دو کیوں نہیں ہیں؟ سورتیں، آیتیں، پارے۔۔۔۔۔ یہ الگ الگ ہیں تو نام ہیں، یہ کیا ہیں تو قرآن ہے۔۔۔۔۔ بتاؤ کلام پاک میں ایسا اتحاد کیوں ہے؟

حضرت محمد ﷺ نے حضرت ابوبکر کو مدینے سے حج کے لیے سولوگوں کو قافلے کی صورت میں لانے کی ہدایت کیوں کی تھی؟ وہ حاجی، دو دو، تین تین یا دس دس کی صورت میں کیوں نہیں گئے تھے؟ دفاع ہو یا حمل۔۔۔۔۔ سپاہیوں کی جماعت ”شکر“ ہی کیوں ہے؟ وہ مگڑیوں میں کیوں نہیں؟“

ابن موسیٰ ششدر درویش کی صورت دیکھ رہا تھا۔

”میں آپ جتنا علم نہیں ہوں درویش!“

”علم والے انہیں بن سکے تو ”عمل“ والے بن جاؤ۔“

ابن موسیٰ نے خشکی سے درویش کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے درویش کو نظر انداز کر دیا، وہ کچھ اور لوگوں کی طرف بڑھ گیا جو اس سے کاروان سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ درویش چپ چاپ ابن موسیٰ کو دیکھتا۔ ابن موسیٰ اپنی پشت پر درویش کی نظروں کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔

”اللہ کے گھر کے لیے تین دن لے جاؤ امیر آج!“ درویش جیسے مرا تھے سے بیدار ہوا تھا۔ اس کی آواز بلند تھی اور وہ سب کو سنا دی تھی۔ سب نظریں ابن موسیٰ اور درویش کو دیکھ رہی تھیں۔

”رب الواحد“ کے لیے تین دن لے جاؤ امیر!

”تین عاشق، تین متوالے، تین دیوانے لے جاؤ امیر!“ درویش کی آواز ابھی بھی بلند ہی تھی۔ ابن موسیٰ نے حیرت سے درویش کی پچکانہ باتوں کو سنا۔ وہ خفا ہو چکا تھا۔ وہ درویش کی سمت لپکا۔

”آپ سے ایسی کم عقلی کی باتوں کی امید نہیں تھی۔“

”تم سے ایسی بھگ دلی کی امید نہیں تھی۔“

درویش نے انہوں سے کہا۔

”ایک اللہ“ کے لیے تین اللہ والے لے جاؤ۔“

یہ آخری بات تھی جو درویش نے کہی اور ابن موسیٰ کو مسجد میں ہی چھوڑ کر باہر آ گیا تھا۔ ابن موسیٰ نے لپک کر درویش تک جانا چاہا تھا، اسے بتانا چاہا تھا کہ جس چیز پر اس کا اختیار نہیں، اس کے لیے اسے مجبور نہ کیا جائے۔ وہ اسے عزیز رکھتا تھا لیکن۔۔۔۔۔

☆☆☆

عزیزہ نے دیکھ لیا تھا کہ درویش ادا اس صورت لوٹے ہیں۔ اس کے دل کو دکھ کا لگا تھا۔ درویش کی شہر میں بہت عزت تھی۔ انہیں انکار کرنا مشکل تھا اور اگر انہیں انکار ہو سکتا تھا تو اس کا مطلب صاف تھا کہ وہ مرکز بھی جج پر نہیں جا سکتیں۔ ایک دم سے انہیں احساس ہوا کہ توبہ کر کے وہ رب کے قریب تو ہو گئی ہیں لیکن مخلوق سے آج بھی اتنی ہی دور ہیں۔ آسمان پر ان کے گناہوں کے اعمال ناچے بھاڑ کر مناد بے گئے ہوں گے لیکن لوگ سب یاد رکھیں گے۔ ان کے نام بھی، ان کے گناہ بھی۔ انہیں معاف کر کے اللہ تو انہیں عزت اور رتبہ دے دینے والا ہے لیکن مخلوق کے دل کا میل دھکنے والا نہیں ہے۔ انسان۔۔۔۔۔ اس کا دل رانی کے دانے سے چھوٹا ہے، اور یہ انسان اپنا دل بڑا کرنے والا نہیں ہے۔

”ہمارا حسب نسب اور ہمارا ماضی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔“ چکی پیستے ہوئے جنت زیر لب پڑ بڑاتی تھی۔ درویش کی بیوی کم گو تھی لیکن اس نے تسلی بخش نظر جنت کی طرف اٹھائی تھی۔

”تم نے تو شکایتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔“

اس نے نرمی سے کہا۔

”کیا امیر آج نے اس لیے انکار کر دیا کہ ہم۔۔۔۔۔ ہم۔۔۔۔۔ آؤ منہ پوچھتے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔“

”آگے کچھ نہ کہنا آؤ! میرے دل کو تکلیف نہ دو۔ میں ایسی زمین پر آباد ہوں جہاں حق کی روشنی تو پہنچی ہے لیکن اس روشنی پر ابھی تک اندھیرے غالب ہیں۔ آج بھی لوگوں کی وہی سوچ ہے جو



اسلام آنے سے پہلے تھی۔ جن باتوں کو جاہلیت قرار دیا گیا، ان کے نام بدل کر لوگوں نے انہیں ”قاعدے قانون“ کا نام دے دیا۔ حق تو آگیا لیکن دلوں کا باطل نہیں مٹا۔“

آمنہ خاموشی سے اٹھ گئی۔ نہ اٹھتی تو پتا نہیں کتنے اور سوال پوچھ لیتی۔ وہ شوخ و چیل تھی۔ پیچھے جو کچھ چھوڑا، آگے اس سے بڑھ کر پالیا۔ کھروری زمین پر پیال پر سوتے ہوئے، اس نے اپنی ہی کو کند نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن اب اسے لگا کہ وہ بھی مسکرا نہیں سکے گی۔ وہ کبھی اس حقیقت کو بھول نہیں پائے گی کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتی رہی ہیں۔

”کیا ہمیں اپنے گناہ یاد رکھنے چاہئیں یا اوقات؟“ جنت نے درویش کی بیوی سے پوچھا۔ وہ دوسوں کا شکار تھی۔

”تمہیں صرف اللہ کی رحمت کو یاد رکھنا ہے، تمہیں تمہاری حیثیت خود بخود معلوم ہو جائے گی۔“

رحمان کی رحمت کو یاد رکھنے کے لیے انہیں اپنی حیثیت بھولنی تھی۔ عزیزہ خاموش تھی لیکن اندر ہی اندر غصے سے تل کھا رہی تھی۔ وہ اپنا غصہ نکال دینا چاہتی۔ درویش نے لاکھ سمجھایا تھا کہ غصہ عقل کا دشمن ہوتا ہے لیکن وہ اس دشمن کو بال پوس کر بڑا کر دیا کرتی تھی۔ عقل ویسے بھی ہر وقت استیصال میں نہیں لاتی جاسکتی تھی۔ وہ دل کی کمزور ہو سکتی تھی لیکن ارادوں کی مضبوط تھی۔

سرباز اور درویش سے پہلی ملاقات کے بعد اس نے نیت کر لی تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی جگہ چھوڑ دے گی۔ دو دن بعد وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر درویش کے ساتھ سیدھے راستے کی طرف آگئی تھی۔

راستہ جتنا سیدھا ہو، اس پر چلنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے۔ پتھر نہ ملیں تو نکلر ملتے ہیں۔ حق پر چلنے والوں کو اعزاز نہ ملے تو دھکا لگتی ہے۔ تاہم ہوتا آسان تھا، ہر وہ کام جو بندے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے، آسان ہوتا ہے۔ وہ آسانیاں دیتا ہے۔ فرض دیتا ہے تو قضا بھی رکھتا ہے۔ گناہ کے بعد توبہ کی

شفا بھی دیتا ہے۔ یہ وصف انسانوں نے نہیں اپنایا۔

تینوں کے لیے وہ رات کانٹوں کا بستر تھی۔ جس دن درویش انہیں ملا تھا، انہیں ہدایت مل گئی تھی۔ جس دن محل شریف پر ان کی نظر پڑی تھی، انہیں راستہ مل گیا تھا۔ جس لمحے جج کی نیت کی، اسی لمحے بندگی کی منزل دکھائی دی۔

سفر زندگی کا ہو یا بندگی کا۔ ارادے کی مضبوطی شرط ہے۔

یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ وہ کبھی بھی جج کے لیے نہیں جاسکتی گی، ان کے دل گہری اداسی میں گھر گئے تھے۔ کوئی امیرانج انہیں کاروان میں قبول نہیں کرے گا۔ کوئی انہیں خوش آمدید نہیں کہے گا۔ سب انہیں ملامت کریں گے کہ وہ کس کو الکجہ کے ساتھ سفر کرنے کی جرات بھی کیسے کر سکتی ہیں۔

☆ ☆ ☆ عزیزہ نے ایک جرات کی تھی۔ وہ میدان کاروان میں امیرانج کو ڈھونڈنے لگی تھی۔

میدان کاروان میں مصر اور قرب و جوار کی ریاستوں سے قافلے آچکے تھے۔ چند قافلے رہ گئے تھے جو اگلے دن تک پہنچنے والے تھے۔ شہر کے مہمان خانے، شاہی مراہیں، میدان، حاجیوں سے آباد ہو چکے تھے۔ میدان میں ہر طرف خیمے ہی خیمے تھے۔ قاہرہ کے لوگ حاجیوں سے ملنے کے لیے میدان کاروان آتے تھے۔

عزیزہ بھی آمنہ اور جنت کے ساتھ آئی تھی۔ درویش کی بیوی اپنے ساتھ کھانے پینے کی کچھ ایسی زبردست چیزیں لائی تھی جو سفر کی تھکان کو زائل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ وہ چند عورتوں کو بہت عاجزی سے وہ چیزیں پیش کر رہی تھی۔

عزیزہ نے امیرانج کو انتظامات میں مشغول دیکھ لیا تھا۔ وہ منہ بنائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ ضدی، بدتمیز اور منہ پھٹ مشہور تھی لیکن درویش کے کہنے پر اس نے ان بیماریوں سے جان چھڑائی تھی

لیکن ایک بیماری ابھی تک اسے چھٹی ہوئی تھی۔ وہ تھی بھڑک اٹھنے کی بیماری۔ چنگاری کے آگ بن جانے کی بیماری۔ اس کا دل چاہا کہ امیر کاروان کے پاس جائے اور کھری کھری سنا دے۔

وہ ایسا تو نہیں کر سکی لیکن ایک معمولی سا پتھر اٹھا کر اسے غیر معمولی انداز سے مارے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ امیر کاروان بھی جلالی انداز سے لمبے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ توپ کے گولے تباہ و برباد کر دیتے ہیں، وہ لوگ نوکیلے پتھر کو بھڑک کر دیکھیں۔ تباہ و برباد نہ سکی، خانہ برباد یہ بھی کر دیتے ہیں۔

پیچھے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سب موجود تھے۔ جس طرف نظر اٹھتی تھی انسان ہی انسان دکھائی دے رہے تھے۔ ہاں ایک لڑکی چادر میں منہ چھپا رہی تھی، اور ایسا کرتے ہوئے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس نے بھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گولہ مار کر توپ، زمین پر جم کر کھڑی رہی تھی۔

”تم نے مجھے پتھر کیوں مارا۔۔۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی تھی، پریشان بھی ہوئی تھی، گھبرا بھی گئی تھی لیکن۔۔۔۔۔

”آپ سے کس نے کہا کہ میں نے مارا ہے؟“ سوال کو گھمانا نہیں بھولی تھی۔

”میں امیر کاروان ہوں، صحرا کی ہوا اپنا رخ بعد میں بدلتی ہے میں اس کی سمت پہلے پلڑا لیتا ہوں۔“

”ہونہ! صحرا اور ہوا کے کچھ لگتے۔ ہاں مارا ہے۔۔۔۔۔ موقع ملا تو اور ماروں گی۔ کوئی جن مل گیا تو ابراہم اٹھوا کر دے ماروں گی۔ جنوں کی فوج مل گئی تو ساری دنیا کے پہاڑ اٹھا کر دے ماروں گی۔“

لڑکی غصے میں تھی، لیکن اس کی باتیں۔۔۔۔۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ہنستا چاہتا تھا لیکن سنجیدہ صورت پوچھ رہا تھا۔

”تم امیرانج کو لیکن دل کے سیاہ ہو۔۔۔۔۔“

مصر کی شان، قاہرہ کا ہر دل عزیز امیر کاروان، لوگ رک کر اسے سلام کرتے تھے، احترام دیتے تھے، یہ لڑکی اسے دل کا سیاہ کھڑی تھی۔ ”کون ہو تم؟“ کاروان میں شامل ہو؟

”ہاں، لیکن تمہارے کاروان میں نہیں۔۔۔۔۔ زندگی کے کاروان میں، جس کا امیر ”رب العالمین“ ہے۔“

وہ لاجواب ہوا تھا لیکن لڑکی کے غصے کی وجہ نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ جا چکی تھی۔ اس کی کمر لگ رہی تھی۔ اس جیسے پہاڑ انسان کے لیے معمولی سا سنگر آگ کا گولہ تو نہیں تھا لیکن پشت جل رہی تھی۔

☆☆☆

وہ گھر آیا تو بچے کاروان کاروان کھیل رہے تھے۔ وہ جج پر جانے والوں کے لیے قرعہ نکال رہے تھے۔ یہ اس کے خالہ زاد بھائی کے بچے تھے۔ اس کا ان سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر احمد سے۔ ٹھنڈے پانی کا پیالہ منہ سے لگا کر، نشست پر بیٹھ کر وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

اب وہ جانوروں اور انسان کی باتیں کر رہے تھے۔ راستہ دکھانے والے آسمان کے ستاروں اور ریت کے طوفان کی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر وہ ہنستا رہا۔ وہ اس کی نقل اتار رہے تھے۔ جب کاروان کی روائی کا وقت آیا تو کھیل میں شامل سب بچے اپنا اپنا سامان اٹھا کر اپنے فرضی جانوروں پر سوار ہو گئے۔ اور مٹی میں کھیلتا چھ سالہ احمد، ایک دم سے چل کر ان کی طرف لپکا۔

وہ عام بچوں جیسا نہیں تھا، اسے دماغی مسئلہ تھا۔ اس کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ ابن موسیٰ نے لپک کر احمد کو اپنی گود میں اٹھالیا۔ لیکن وہ چل رہا تھا، رو رہا تھا، سب بچوں کو گالیاں دے رہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ابن موسیٰ نے جلدی جلدی اس کا سامان تیار کیا اور اسے فرضی جانور پر سوار کر کے کاروان میں شامل کرنا چاہا تو امیر کاروان دانیاں چلا اٹھا۔



”یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا چچا۔“  
 ”لیکن کیوں؟ بھائی کو پیچھے چھوڑ کر جا رہے ہو، بری بات ہوئی ہے۔“  
 ”کیونکہ یہ روٹا اور چلتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ گالیاں دیتا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ برا انسان ہے۔۔۔۔۔۔“  
 ”یہ برا انسان نہیں ہے۔ اسے اچھے اور برے کی سمجھ نہیں ہے، جلد ہی یہ سمجھ دار ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔“  
 اس نے محل سے سمجھانا چاہا۔  
 ”جیسے اچھے برے کی سمجھ نہیں ہے، اس پر حج بھی فرض نہیں ہے۔“

اس کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔  
 ”حج ہر صاحب حیثیت مسلمان پر فرض ہے میرے بیٹے! بیمار یا تندرست پر نہیں۔“  
 ”یہ بیمار ہے، یہ اتنا لبا سفر نہیں کر سکتا۔“  
 ”یہ بیمار نہیں ہے۔ تمہارے بھائی کا دماغ اس کا ساتھ نہیں دیتا۔“

”جس کا دماغ ساتھ نہیں دیتا، اسے ہم ساتھ نہیں رکھ سکتے۔ ایسے انسان کا اللہ کے گھر میں کیا کام، جو ہر انسان کو برا بھلا کہے، اسے گالیاں دے۔ کیا بری زبان والے اللہ کا گھر دیکھنے کے حق دار ہیں؟“

”دوسروں کے حق پر لکیر کھینچنے والے تم کون ہوتے ہو۔ یہ نہیں جانتا، یہ کیا کہہ رہا ہے۔“ بچوں کی تنگ دلی پردہ پر کا بکا رہ گیا تھا۔

”جب یہ نہیں جانتا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے تو پھر وہ کیسے کہے گا جو اسے کہنا چاہیے۔ جو حاجی طواف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔“

”انسان اپنی حاضری کی گواہی زبان سے نہیں روح سے دیتا ہے میری جان۔۔۔۔۔۔“

”روح کیا ہوتی ہے چچا جان؟ ہم تو اس کی زبان کو جانتے ہیں جو گندی ہے، لکنت زدہ ہے۔ اس کا جسم بدبودار ہے۔ یہ ناپاک ہے۔ یہ اللہ کے پاک گھر میں کیسے جا سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ امیر کارواں اس کا بھائی ہے۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں یہ نا انصافی

نہیں کروں گا۔“  
 ”گندی، بدبودار، ناپاک۔۔۔۔۔۔“ ابن موسیٰ نے لب بڑبڑایا۔ بچوں کا کارواں اپنے فرضی جانوروں پر آگے بڑھ گیا تھا۔ پیچھے احمد دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ وہ اس کی گود سے پھسل گیا اور زمین پر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز، اس کے درد کی شدت۔۔۔۔۔۔ اس نے آگے چلے جانے والوں کو اور پیچھے رہ جانے والے کو دیکھا۔  
 جو پیچھے رہ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ دراصل وہی آگے والوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔

احمد کے آنسوؤں سے تر گالوں نے اس کا دل دو ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر کارواں والوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ کارواں کے امیر نے جھک کر احمد کو اٹھایا، اپنے سینے سے لگایا اور قہر کی گلیوں سے گزرتے ہوئے خود کو کہتے پایا۔  
 ”ایک اللہ کے لیے، ایک اللہ والا لے جاؤ۔۔۔۔۔۔“

نیت، عمل اور ارادے غلط ہو سکتے ہیں لیکن تڑپ ہمیشہ سچی ہوتی ہے۔ تڑپ بغیر کوئی نہیں روتا، بے چین ہوئے بغیر کوئی طلب نہیں کرتا۔ دعا ہو یا دوا، زخم ملے بغیر کوئی نہیں مانگتا۔ امیر کارواں نے قاہرہ کی پتھریلی زمین پر چلتے ہوئے خود سے کہا۔ احمد ابھی تک رو رہا تھا، چل رہا تھا۔ اس کے غم کو چین نہیں تھا۔ اس کے دل کو سکون نہیں تھا۔  
 وہ درویش کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔۔۔۔۔۔

”مجھے معاف کرو درویش! میں ان تینوں کو کارواں میں شامل کرتا ہوں۔ تم ان سے کہو کہ وہ اپنی شناخت چھپا کر رہیں۔ یہ بات ہم پانچ لوگوں کے درمیان دینی چاہیے۔“

دروازہ کھلتے ہی امیر الحج نے اپنی نم آنکھیں پونچھے بغیر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے درویش نہیں ”عزیزہ“ کھڑی تھی۔ وہ حیران امیر الحج کی صورت دیکھ رہی تھی۔ وہ شرمندہ تھی، خوش تھی، خوشی

سے بے قابو ہو رہی تھی۔  
 ”کس چیز نے آپ کے ارادے کو بدل دیا؟“  
 وہ پوچھے بغیر نہیں روہی تھی۔  
 امیر الحج نے دیکھا کہ اسے پتھر مارنے والی سامنے کھڑی پوچھ رہی ہے۔ اس نے احمد کی طرف دیکھا اور کہا۔  
 ”حق نے۔۔۔۔۔۔“

☆☆☆

ایک اللہ کے لیے تین اللہ والے۔۔۔۔۔۔  
 منہ اندھیرے نکل کر انہوں نے خیموں میں سے ایک خیمے میں پناہ لے لی تھی۔ وہیں سے انہیں اونٹوں پر سوار ہو جانا تھا۔ ابن موسیٰ نے ان سے سختی سے کہا تھا کہ انہیں کسی سے بھی بات نہیں کرنی۔ اپنی شناخت چھپا کر رکھنی ہے۔ خود کو گونا گونا کہتا ہے۔ کوئی ان کی آواز تنگ سے انہیں پہچان نہ سکے۔ حج کے لیے کیا جانے والا سفر مشکل ہوتا ہے، ان کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکل ہونے والا تھا۔

احرام، دینی قرآن پاک، جائے نماز اور کچھ ضروری سامان۔۔۔۔۔۔ یہی تو ہے اصل سامان۔۔۔۔۔۔ سفر حج اور سرفریات، دونوں کے لیے۔ پھر اس سے زیادہ کیا جمع کرنا۔ اس سے زیادہ کی چاہت کیوں کرنی۔

درویش نے انہیں نم آنکھوں کے ساتھ الوداع کیا تھا۔

”جس دن تم نے تابع ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہ دن میری زندگی کا خوب صورت دن تھا۔ اس دن میرے یقین اور پختہ ہو گیا تھا کہ ہدایت نصیب والوں کو نہیں، تویش والوں کو ملتی ہے۔ اللہ کسی کے دل میں راہی برابر بھی ایمان دیکھتا ہے تو اسے پوری ہدایت عطا کر دیتا ہے اور یہ اس تک ہی آتی ہے جسے یہ حاصل ہوتی ہو۔

جسے پیام مل گیا وہ جاہل نہیں رہا، جسے سیدھا راستہ دکھایا گیا، اس نے سب کچھ پایا۔  
 دین صرف کلمہ نہیں اور حج زیارت نہیں۔۔۔۔۔۔

نماز جسم کی حرکات نہیں اور قرآن لفظوں کا پلندہ نہیں۔۔۔۔۔۔ جو توبہ کرے، تابع ہو جائے، اس پر دین کا بار زیادہ آ جاتا ہے۔ جیسے عالم پر علم کا ذمہ ہوتا، جاہل تو بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ جو توبہ کر چکے ہوں وہ ایمان سے بری الذمہ نہیں ہونے چاہئیں۔

جو عہد کیے ہیں ان پر قائم رہنا۔ ایمان حاصل کرنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے۔ مومن بال سے باریک، بلوار سے تیز صراط (راستے) پر چلتا ہے۔ دیکھو، تمہاری طرف شیطان نے اپنا نشانہ باندھ لیا ہے، ان نشانوں کو خطا کرنا، لیکن خود خطا کار نہ ہو جانا۔ دین حق کا نام ہے، حق کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ نماز پڑھنا آسان ہے، اسے قائم رکھنا مشکل ہے، حج کے لیے کمر بستہ ہونا آسان ہے۔۔۔۔۔۔ اس حج کو ”پا“ لینا مشکل ہے۔ احرام سفید ہوتا ہے کیونکہ یہ اعمال کی سیاہی کو سمیٹ لیتا ہے، چھالیتا ہے۔

سفید۔۔۔۔۔۔ جس سے نکل کر ہر رنگ بنتا ہے۔ لیکن یہ کسی رنگ سے نکل کر نہیں بنتا۔ یہ خاص ہے اور یکساں بھی۔ تمہارے لیے اللہ نے یکساں رنگ کو پسند کیا اور بہترین رنگ تو اللہ کا ہی رنگ ہے۔ اسے اپنا لوگی تو پھر پیچھے رہ بھی جاؤ گی تو بہت آگے نکل جاؤ گی۔“  
 درویش نے کہا۔ انہوں نے سنا۔ انہوں نے یاد کر لیا۔ تینوں درویش کی احسان مند تھیں۔ درویش کی بیوی انہیں گلے سے لگا رہی تھی۔ انہیں رخصت کرنے والے بس یہ دو ہی لوگ تھے۔ کارواں کو رخصت کرنے مصر کا ہر خاص و عام آیا تھا۔ مسجد کے امام نے حاجیوں کے لیے اجتماعی دعا کروائی تھی۔ حج اور سفر حج کی فضیلت بیان کی گئی تھی۔

جس وقت اونٹوں نے اپنے گھٹے کھڑے کیے، اور حاجیوں کو رخصت کرنے والے ہجوم نے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے تو عزیزہ سے اپنی خوشی سنبھالنا مشکل ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے پیچھے بیٹھی آمنہ کو دیکھا۔ دائیں طرف جنت کا اونٹ تھا، وہ ایک خاتون کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان تینوں نے درویش کو ہجوم میں ڈھونڈنا چاہا لیکن درویش کی بیوی تو دکھائی







”ہاں..... یہی دیکھ لو کہ اتنے بڑے کارواں میں یہ سب چیزیں ہمیں ہی نصیب ہوئی ہیں۔ یہ ہماری ہی شخص، ہر صورت ہمیں ہی ملنی تھیں۔ انسان کو اللہ کی رحمت پر یقین ہونا چاہیے۔ اللہ اپنے بندوں کو تحائف دینا جانتا ہے اور وہ ان کے نصیب کی چیزوں کو حفاظت میں رکھتا ہے۔“

سورج سر پر تھا، دن بہت گرم تھا۔ کونئیں کے پانی سے منہ پر چھینٹے مارتے، کارواں والوں کی آوازوں کا شور سنتے گرم لو کے پھٹیڑے سہتے وہ سر جانے کی حد تک خوش تھیں۔ درویش نے بالکل ٹھیک کہا تھا، وہ اصل کے مقابلے میں گھائے کا سوداگر رہی ہیں۔ اگر وہ پلٹ کر اصل کی طرف نہیں آئیں تو بہت نقصان میں رہیں گی۔ توفیق کی رحمت نے انہیں گھائے کے سودے سے بچا لیا تھا۔ وہ نماز ظہر کے لیے اپنی جائے نماز بچھا رہی تھیں۔

ادھر ادھر کا رواں کھانے پینے، سستانے میں مصروف تھا۔ اونٹ بان اونٹوں کو پانی پلا رہے تھے۔ گھوڑوں کی ناز برداریاں کی جارہی تھیں۔ اونٹ جتنا اللہ لوک جانور ہے، گھوڑا اتنا ہی شوخا اور لاڈلا۔ پاؤں پاؤں چلنے والا بچہ بھی اونٹ کی ٹیل پکڑ کر اسے کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ درویشی اور عاجزی اونٹ کی روح پر اپنی غالب آچکی ہے کہ پیدا ہوتے ہی اس کے چہرے سے ”بزگ“ ٹھٹھکتی لگتی ہے۔ جانوروں میں ایسی بزرگ صورت صرف اونٹ کو ہی نصیب ہے۔

”کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا۔“ (القرآن)۔

کلام پاک میں مالک دو جہاں نے ان کا ذکر  
آسمانوں، پہاڑ، زمین سے پہلے کیا ہے۔ یہ نیمازی کی  
طرح جھکتا اور ایمان والوں کی طرح کھڑا ہوتا ہے۔  
اسی لیے یہ نبیوں کی سواری رہا ہے۔

عزیزہ کا سستانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ گھوم پھر کر کاروان دیکھ رہی تھی۔ اس نے چہرے پر نقاب بٹھینچا ہوا تھا۔ وہ کاروان کے لوگوں کو دیکھنا

چاہتی تھی۔ جو اس کے ہم سفر تھے۔ جو اس پر ڈاؤن  
اس کے ہم نشین تھے۔ اس کے لیے یہ کارواں ایک  
پورا جہاں تھا۔ وہ ساری دنیا نہیں محسوس کرتی تھی۔ لیکن  
وہ ساری دنیا سے اکٹھے ہوئے ”جہاں“ کو دیکھنا  
چاہتی تھی۔

ایک خاتون ٹھہر ٹھہر کر کلام پاک پڑھ رہی تھیں۔ وہ پڑھتی جانتیں، روتی جاتیں۔ چائیں وہ رب کی عظمت پر آیدیدہ تھیں یا اس کی محبت پر۔ کچھ دور ایک اونٹ بان سر کے نیچے بازو رکھے سو رہا تھا، اس کے دن کے خرائے، رات کے جھینگروں کو مات دے رہے تھے۔ اس کا اونٹ، اس کے سر پر جھکا اس سے لاڈ کر رہا تھا۔ اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لا کر اس کے منہ پر کھیل تماشہ کرتی کھبیوں کے کھیل برباد کر رہا تھا۔ عزیزہ ہنس دی۔

”کیسی بے فکری نیند ہے اس کی۔ جی چاہتا ہے، اس کے سر کے نیچے سے اس کا کلیہ، اس کا بازو کھینچ دوں۔“

”میرا خیال ہے کہ مجھے کچھ کنکریاں اکٹھی کر کے تمہیں دے ماری جائیں۔ تمہارے اندر کا شیطان ابھی بھی زندہ ہے۔“ آمنہ نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچ کر آگے کیا کہ وہ اس بے چارے معصوم کو مصو مانہ نیند سو لیتے دے۔

ادھر ادھر، یہاں وہاں کتنے ہی لوگ ٹولیاں بنا کر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ عزیزہ نے ذرا غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ ایک دوسرے کی زبان ٹھیک سے سمجھ نہیں رہے۔ لیکن وہ باتیں ایسے کر رہے تھے جیسے زبان اور کلام کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ انہیں سب سمجھ میں آ رہا ہے۔۔۔۔۔ انہیں سب معلوم ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ ہاتھ لہرا لہرا کر، جوش سے اشارے کرتے ہوئے، شاید وہ اپنی اپنی سر زمینوں کے قصے کہانیاں سنارہے تھے۔ عزیزہ کو شوق ہوا کہ کوئی قصہ اسے بھی سنائی دے جائے لیکن اس کے لیے ایسے ان کے قریب جا کر بیٹھنا تھا۔ جو وہ کر نہیں سکتی تھی۔ جنت نے اسے صاف

ساف دھمکی دے دی تھی کہ اگر اس نے یہ حرکت کی تو وہ واپسی پر درویش سے اس کی شکایت کر دے گی۔  
”کچھ کنکریاں تمہیں بھی پڑ جانی چاہئیں۔  
تمہارے اندر کا چٹل خورشید طان بھی اُسی تک زندہ ہے۔“ عزیزہ کا منہ بن گیا تھا۔

چغل خورشیدطان گردون کوخم دے کر آگے بڑھ گیا۔ دیوار کے سائے میں بیس بائیس عورتیں بیٹھیں بائیں کر رہی تھیں۔ کچھ شوہر کی، کچھ بچوں کی، باقی ساس کی..... ان کی بائیں لاجواب تھیں۔ تینوں ان کے ساتھ جا کر بیٹھ گئیں اور چغلماں سننے لگیں۔

”دیکھ لو، نکاح ایسا جان کا عذاب ہے۔۔۔۔۔“  
آمنہ نے جنت کے کان میں سرگوشی کی۔

”میرا خیال ہے کہ اصل عذاب صرف ”ساس“ ہے۔“ جنت کو بڑا مزا آ رہا تھا۔

”عورتوں کے شکوے ابھی ختم نہیں ہوتے، وہ صحرا کے سفر پر کارواں کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں، انہیں اپنا پیچھا نہیں بھولتا۔ شوہر، بچے اور عذاب از جان ساس.....“

دنیا میں کوئی عورت اتنی بدنام نہیں جتنی ”ساس“ ہے۔۔۔۔۔ ہے تاثر زدہ؟“  
”مجھے کیا پتا، میں نے کون سا کسی بدنام زمانہ ساس کو بھگتا ہے۔“

”اچھا چلو فرض کرتے ہیں کہ تمہاری ایک ساس ہے۔ تمہاری جان کا عذاب ہے تو تم کیا کر گے۔“

”کیا مطلب کیا کروں گی..... خدمت کروں گی، ساس کا دل بدلنے کی کوشش کروں گی، پھر بھی نہ بدلیں تو پھر ان کے ”دن“ اور ”جون“ دونوں بدل دوں گی۔ عزیزہ نام ہے میرا، ساس نامی معرکہ میرے لیے ہے اور ہوں گی۔“

تینوں نے قہقہہ لگایا لیکن دو تین عورتوں کا  
کانوں میں عزیزہ کے نیک ارادوں کی ہلک پڑچ  
تھی، وہ سر گھما کر اسے گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ وہ  
بدنیزلوکی کی شکل یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھیں تاکہ

بھول کر بھی وہ اسے اپنی بہونہ بنا لیں۔

بھول جانے والی ساری باتیں بھلا کر، وہ نئے سبق یاد کر رہی تھیں۔ صحرا کی کہانیاں سن رہی تھیں۔ عزیزہ ایک ٹیلے پر جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آمنہ اور جنت بھی قریبی ٹیلوں پر کھڑی ہو چکی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ بے آباد صحرا کو انسانوں نے آکر آباد کر دیا ہے۔ یہ صحرا جو اپنی شکل میں پورا تھا لیکن ادھورا تھا، اسے انسان نے آکر مکمل کر دیا تھا۔ زمین اپنے اوپر اور اندر چٹنی بھی خاصیتیں رکھتی ہے، پہاڑ، دریا، جانور، صحرا، چند پرند، خزانے..... ان سب خاصیتوں کو انسان کی روح کی سانس لگتی ہے تو وہ بھی سانس لینے لگتی ہیں۔ ہر شے کہیں نہ کہیں جا کر ”انسان“ سے جا ملتی ہے۔ ہیرا اپنی خاصیت میں کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو..... شان میں بلند تر، خوب صورتی میں ارفع، انسان کا ہاتھ، سانس، آنکھ لگے بغیر پتھر ہے..... پتھر ہے..... صرف پتھر ہے..... جو ہر کو جو ہری ہی نصیب نہیں ہوگا تو پھر وہ ”جوہر“ بھی کیسے ہوگا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”اللہ کتنا بڑا ہے.....“

”تو تمہیں یہاں آ کر معلوم ہوا ہے؟“

”میں نے قاہرہ کے غلوں سے صرف آسمان دیکھا تھا، قاہرہ سے دور یہ صحرا اور آسمان دونوں دیکھے تو مجھ پر آشکار ہوا کہ جس چیز کے کنارے نہ ہوں، وہ بہت بڑی ہوتی ہے۔ میں چھوٹی تھی تو میں نے سمندر کا سفر کیا تھا۔ اس سفر نے مجھ پر عجیب کیفیت طاری کر دی تھی۔ کشتی کے عرشے پر کھڑے ہو کر میں نے دیکھا تھا کہ پرندے دیوانہ وار سمندر کی وسعت پر پرواز کر رہے ہیں۔ صحرا اور سمندر، یہ پرندوں پر بھی نسبت طاری کر دیتے ہیں۔ اور پھر یہ دیوانہ وار پرواز کرتے ہیں..... یہی ان کی تسبیح ہے..... یہی ان کی ثناء ہے۔ انسان کو بھی ایسے ہی دیوانہ وار ثناء خواں ہونا چاہیے۔“

”زمین کہیں تو ختم ہو ہی جاتی ہوگی عزیزہ!“



آمنہ عزیزہ کے تدبیر سے متاثر ہوئی تھی۔  
 ”کائنات بھی کہیں ختم ہوئی جاتی ہوگی۔ لیکن  
 یہ شروع کہاں سے ہوئی ہے۔۔۔۔۔ اصل عظمت تو اس  
 میں ہے۔“

”اب تم عالموں جیسی باتیں کر رہی ہو۔“ جنت  
 نے چلا کر کہا کہ آواز اس تک چلی جائے۔

”کیا اسی لیے حج فرض ہے کہ ہر انسان زمین  
 کا سفر اختیار کرے، کہ اس پر رب کائنات کی عظمت  
 کی نشانیاں آشکار ہوں۔ وہ زمین پر چلے پھرے اور  
 دیکھے۔۔۔۔۔ دیکھے کہ اس کا رب ہر شے پر غالب  
 ہے۔ ہر روح اس کی نمائندہ ہے۔۔۔۔۔ میں نے صحرا  
 کی رات میں اپنی روح کی آواز سنی ہے۔ وہ کہتی ہے  
 ایک مجیدہ جسم کرتا ہے، ایک مجیدہ روح کرتی ہے،  
 انسان کو اپنے نفس کو اس روحانی جہدے پر مائل کرنا  
 چاہیے۔ اسے ایسے جھک جانا چاہیے کہ منگڑی کو مٹا  
 دینا چاہیے۔ میں نے صحرا کو بڑا فرماں بردار پایا ہے  
 اور مجھے اس سے بہت شرم آئی ہے۔ یہ تجاہد ہے، جلتا  
 ہے، تڑپتا ہے، لیکن یہ اپنی جگہ سے سرکنا نہیں ہے۔  
 یہ ہر حال میں فرماں بردار ہے۔ اپنی پیاس کے لیے  
 یہ بارش تک نہیں مانگتا۔ نہ ٹھٹھان، نہ بارغ و  
 بہار۔۔۔۔۔ یہ اپنے حال پر راضی ہے۔ اپنی خواہشوں  
 کی تڑپ کے لیے میں صحرا سے سبق سیکھنا ہوگا کہ گرم  
 ہوا، جھاڑیاں، کانٹے، میراب، ریت کے طوفان اور  
 نشان بدلتے صحرا کے راہنما۔۔۔۔۔ اگر ان سب کے  
 ساتھ صحرا قائم رہ سکتا ہے، تو انسان بھی رہ سکتا  
 ہے۔“

”تو کیا اسی لیے حاجیوں کو صحرا کے سپرد کیا  
 جاتا ہے تاکہ وہ اس سے سکھ کر آگے جائیں۔“ جنت  
 کو عزیزہ کی باتیں سمجھ میں آگئی تھیں۔

”سفر میں ملنے والا ہر نشان اُستاد ہے، راہنما  
 ہے۔ زندگی بھی تو ایک سفر ہی ہے۔۔۔۔۔“

ایک عورت انہیں دیکھ کر ان کے پاس آئی  
 تھی۔ وہ انہیں مجبور کے حلوے کی خشک ڈلی دے رہی  
 تھی۔

”یہ کھالو، یہ جسم کو چست و توانا کر دیتی ہے۔“  
 عزیزہ نے پوری ڈلی فوراً ہڑپ کر لی۔  
 ”تھوڑی اور جتنی توانائی ملے گی؟“

عورت نے ہنس کر اسے دو تین اور پکڑا دیں۔  
 ”تم تو ہوا ہو، تمہارا سستی سے کیا تعلق۔“

”بڑی بھونکی ہو ویسے تم۔۔۔۔۔ کیلی عی تین کھا  
 گئیں۔“ عورت کے جانے کے بعد آمنہ نے منہ بنا  
 کر کہا۔

عزیزہ نے قہقہہ لگایا۔ ذرا دور گزرتے ابن  
 موسیٰ کے پاؤں چلتے چلتے قہقہے سے گئے۔ اس نے  
 گردن کو ہلکا سا خم دے کر اسے دیکھا۔ غیر محسوس اس  
 کی کمر لگ اٹھی تھی۔ لیکن وہ زیر لب مسکرا بھی  
 دیا تھا۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیوں اسے چچی کی بات یاد آئی تھی  
 کہ اسے شادی کر لینی چاہیے۔

”لیکن تم جیسے اکثر مزاج انسان کے ساتھ کوئی  
 لڑکی خوش نہیں رہ سکے گی۔“ چچی نے جل کر کہا تو اس  
 نے گھور کر چچی کو دیکھا۔

”میں تو دعا کرتی ہوں کہ تمہیں کوئی ایسی لڑکی  
 ملے جس کی ترچھی نظر تمہاری آدمی جان نکال  
 دے۔“

”اور جس کی برچی نظر آپ کی پوری جان۔“  
 اس نے جل کر کہا تھا۔

عزیزہ کی پشت پر پوری نظر ڈال کر، وہ آگے  
 بڑھ گیا تھا۔ لیکن انسان دیکھ جیسے رہا ہو، اور قدم  
 آگے بڑھا رہا ہو تو کہیں نہ کہیں اچھڑ کر رہی جاتا ہے،  
 وہ بھی اونٹ کی منہال سے اچھڑ کر گر پڑا اور اونٹ بان  
 جو لوہیوں میں بیٹھے تھے، منہ کھول کر ہنسنے لگے تھے۔  
 امیرانج بھی گرتے ہیں، یہ دیکھ کر انہیں بہت خوشی  
 ہوئی۔

”والد کہتے ہیں جس انسان کے قدم زمین پر  
 اور نظر آسمان کی طرف ہو، وہ انسان دیوانہ ہوتا ہے۔  
 آپ کی دیوانگی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے امیرانج؟“  
 ”اپنے ذات اندر رکھو، ورنہ یہ دیوانہ انہیں  
 باہر نکال دے گا۔“ امیرانج واقعی میں دیوانہ تھا۔

”آپ تو غصے میں بھی ہیں۔۔۔۔۔ کیلا انسان  
 غصے کا تیز ہوتا ہے۔ آپ نکاح کیوں نہیں کر لیتے۔“  
 امیرانج ہکا بکا اونٹ بان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ کیا  
 اب زبان خشن بھی اس کے نکاح کی ہی بات کرے  
 گی۔

”کیا قاہرہ کا کوئی خاندان آپ کو اپنی فرزندہ  
 میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے؟“ اونٹ بان کا مذاق  
 ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

”قاہرہ کے خاندان مجھے فرزندہ میں لیں یا نہ  
 لیں، لیکن قاہرہ کے قید خانے تمہیں شرف ”قید“ میں  
 لینا پسند کریں گے۔“

”اوہ! اچھا اچھا۔۔۔۔۔ لیکن کیا ہی اچھا ہو جو آپ  
 حاجیوں سے کہہ دیں کہ وہ آپ کے لیے نکاح کی دعا  
 کریں۔ کیا پتا اللہ کے گھر میں ہی آپ کا نکاح ہو  
 جائے۔ امام کعبہ کو خوشی ہوگی امیرانج کا نکاح  
 پڑھانے میں۔“

خوشی تو اسے بھی ہوگی لیکن۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔

امیرانج نے سر کو جھٹکا۔ والدہ ہوش تو اور بات  
 تھی، وہ کارواں کا امیر بن کر، اپنے پیچھے اپنی اولاد کو  
 یتیم کرنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ اس کا خوف  
 تھا۔ وہ ابھی تک اس خوف سے نہیں نکلا تھا۔ اسے لگتا  
 تھا کہ اس کا پتا بھی اس کی واپسی کا انتظار کرے گا اور  
 پھر قاہرہ کی خاک کو اپنے سر میں ڈالے گا۔ وہ بھی روتا  
 جائے گا اور کہتا جائے گا۔

”اب میں بھی چولے کی راکھ اور زمین کی  
 خاک سے بدتر ہوں۔۔۔۔۔ بدتر ہوں۔۔۔۔۔“

☆☆☆

”صرف چھ مہینے میں ہم کہاں سے کہاں آ پہنچے  
 ہیں۔ اسے کہتے ہیں رب کی شان۔“ جب سے سفر  
 شروع ہوا تھا، جنت بہت خوش باش رہتی تھی۔ وہ ان  
 دونوں سے اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔

”رب کی شان کی نشانیاں اکٹھے کرنے ہی تو  
 حاجی سفر حج اختیار کرتے ہیں۔“

عزیزہ زیر لب بولی۔ اس کا دل تدبیر کی

گہرائیوں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ  
 ہیر اور پتھر وزن میں برابر ہو بھی جائیں تو خاصیت  
 میں نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ اعمال کی سختی  
 میں بہت آگے ہوں لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے وزن کے  
 میزان میں ان لوگوں سے آگے نکل جائیں جن کے  
 اعمال میں ہیروں کی خاصیت ہو۔ اس لیے حساب  
 کتاب میزان کے سپرد ہے۔۔۔۔۔ وزن میں۔۔۔۔۔ سختی  
 میں نہیں۔۔۔۔۔ کچھ سختی ہیں اور کچھ عالم ہیں۔ کچھ  
 نمازی، اور کچھ برہیز گار، کچھ اخلاق والے اور کچھ  
 انصاف والے۔ کچھ گناہ کرتے ہیں، تو بہ کرتے ہیں،  
 توبہ توڑتے ہیں، پھر توبہ کرتے ہیں، لیکن کوئی نہیں  
 جانتا کہ کبھی نہ گناہ کرنے والا میزان میں اٹھ جائے  
 والا ہے، یا بار بار گناہ کر کے توبہ کرنے والا جھک  
 جانے والا ہے۔ کون خاصیت میں زمرہ ہے، کون  
 چاندی، کون سونا، کون ہیر اور کون ”کوہ نور“۔

تین کوہ نور۔۔۔۔۔ تین ہیرے۔۔۔۔۔ ورنہ تین  
 خاک نصیب۔۔۔۔۔ اپنی اپنی سواریوں پر سوار، سر اٹھا  
 کر، سر جھکا کر، تسبیح میں مصروف ہیں۔

انہوں نے اب جانا ہے کہ خاک کے تیلے کو  
 سکون بھی خاک ہو کر ہی ملتا ہے۔ خاک چھان کر ہی  
 ملتا ہے۔ در بدر خاک چھان۔۔۔۔۔ پھٹک کر ہی ملتا  
 ہے۔۔۔۔۔ ورنہ اس راہ میں، انعام تو ملتا ہے، لیکن  
 ”مقام“ نہیں ملتا۔

اپنے مقام، اپنے رتے کی شان کو برقرار رکھتے  
 ہوئے امیر کارواں، گاؤں گج کی حفاظت سے غافل  
 نہیں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک جا رہا تھا۔ وہ پوری  
 طرح سے چوکنا تھا۔ قافلے والے خوش بھی تھے اور  
 مطمئن بھی۔ وہ کھانا کھا چکا تھا، پانی کے لیے مشک کو  
 منہ سے لگایا ہی تھا کہ ابن منصور اس کے سامنے آ کر  
 کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس  
 کے دل کا حد بڑھ کر کینہ میں بدل چکا ہے۔ کندکوار  
 کی طرح وہ خود کو ناکارہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یہ  
 سفر کا چھپو وال دن ہے۔۔۔۔۔

”جن تین حاجیوں کے تم نے نام لکھوائے تھے،



تم نے ان کے بارے میں بتایا نہیں کہ وہ کون ہیں؟“  
امیر کارواں نے اطمینان سے پانی کی مشک کا  
منہ بند کیا۔ ”میں نے کوئی نام نہیں لکھوایا۔“  
سجید کی کہا۔

یہ انسان حج کی تیاریوں کے پہلے دن سے اس  
کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی موقع نہ آئے اور وہ  
اسے ”امیر الحج“ کے عہدے سے دھکا دے کر خود  
اس کی جگہ آکر کھڑا ہو جائے۔ یا کم از کم اسے سب  
بڑوں کی نظروں میں ہی گرا دے۔

”کیا بات ہے تمہاری..... یاد آیا، تم نے لکھوائے  
نہیں تھے، بلکہ خود لکھے تھے۔ سواری کے لیے وہ اونٹ تم  
نے شاہی اصطبل سے لیے تھے۔ کن کے لیے لیے تھے  
ابن موسیٰ؟“ وہ اسے امیر الحج نہیں کہتا تھا۔

”تم اندراج کی جانچ پڑتال کرتے رہے ہو؟  
تم میری ٹوہ میں رہتے ہو؟ کس لیے؟ اس لیے کہ اس  
سال بھی امیر کارواں کا قریعہ میرے نام لکھا ہے۔  
حسد کرنا چھوڑ دو۔ ہو سکتا ہے یہ میری زندگی کا آخری  
کارواں ہو جس کا میں امیر بنا ہوں۔ آج کی رات  
میری آخری رات ہو، جو نماز میں نے پڑھی ہے، وہ  
بھی آخری ہو۔ پھر؟“

”تم مجھ پر اپنی زندگی کی بے ثباتی ثابت  
کر کے مجھے متاثر نہیں کر سکتے۔ مجھے میرے سوالوں  
کے جواب دو۔“

”تمہارے سوال صحرا کے کانٹوں کی طرح  
نوکیلے اور ناکارہ ہیں۔ صحرا کے ڈاکوؤں کی طرح  
خواہش کے غلام نہ بنو! میں منصور! اسے فکس پر قابو پانا  
سکھو۔“ اطمینان بھی اور مسکراہٹ بھی۔ ابن موسیٰ  
نے ابن منصور کو جلا کر تور کر دیا تھا۔

”تم نے کارواں میں کن لوگوں کو جگہ دی ہے  
ابن موسیٰ.....“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔

”میں تمہاری تشویش پر حیران ہوں۔ یہ  
کارواں حج ہے اور جو مسلمان اپنی سواری رکھتا ہے،  
کھانا پینا اور کچھ خرچ وہ اس میں شامل ہو سکتا ہے۔  
تمہیں اتنی فکر کیوں ہے؟“

”مجھے شک ہے کہ تم نے بدوؤں کے  
جاسوسوں کو کارواں میں جگہ دی ہے۔ یہ جاسوس  
کارواں پر حملہ کروا دیں گے۔ وہ اپنے سردار کو  
کارواں کے راستے کی خبر دیتے ہوں گے۔“

ابن موسیٰ نے بے یقینی سے اس پاگل کو دیکھا  
اور پھر ایک دم سے قہقہہ لگا دیا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ میری والدہ بدوؤں  
کے ہاتھوں شہید ہوئی تھیں۔ میں بدوؤں سے  
سودے بازی کروں گا؟ تم پاگل ہو چکے ہو..... ہاں  
ہو چکے ہو۔“

”ایمان بدلتے دیر نہیں لگتی.....“  
”لیکن عقل آنے میں بہت دیر لگ جاتی  
ہے۔“ اس نے اس کے شانے پر چمکی دی۔ ”جاؤ جاؤ  
کر صحرا کی سانس کے ساتھ سانس ملاؤ، شاید صحرا  
تمہیں کچھ حکمت سکھا دے۔ مجھ پر نظر رکھنے سے بہتر  
ہے کہ تم اپنے دل پر نظر رکھو، کینہ مختل کا دشمن ہے،  
حسد اعمال کا، اور عداوت جان کی..... اپنی اپنی تینوں  
خصلتوں پر رحم کرو، اور انہیں مشقت سے نکال لو۔“

ابن منصور منہ پھیر کر چلا گیا۔ لیکن اس کی چال  
بتا رہی تھی کہ وہ باز آنے والا نہیں ہے۔  
وہ ساری رات سفر کرتے، آسمان کے ستارے  
ان کے اشارے تھے، انہیں راستے بتاتے تھے۔ صحرا  
کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے گزرتے ہوئے ان  
کے ساتھ چار حاجی شامل ہوئے تھے۔ گاؤں والوں  
نے چار حاجیوں کو کچھ ایسے رخصت کیا تھا کہ دس ہزار  
کا کارواں مہبوت رہ گیا تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے  
ان کا استقبال بھی کھلے دل سے کیا تھا۔ یہاں کنوئیں  
سے پانی پیتے ہوئے، منہ ہاتھ دھوتے ہوئے اس کی  
نظر امیر الحج کی طرف گئی تھی۔ وہ تینوں اس کا شکریہ  
ادا کرتا جا رہی تھیں لیکن انہیں کوئی موقع ہی نہیں مل رہا  
تھا۔ عزیزہ کو تو معذرت بھی کرنی تھی اس کا گناہ بھی  
بڑا اور عظیم تھا۔

”امیر الحج! اچھا انسان ہے، تم نے خواہ مخواہ  
اسے پتھر مارا.....“ آمنہ کی یادداشت کی یہ خرابی تھی،  
”خبر بات یاد رکھتی تھی۔“  
”اس پتھر پر اسی کا نام لکھا تھا، اس پتھر کو اسی کو  
جا کر لگنا تھا۔“ عزیزہ کو ابھی تک پتھر مارنا حق بجانب  
لگ رہا تھا۔  
”دیکھنا کسی سانپ پر تمہارا نام نہ لکھا ہو، سنا  
ہے، صحرا سانپوں کا گھر ہوتا ہے۔ تمہیں کانٹے میں وہ  
سانپ بھی حق بجانب ہوگا۔“  
صحرا سانپوں کا گھر تھا یا نہیں لیکن وہ عجائبات کا  
مرکز ضرور تھا۔ صحرا کی راتیں حسن کی پیشانی پر چوتھا  
چاند تھیں۔ جب تک ان کی نظریں اپنے حسن و جمال  
پر رہی تھیں، وہ کائنات کے حسن تک نہیں پہنچ سکتی  
تھیں۔ انسان خالق کی شائبہ ہی بیان کرے گا،  
جب وہ اس کی تخلیق پر غور کرے گا، ورنہ وہ خود میں  
نہی الجھا رہے گا۔  
”میں ایسی رات میں ہزاروں سال تک سفر کر  
سکتی ہوں۔“ عزیزہ نے جذب کے عالم میں کہا۔  
”اچھا..... اونٹ سے نیچے اترتے ہی تم اپنی کر  
مٹنے لگتی ہو۔ تمہاری ہڈیوں کے جھنجھے کی آوازوں سے  
جانور تک بدک جاتے ہیں۔“ دن میں صحرا کی ریخت گرم  
ہوتی تھی، رات میں آمنہ کی زبان گرم ہو جاتی تھی۔ وہ  
سچ (طنز) کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔  
”میں حج کے لیے جا رہی ہوں اور تم مجھ پر طنز  
کر رہی ہو۔ عزت دو مجھے.....“  
”عزت کی حق وادرم اکیلی ہو کیا..... کل تم نے  
میرے پیٹ میں کیا چھپوایا تھا، میری جان حلق میں  
آگئی تھی۔“  
”پتا نہیں تمہیں اونٹ پر بیٹھ کر نیند کیسے آ جاتی  
ہے، تمہارے خراثوں سے اونٹ کی چال ڈلگ رہی تھی۔  
اونٹ بان بھی کچھ خوف زدہ سا تھا۔ اس لیے میں نے  
تمہیں ایک بے ضرری لکڑی کی شاخ چھو دی تھی۔“  
”تم ایسے بے ضرر تھیا رہی اپنے ساتھ رکھتی  
ہو۔ تم حج پر جا رہی ہو یا جنگ پر..... کچھ شرم ہے یا  
نہیں؟“  
”شرم کا کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو۔ لکڑی کی وہ

شاخ ابھی ابھی میرے پاس ہے..... چپ کر کے  
بیٹھو، جاہل.....“

آمنہ نے گھور کر اسے دیکھا اور سر کو جھٹک کر، منہ  
پھلا کر سامنے دیکھنے لگی۔ وہ کئی بار جنت سے کہہ چکی تھی  
کہ وہ عزیزہ کے ساتھ بیٹھ جائے، لیکن جنت اس  
خاتون کے ساتھ ہی چکی ہوئی تھی۔ انہیں اپنی والدہ بنا  
لیا تھا۔ ہر وقت ان کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔ اونٹ  
سے اترنے کے بعد، قیام کے دوران وہ ان کے جسم کو  
آرام دینے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ خاتون بیمار تھیں  
لیکن اپنی بیماری کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ بیمار کو  
کارواں میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی  
بیماری کی نوعیت عجیب سی تھی، جسم اچانک بہت گرم ہو  
جاتا، کان اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا۔ پورا جسم کا پٹنے  
لگتا تھا، سر بہت زیادہ بٹنے لگتا تھا۔ اسی لیے وہ ہر وقت  
اپنا سر تختی سے باندھ کر رکھتی تھیں۔

”آپ کو تندرست ہو کر سفر کرنا چاہیے تھا۔  
انسان کو خود پر بار نہیں ڈالنا چاہیے۔“ آمنہ نے کہہ  
دی دیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن پچھلے کئی سالوں سے  
میری یہی حالت ہے۔ دوا بھی بہت کھائی ہے لیکن  
بیماری شاید مجھے پسند کر بیٹھی ہے، جانے کا نام نہیں  
لے رہی تھی۔ میں نے کہا لو پھر میں بھی تمہیں حج کر  
کے دکھائی ہوں۔ تم میری جان ہی کیوں نہ لے لو۔  
بیماری جسم چھوڑ کر جانی یا نہ جانی، اگر روح جسم کو چھوڑ  
جاتی تو میں کیا کرتی۔“

تینوں خاتون کی ہمت کی داد دے بغیر نہیں رہ  
سکتی تھیں۔ جنت تو اپنی سی پوری کوشش کرتی تھی کہ  
ان کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھ سکے۔ ایک بار عزیزہ  
اور آمنہ کے سامنے وہ جنت کی تعریفیں کر رہی تھیں کہ  
”بہت بیماری لڑی ہے۔ بہت سکھ دیا ہے مجھے۔“

”میرا خیال ہے، یہ جنت کو اپنے بیٹے کے  
نکاح میں لینا چاہتی ہیں۔ بار بار کہہ رہی ہیں کہ کسی کا  
اصل دیکھنا ہوتا تو سفر میں دیکھو۔ جنت مجھے گھری لگی  
ہے۔ کئی بار اپنے بیٹے کا ذکر بھی کر چکی ہیں۔“



”نکاح.....“ عزیزہ چونکی تھی۔ ”نکاح کا پیغام بھی آگیا۔“ وہ جنت کو دیکھ رہی تھی جو خاتون کو پانی پلا رہی تھی۔

”پیغام نہیں پاگل..... اشارہ.....“

”ہاں نکاح..... اب ہمیں جلد سے جلد ان کے نکاح کا انتظام کر دینا چاہیے۔“ درویش کی بیوی نے درویش سے کہا تھا تو درویش نے ایک گہری سانس لی تھی۔

”بڑے دل والے، بڑی مشکوں سے ملتے ہیں..... جو اللہ کی رضا.....“

درویش کی بات سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ سب فرائض ادا ہو سکتے ہیں لیکن ان کے نکاح کا فرض ادا نہیں ہو سکے گا۔ کوئی انہیں اپنے نکاح میں نہیں لے گا۔ انہیں ساری زندگی چلی ہی جیسی ہوگی جو انہیں بخشہ قبول ہے۔ انسان کی خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ جنت کے گالوں کی شرم دیکھ کر، اس کے دل میں ایک ٹیس اٹھی تھی، شاید خاتون نے اسے بھی کوئی اشارہ دیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ کاش ایسا ہو جائے کہ یہ خاتون اپنے بیٹے کے لیے جنت کا نکاح منظور کر لیں۔ حج پر جانے والوں کے دل کشادہ ہوتے ہیں اور صاف بھی۔ اس نے سوچا کہ وہ حج سے واپسی پر خاتون کو ساری حقیقت بتا دے گی۔ پھر درویش سے ملو اے گی۔ اگر ان میں سے کسی ایک کا نکاح بھی ہو جاتا ہے تو یہ بہت بڑی بات ہوگی۔

جنت کی خدمت بے لوث تھی، اسی لیے اس میں اثر تھا۔ خاتون پچھلے دس دنوں سے بیمار نہیں ہوئی تھیں۔ وہ جاتی و چوبند اور تر تازہ تھیں۔ وہ اس کی پیشانی چونکی تھیں۔ اسے دعائیں دیتی تھیں لیکن کیا خبر حقیقت معلوم ہو جانے پر وہ اسے ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہ کریں۔

☆☆☆

”سوال معمولی ہی سہی ابن موسیٰ! تم جواب دے کر اپنی جان چھڑالو۔ بس.....“

نہیں کر سکتا تھا کہ ابن منصور نے یہ بات کارواں کے ساتھ آنے والے، مصر کے خاص عہدے داروں تک پہنچا دی ہوگی۔ وہ سب باجماعت بیٹھے ہوئے اس کی سمت سوالیہ دیکھ رہے تھے۔

”کیا آپ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں؟“ وہ حیران سب کی سوالیہ نظریں دیکھ رہا تھا۔

”تم پر اتنا یقین ہے کہ شک کی گنجائش نہیں..... لیکن تاریخ گواہ ہے، پشت پر خنجر ہمیشہ اپنوں نے ہی گھونے ہیں۔“

”نہ میں کسی جنگ کا حصہ ہوں نہ تخت کا..... میری حیثیت کو بچانے..... خنجر اور غدار کی باتیں کر کے میری توہین نہ کریں۔“

ابن منصور نے طنز اُکھا۔

”تو آپ میرے دشمن کیوں بن گئے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں اب تک وہ اکلوتا امیر راج ہوں جس کے ساتھ اعلا خاندانی حسب نسب منسوب نہیں ہے۔ جس کے خاندان کی یا کسی عزیز بزرگ کی خلیفہ تک پہنچ نہیں ہے۔ میں اپنی لیاقت اور سمجھ سے اس عہدے تک پہنچا ہوں۔ آپ اس کا بدلہ مجھ سے نہیں لے سکتے کہ میں عالم اسلام کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہوں۔ یہ اللہ کی مرضی بھی ہے اور میری لیاقت بھی.....“

”تم اتنا بھڑک کیوں رہے ہو ابن موسیٰ! بس مجھے اتنا بتا دو کہ شاعی اونٹ تم نے کن کے لیے تھے؟“

”امیر راج ہونے کی حیثیت سے میں جتنے چاہے اونٹ لے سکتا ہوں۔ جسے چاہوں کارواں میں شامل کر سکتا ہوں۔“

”لے سکتے ہو لیکن کن کے لیے؟“

”جواہر میں اللہ اللہ کرنے سے فرصت نہیں..... جو اتنا فریب ہے کہ اپنے جوتوں کی مرمت بھی خود کرتا ہے۔ اور جس کے گھر کی غورتوں کے ہاتھ کا پا ہوا آٹا قاہرہ کی صاحب حیثیت عورتیں ازراہ ہمدردی خرید لیتی ہیں۔“

”آپ کا درویش کے لیے ایسا بل و لہجہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ اللہ والے ہیں اور یہ کوئی گناہ نہیں۔“

”درویش کی دو بیٹیاں ہیں اور جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ چھوٹی ہیں۔ یہ کون سی بیٹیاں ہیں جنہیں درویش نے اکیلے ہی بھیج دیا ہے۔“ ابن منصور کو اصل بات تک رسائی چاہیے تھی۔ اس کی دھنسی ہوئی تھیں حسد سے لبالب تھیں۔

”بیان کے بھائی کی بیٹیاں ہیں.....“

ابن منصور نے سر ہلایا۔ ”کیا تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ جھوٹ بولتے ہوئے تمہارا سینہ پھولنے لگتا ہے۔“

ابن موسیٰ نے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تمہیں کسی نے خبردار کیا ہے کہ امیر راج کو کچھ قل معاف ہیں۔“

یہ بات زہر میں بجھے تیر کی طرح ابن منصور کو لگی تھی۔

”تم مجھے قتل کرو گے..... مجھے.....؟“

”اب اپنی بکواس بند رکھو..... ہم کاروان حج میں شامل ہیں۔ کسوة الکعبہ اور محمل شریف ہمارے ساتھ ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنا ذاتی عناد و رمیان میں نہ لاؤ۔ میں کارواں کا امیر ہوں، مجھ سے دوبارہ اس لب و لہجہ میں بات نہ کرنا۔ حاجیوں کو اپنے شر سے بچاؤ۔“ کہہ کر وہ غصے سے چلا گیا تھا۔

وہ جب سے امیر راج بنا تھا، ان سب لوگوں کے دلوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ وہ پہلا امیر راج تھا جو کسی بڑے عہدے دار کا بیٹا، جیتجا، بھائی یا داماد نہیں تھا۔ وہ پہلا امیر راج تھا جس کی قابلیت اور لیاقت نے اسے کارواں کی سربراہی عطا کی تھی۔ اس کے استاد محترم خلیفہ کے دوستوں میں سے تھے، اور یہیں سے اس کے لیے امیر راج بننے کے راستے بنے تھے۔ اس نے اپنے استاد محترم کو مایوس نہیں کیا تھا۔

انسان پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور حسد پیدا ہو گیا تھا۔ حسد اتنی پرانی بیماری ہے۔ اس حسد نے شیطان کو کہیں کا نہیں چھوڑا تو یہ حسد انسان کو کہاں چھوڑے گا۔ اسے خلیفہ کے حاسدین کی پرواہ نہیں ہوئی تھی۔ وہ صرف چند لوگوں کو جواب دہ تھا۔ درویش نے ٹھیک کہا تھا، لوگ اسلام پر ایمان تو لے آئے ہیں لیکن وہ اپنے دلوں میں اسلام نہیں لائے۔ جو مذہب امن و سلامتی ہے، اسے یہ اپنے لیے جنگ و جدل کا میدان بنا رہے ہیں۔ بڑے عہدوں کے ساتھ بڑی ذمہ داریاں اور بڑے دشمن آتے ہیں۔ ابن موسیٰ کا سب سے بڑا دشمن ابن منصور تھا۔

ابن منصور.....

اتنے بڑے کارواں میں سے ان لوگوں کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا جو درویش کے گھر سے تھے۔ ایک ایک کا نام لینا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اندراج موجود تھا لیکن وہ امیر راج کے قبضہ میں تھا۔ لیکن تب یہ آسان ہو گیا تھا جب کاروان کے سفر کے ستائیسویں دن، پڑاؤ کے وقت، تین لڑکیاں امیر راج کے پاس کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے کہ ہم اس جگہ، اس مقام پر کھڑے ہیں۔ ہم نے زمین کے مختلف حصوں پر نمازیں ادا کی ہیں، تلاوت قرآن پاک کی ہے..... انجمنی ہواؤں کے سلام وصول کیے اور ٹھٹھے کنوؤں کے بانی پے ہیں..... یہ سفر..... یہ صرف آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔“

”میری وجہ سے.....“ اس نے عزیزہ کو دیکھا۔

”لیکن تم نے کہا تھا تمہارا امیر ”رب العالمین“ ہے۔ یہ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔“

”درویش کا کہنا ہے کہ اللہ ہمیں جو آسانیاں عطا کرتے ہیں، اس کا ذریعہ کوئی نہ کوئی ضرور بنتا ہے۔ ہماری اس آسانی کا ذریعہ آپ بنے ہیں۔ اس لیے ہم آپ کا شکر یہ ادا کر رہی ہیں۔“ عزیزہ اس کی یادداشت پر حیران تھی۔ کیا انسان تھا، درگزر کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔



”شکریہ..... پتھر مار کر..... یا پتھر مارے بغیر.....“ ایک دم سے اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ وہ سنجیدہ صورت کھڑا تھا، کاروان کا سر براہ تھا، ایسا مذاق یا طنز اسے زیب نہیں دیتے تھے..... تو پھر وہ سب نازیبا کام ہی کیوں کر رہا تھا۔

عزیزہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔ ”ایک معمولی سا پتھر تھا، بھول بھی جائیں اسے۔“ وہ شرمندہ کم ہوئی تھی، بل زیادہ کھایا تھا۔ جنت اور آئینہ خاموش کھڑی تھیں لیکن دلی ہی دل میں ہنس رہی تھیں، عزیزہ کتنی جلدی بھڑک اٹھتی ہے۔ آئینہ سوچ رہی تھی۔

”پتھر تو معمولی ہی ہوتے ہیں، لیکن جس نیت سے مارے جاتے ہیں، وہ نیت غیر معمولی ہوتی ہے۔“ ابن موسیٰ نے بات کہہ کر حیرت سے اپنی بات کو محسوس کیا۔ وہ ایسی باتیں ایک لڑکی سے کیسے کر سکتا ہے۔ اتنا شرمندہ کس لیے کرنا.....

”میں کوئی شیطان تو نہیں تھا جسے نکل کر مارا۔“ کہنے سے بازو پھر بھی نہیں رہا تھا۔

عزیزہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے، کہاں جا چھے۔ ”اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہمیں ٹھوکر لگتی ہے تو ہم ذرا سنبھل کر چلنے لگتے ہیں۔“ ٹھوکر اور نکل میں فرق ہوتا ہے۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ پر پہاڑ اٹھا کر دے باروگی۔ اہرام بھی.....

جنت نے تو کچھ سنجیدگی ظاہر کر دی لیکن آئینہ اپنی ہنسی قابو میں نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ ایک دم سے منہ پر ہاتھ رکھ کر کھسک گئی تھی۔ عزیزہ خفت سے دونوں کو دیکھ کر رہ گئی اور امیر انج کے قریب سے دور ہٹ گئی۔ ”کچھ گناہ (نکل) بہت بھاری پڑتے ہیں۔“

وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔ پاؤں جھٹک جھٹک کر چل رہی تھی۔ ابن موسیٰ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

ابن منصور بھی آنکھوں کو اندر دھنساے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ ان چاروں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ان تینوں کے پیچھے لپکا تھا۔

”درویش نے مجھ سے کہا تھا کہ میری بیٹیوں کا خیال رکھنا، لیکن میں چوک گیا۔ میں تمہارا چچا ہوں،

درویش کا عزیز دوست، ابن منصور۔“ وہ ان تینوں کے قریب جا کر کھڑا ہوا تھا۔ تینوں کے چہروں پر چادر کے پلو کھینچے ہوئے تھے۔ وہ تینوں تذبذب کا شکار تھیں۔ انہیں درویش نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا کہ کوئی ابن منصور نام کا چچا ہے، ان کا دوست ہے۔ لیکن پھر وہ درویش کو کیسے جانتا تھا اور ان تینوں کو بھی۔

”کوئی مشکل ہو تو تم مجھ سے کہہ سکتی ہو۔“ وہ ان کے تذبذب کو دیکھ رہا تھا۔ ”جی کیوں نہیں.....“ آئینہ نے کہا تو ابن منصور کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی تھی۔ یعنی وہ تینوں درویش کی بھینسیاں ہی تھیں۔

”تم تینوں بھینسی ہو؟“ تینوں کے چہرے کے رنگ بدلے جو ابن منصور سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔

”جی..... بھینسی ہی سمجھ لیں.....“ عزیزہ نے فوراً کہا۔

”بھینسی ہی سمجھ لیں.....“ ابن منصور زیر لب بڑبڑایا۔ ”والد کیا کرتے ہیں، کیا نام ہے ان کا؟“

قاہرہ میں ہی ہوتے ہیں؟“ تینوں کے رنگ اجڑ کر سیاہ ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے چھپے ہوئے تھے لیکن ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ ابن منصور کو حیران کر گئی تھی۔ تینوں جواب دیے بغیر پلٹ کر جانے لگی تھیں۔ ابن منصور حیران انہیں دیکھ رہا تھا۔ تیزی سے جاتے ہوئے، اپنی چادر کو درست کرتے ہوئے گھبراہٹ میں عزیزہ کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی سر کی سمت بلند ہو گیا تھا..... کہ اس کے ڈھیلے کرتے کی آستین ڈھلک کر کہنی تک جا پہنچی تھی..... اور.....

ایک رسم ہوا کرتی ہے، جس بچی کو فقیہ خانے لایا جاتا ہے، گرم سلاخ سے اس کے جسم پر ایک نشان داغ دیا جاتا ہے..... کچھ کے گردن کے نیچے، کچھ کے شانے پر اور کچھ کے کہنی سے ذرا اوپر بازو پر..... کہنی سے ذرا اوپر بازو پر..... عزیزہ کا وہ نشان، ابن منصور کے سامنے نمایاں ہو کر چھپ چکا

تھا۔ دولڑکیاں آگے جا چکی تھیں، عزیزہ کچھ پیچھے تھی، وہ لپک کر عزیزہ کے سامنے جا کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ”تو تمہیں اپنے باپ کا نام معلوم نہیں ہے، نہ ہی پیش.....“ اس نے ہاتھ بڑھا کر جھٹکے سے اس کا نقاب پھینچ دیا تھا۔ عزیزہ ہکا بکا رہی گئی تھی۔

”طوائف اپنی چال سے، ورنہ اپنی خوشبو سے..... ورنہ اپنی کھال سے پہچان لی جاتی ہے.....“

اس کا ہاتھ کھینچ کر، آستین کو کہنی کے اوپر جھٹکے سے چڑھا کر وہ اس کے نشان کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔

کڑی درویش سے شروع ہو کر ابن موسیٰ سے جا ملی تھی۔ عزیزہ ششدر ابن منصور کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اتنی حواس باختہ ہو چکی تھی کہ گردن موڑ کر جنت اور آئینہ کو بھی نہیں بلا سکی تھی۔

”طوائفیں حج پر جا رہی ہیں..... ہم پر خدا کا قہر نازل ہوگا..... ہم صحرائیں شاہ و بر باد ہوں گے۔“

ابن منصور نے بلند آواز سے کہا تھا۔ جنت اور آئینہ کے کانوں میں لفظ ”طوائف“ بڑا تو انہوں نے حیرت سے پلٹ کر ابن منصور کو دیکھا۔

”آپ کو شرم آتی چاہیے ایسی باتیں کرتے ہوئے.....“ عزیزہ کی آواز کانپ رہی تھی۔

”شرم تو تم تینوں کو آتی چاہیے، ورنہ ابن موسیٰ کو..... طوفان ہم سے ٹکرائیں گے۔ ہم ذلیل و رسوا ہوں گے۔ اس کاروان کے ساتھ غلاف کعبہ ہے اور اسی کاروان کے ساتھ ”تین طوائفیں.....“ ہم اللہ کے عذاب کے مستحق ہیں۔“

آئینہ اور جنت جہاں کی جہاں کھڑی رہ گئی تھیں۔ عزیزہ ابن منصور کی نفرت انگیز باتوں کی تاب نہیں لایا رہی تھی۔

”ہم توبہ کر چکی ہیں.....“ وہ رو بہ دی تھی۔ ”تم ہمیں برباد کر دینے والی ہو.....“ ابن منصور نے نفرت سے ان تینوں کو دیکھا۔

☆☆☆ بڑے عہدے جو بڑے دشمن لاتے ہیں، وہ ان ہی دشمنوں میں گھرا ان کے سوالوں کا جواب

# دین

فروری 2019ء کا شمارہ شائع ہو گیا

مزے دار ریپز اور دلچسپ مضامین کے ساتھ



اداکارہ ”گل رعنا“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

اداکارہ ”کنزہ ہاشمی“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“،

آواز کی دنیا سے ”محمد ہدایت سائر“ اس ماہ مہمان ہیں،

اس ماہ ”صفیہ ناز“ کے ”مقابل ہے آئینہ“

”ہوا کیل رخ بدل گئیں“ گفت عبد اللہ کا

سلطے دار ناول،

”شب نم کی سحر“ رخ چوہدری کا سلسلہ دار ناول،

”ساگر کنارے“ ام طیفور کا مکمل ناول،

”شام رنگ سیاہ“ امیل رضا کا ناول،

”عشق آتش“ ندا حسین کا مکمل ناول،

”فروری فیری ٹیل“ فطاحن علی کا ناول،

سیما بنت عاصم، طیبہ غفر مغل، دانیا آفرین

کے افسانے اور مستقل سلسلے،



دے رہا تھا۔

”وہ مسلمان ہیں..... ہر مسلمان کا اللہ کے گھر پر حق ہے.....“ وہ اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔  
”وہ طوائفیں ہیں.....“

”وہ انسان ہیں..... بس انسان.....“  
”ان کے جسموں پر ماضی کے نشان موجود ہیں..... ان کے گناہ.....“

”میں کسی نشان کو نہیں جانتا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ اگر کوئی حج پر جانا چاہتا ہے، تو کارواں میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔“

”حج پر حاجیوں کو لے کر جایا جاتا ہے..... ایسے ذلیل لوگوں کو نہیں۔“

”دلوں کے حال اور اعمال کا حساب اللہ پر چھوڑ دیں۔“

”اللہ نے معاملات طے کرنے کا اختیار انسان کو دیا ہے۔“

”امیر الحج ہونے کی حیثیت سے میں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔“

”اگر یہ سب درست تھا تو تم نے چھپا کر کیوں رکھا؟“

”اس لیے کہ آپ کی سوچ تنگ ہے.....“

”یہ تمہارا کاروان نہیں ہے، یہ کاروان مصر ہے..... تم جواب دہ ہو اور تمہیں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا ہوگا۔“

”اگر آپ نے غلطی ثابت کر دی تو میں سزا بھی بھگت لوں گا۔ بہتر ہوگا کہ مجھے مصر واپسی تک دو بارہ

کسی سوال کے لیے زحمت زد دی جائے..... وہ تینوں لڑکیاں بھی کارواں کے ساتھ ہیں۔ مجھے ان کے

ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے، جیسے مجھے آپ سب کے ماضی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ مجھے کسی حاجی

کے اعمال اور اس حاجی کے دل کے حال سے بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں امام کعبہ سے اس سلسلے

میں ضرورت بات کروں گا اور ان سے درخواست کروں گا کہ وہ خطبہ حج میں اس مسئلے پر بھی روشنی ڈالیں۔“

ابن منصور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو چکا تھا۔ ”تم ڈھیٹ ہو۔ تم اس عہدے کے لائق نہیں ہو۔“

”ہاں ابن منصور! میں ڈھیٹ ہوں لیکن اس عہدے کے لائق بھی میں ہی ہوں کیونکہ میرا دل صاف ہے۔ اب میں سمجھا کہ امیر الحج..... امیر کیوں

کہلاتا ہے کیونکہ وہ ہر مافی بات پر غالب آتا ہے۔ وہ صحرا کے ڈاکوؤں اور شیطان کے حملہ آوروں، دونوں

سے لڑتا ہے..... جب وہ جیت جاتا ہے تو پھر وہ ”امیر“ کہلاتا ہے.....“

”یہ تمہارا آخری کاروان ہے جس کے تم امیر ہو۔“ ابن منصور نے دانت چیر کر کہا۔

☆☆☆

حاجیوں کا کارواں چلا رہا۔ ان تینوں کے اونٹ انہیں اپنا سوار بنا کر آگے بڑھتے رہے۔ انہیں گمان بھی

نہیں تھا کہ جس سفر پر وہ نکلی ہیں، وہ سفر دراصل کتنا لمبا ہو جانے والا ہے۔ یہ سفر، اس کی منزل انہیں کہاں لے

جانے والی ہے۔ انہیں اونٹ کے کوہان سے آسمان قریب لگتا تھا۔ صحرا کی ریت پر بجدہ کرتے، اللہ کا قرب

نصیب ہوتا تھا۔ انہیں یہ یقین حاصل ہو چکا تھا کہ دنیا میں جتنے خوش قسمت لوگ موجود ہیں، وہ ان میں سب

سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔

وہ خوش قسمت تھیں، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ کاروان کے ساتھ حج پر جانے والی نہیں

تھیں۔ آج کی رات سے اگلی رات..... وہ اس سفر سے نکال دی جانے والی تھی۔

وہ تینوں..... تینوں ہی..... کوڑیوں کے مول فروخت ہو جانے والی تھیں۔

آمنہ..... جنت اور عزیزہ.....

سر بازار..... ان کی وہ قیمت لگنے والی تھی۔ جو آج سے پہلے کسی انسان کی نہیں لگی تھی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

خواتین اور شیواؤں کیلئے اپنی طرف کا پہلا باب

## خواتین ڈائجسٹ

فروری 2019ء  
کے شمارے کی ایک جھلک



✽ ”الف“ عمیرہ احمد کانول،

✽ ”حالم“ نمرہ احمد کانول،

✽ ”میرے پاس رہو“ افشین نعیم

✽ کانول ناول،

✽ ”آخری کنارے تک“ سدرہ حیات

✽ کانول ناول،

✽ ”میری طلب کا چاند“ فرح بھٹو

✽ کانول ناول،

✽ نگہت سیما، شازیہ الطاف ہاشمی، حبیبہ عمر،

✽ ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں،

✽ عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا فروری 2019ء کا شمار آج ہی خرید لیں



# سحر

شہزادو غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تکنیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا، اس کے اندر اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے ان کے ساتھ ایک بچی بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک انٹینشن برری تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیٹھک کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹری پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے و باج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شاہ ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔

خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگائی بھالی کی عادت ہے۔



ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبی اور در شاہ امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سر درد یا اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹیٹا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں، دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں، آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے پکڑ میں تھیں۔ معروف پیور وکریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہزادہ جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوا دیا تھا۔ رومیہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں جتنی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکیڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہزادہ کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہزادہ کی آمد ٹیٹا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہزادہ پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوبی اور در شاہ غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر بیٹھکے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا، وہاں محمد ہادی آپکا ہے۔ محمد ہادی فاریٹ آفیسر ہے، تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنی دوست سعد کو کسی اپنے بیٹھکے میں لے آیا ہے۔

مختتم علی کا بیٹا و باج شادی شدہ ہے لیکن گھر کی ملازمد صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹیٹا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہزادہ سے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شاہ اور طوبی محمد ہادی کے بیٹھکے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں، محمد ہادی سختی سے جوش آتا ہے تو در شاہ اسے دھمکی دیتی ہے، ان دونوں کے درمیان بحثن جاتی ہے۔

## تیسویں قسط





کمرے میں موجود تینوں مکین ایک دوسرے سے نظر پڑا چائے پیٹھے تھے۔

مسز عالیہ قریشی کے چہرے پر شدید صدمے کی کیفیت تھی جبکہ قریشی صاحب اور ان کی بہن فائزہ بیگم دونوں شرمندگی سے نظریں چرائے یوں بیٹھے تھے، جیسے ان کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

مسز عالیہ قریشی جو ایک ماہر قانون دان تھیں، جنہوں نے ساری زندگی کمرہ عدالت میں اپنے مخالفین کو کبھی ہار کر اپنے خلاف بولنے کا موقع نہیں دیا، جن کے کریڈٹ پر درجنوں ہائی پروفائل کامیاب کیسز تھے، جن کا نام ہی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، جن کا دعوہ تھا کہ سو پر دوں میں چھپی ہوئی چیز بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہ سکتی، وہ انتہائی مشکل اور پیچیدہ کیسز میں سے بھی کوئی نہ کوئی نکتہ نکال کر سب کو حیران کرنے کے ہنر سے واقف تھیں لیکن وہ اس وقت پچھلی پچھلی لگا ہوں سے اپنے شوہر اور سائیز میز پر رکھی منجھ بادی کی تصویر کو نکلے جا رہی تھیں۔ ان کا دماغ اس بات کو ماننے سے انکاری تھا کہ بادی ان کی سگی اولاد نہیں اور یہ کیسے ممکن تھا کہ پچھلے چوبیس پچیس سالوں میں کبھی ایک لمحے کو بھی ان کے ذہن میں ایسا خیال نہیں آیا۔

وہ ہمیشہ اس کے نقوش کو کبھی اپنے اور کبھی قریشی صاحب سے ملانے کی کوشش کرتیں۔ انہوں نے اپنے بچے کی زندگی کا ایک ایک لمحہ انجوائے کیا تھا اور اس کی پیدائش کے تقریباً دو تین سال تک اپنی لاء کی پریکٹس بھی چھوڑ دی تھی۔ ان کے پاس بادی کی زندگی کا ہر یادگار لمحہ تصویروں کی صورت میں محفوظ تھا اور اس وقت وہ وہی الم اپنی گود میں کھولے ہوئے بیٹھتی تھیں۔

”بادی ان کی سگی اولاد نہیں۔“

اس رنگوں کو کاٹ دینے والے انکشاف نے انہیں اگلے دس منٹ میں ہاسپٹل پہنچا دیا تھا، عبد اللہ صاحب اور ان کی بہن فائزہ تو ہکھلا کر رہ گئے جبکہ بادی نے شخص ان دونوں کو شکایتی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس حقیقت کو جاننے کے بعد مسز عالیہ قریشی کا بلڈ پریشر ایک شاکٹ کر گیا تھا۔

اگلا پورا دن وہ ہاسپٹل میں رہیں، وہ بار بار ماضی کو کھنگال رہی تھیں، اتنا تو انہیں بھی یاد تھا کہ ان کی پریکٹس خاصی پیچیدہ تھی اور بیٹے کی پیدائش کے بعد ان کو کبھی بتایا جا رہا تھا کہ بچہ نرمی میں ہے کیونکہ دنیا میں آنے کے بعد وہ صحت کے حوالے سے کافی مسائل کا شکار تھا، انہوں نے اپنے بیٹے کو کافی دن کے بعد دیکھا تھا کیونکہ وہ خود بھی کافی بیمار ہو گئی تھیں اور اس موقع پر ان کی اکلوتی ننڈا کٹر فائزہ نے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

مسز عالیہ قریشی کو جب سے اس حقیقت کا ادراک ہوا، وہ مسلسل روئے جا رہی تھیں، ان کو مسلسل ٹریکولائزر روئے کر نیند میں رکھا جا رہا تھا، ازتالیس گھنٹوں کے بعد وہ اس قابل ہوئی تھیں کہ کسی سے بات کر سکتیں۔

”بادی کہاں ہے؟“ انہوں نے مکمل ہوش میں آنے کے بعد بڑھال لہجے میں پوچھا۔

”آپ کی میڈیسن لینے گیا ہے، بس آتا ہی ہوگا۔“

فائزہ بیگم کی اس اطلاع پر عالیہ نے شکایتی نظروں سے اپنی اس اکلوتی ننڈ کی طرف دیکھا، جوان کی بہترین دوست بھی تھیں اور ان ہی کی وجہ سے ان کا اور عبد اللہ صاحب کا رشتہ ہوا تھا۔ وہ ان کی نظروں میں چھپا گلہ بھانپ کر جذباتی انداز میں گویا ہوئیں۔

”خدا کی قسم بھابھی! میں اگر ایسا نہ کرتی تو آپ کبھی اس تلخ حقیقت کو قبول نہ کرتیں۔ خود سوچیں تیرہ سال کے بعد آئی وی ایف پر وینجر کے بعد پیدا ہونے والی اولاد دنیا میں قدم رکھتے ہی اپنی سانسوں سے رشتہ توڑ لے تو وہ ماں زندہ رہنے کے لیے کیا جواز ڈھونڈے گی۔“

”اور غلطی ساری فائزہ کی نہیں، میری بھی ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ اپنے ہاسپٹل یا آس پاس میں

سے کوئی بچہ لا کر تمہاری گود میں ڈال دے، کیونکہ میں تمہیں اپنے بچے کے انتقال کی خبر دے کر مزید کسی ذہنی اذیت سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ عبد اللہ صاحب نے ان کی جامد خاموشی سے گھبرا کر اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”عالیہ! ذرا سوچو، تم نے تیرہ سالوں میں اولاد حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، ہر علاج، ہر ٹونکا اور دنیا جہان کے وظیفے کڑا لے۔ میں نے تمہیں راتوں کو اللہ کے سامنے گڑا کر روتے ہوئے دیکھا، تم نے بس ضد باندھ لی تھی کہ تمہیں ہر حال میں اولاد دے دیا جائے اور میں تمہیں اس حالت میں دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا تھا، تم نے اپنا کیریئر، اپنی ذہانت اور ہر چیز پس پشت ڈال دی تھی۔“ وہ انہیں ماضی کا وہ دردناک دور یاد دلارہے تھے۔

”جب ڈاکٹر نے تمہیں آئی وی ایف کروانے کا مشورہ دیا تو تم اس کے لیے بھی تیار ہو گئیں لیکن تمہارے پہلے دو پر وینجرز، تا کام ہونے کے بعد جب تیسری دفعہ ہمیں خوش خبری ملی تو تب میں نے بہت دعاؤں کی تھیں کہ اللہ پاک تمہیں مکمل اور بھرپور خوشی سے نوازے، لیکن ایسا نہیں ہو سکا، ہمارا بچہ دنیا میں آنے کے فوراً بعد ہی چل بسا۔“ ان کا لہجہ نرم ہوا اور وہ خاموش ہو گئے۔

”بادی کس کا بچہ ہے؟“ مسز عالیہ قریشی نے نظریں چرا کر دندھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ میری بیٹی فرینڈ ڈاکٹر باب کے ریفرنس سے میرے پاس آیا تھا، اس کے شوہر ریلوے پولیس میں تھے اور ڈیوٹی کے دوران انہیں یہ بچہ ایک اسٹیشن ماسٹر نے دیا تھا، باب نے جس رات مجھے سے ذکر کیا، اس رات آپ آریشن تھیٹر میں تھیں اور آپ کے بے بی کے انتقال کی خبر مل چکی تھی اور میں اور بھائی جان دونوں ہی خوف زدہ تھے کہ آپ یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گی۔“ فائزہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اور تم لوگوں نے اسے میری جھولی میں ڈال دیا؟“ مسز عالیہ قریشی بہتکل گویا ہوئیں۔

”بھابھی! اس بچے کو آپ ہی کی گود میں آنا تھا کیونکہ سر دیوں کی اس ٹھنڈی ہوئی رات کو ایک سنیان اسٹیشن کے بیچ کے نیچے لیٹا ہوا بچہ اگر پوری رات کسی جانور سے محفوظ رہا تو اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی حکمت تھی، آپ کو شاید یاد نہ ہو، لیکن یہ جب ہمارے پاس آیا تو اسے نمونہ ہو چکا تھا اور ڈاکٹر کے مطابق اسے فوری طور پر ماں کے دودھ کی ضرورت تھی، اور میں ان دنوں منامں کو فیڈ کرواتی تھی لیکن میں نے آپ کی اور اس بچے کی جان بچانے کی خاطر اسے اپنا دودھ پلایا تا کہ یہ ہمارے خاندان کا حصہ بن جائے۔“ وہ شرمندگی سے انہیں ساری بات تفصیل سے بتا رہی تھیں۔

”لیکن خدا کی قسم میرا مقصد آپ کو کسی قسم کا دھوکا دینا نہیں تھا، بچے کے لیے آپ کی دیوانگی ہم میں سے کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہیں تھی اور آپ کے اسی جنون نے ہمیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔“ فائزہ کی آنکھوں سے آنسو پھیلے۔

”مجھے تمہاری محبت اور خلوص پر کوئی شبہ نہیں ہے فائزہ! لیکن تم لوگ یہ بات صرف اور صرف مجھے بتاتے۔ بادی کے سامنے ذکر نہ کرتے۔ کیا سوچتا ہوگا میرا بچہ؟ یہ تلخ حقیقت جان کر اس کے دل پر کیا گزرے گی؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبا رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے، عبد اللہ صاحب کے دل پر گھونٹہ پڑا۔

”تم بادی کی ٹینشن مت لو عالیہ!“ ان کے شوہر نے نرمی سے انہیں دلاسا دیا۔

”کیوں ٹینشن نہ لو؟ میں مانتی ہوں، میں نے اسے پیدا نہیں کیا لیکن خدا کی قسم میرے دل و دماغ میں کبھی ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ میری گود میں پلنے والا بچہ میرا اپنا خون نہیں، میں نے ایک سگی ماں سے بڑھ کر اس کی پرورش کی، اس کے لیے اپنا کیریئر چھوڑ دیا، جب تک میرے بچے نے پاؤں پاؤں چلنا نہیں سیکھا،



میں نے ایک قدم اپنے گھر سے باہر نہیں نکالا، جب تک وہ اسکول جانے کے قابل نہیں ہوا، میں نے کورٹ میں جھانک کر نہیں دیکھا، میں اس کی بیماری کے دنوں میں راتوں کو جاگتی ہوں، اپنا دن کا سکون برباد کیا ہے، میں کیسے ٹینشن نہ لوں۔“ وہ جذباتی انداز میں رو پڑیں۔

”جہاں اتنے سال آپ نے اس حقیقت کو چھپائے رکھا، کاش باقی زندگی بھی ایسے ہی چپ رہتے۔“ ان کی آنکھوں سے آنسو ایک لڑی کی صورت میں بہہ رہے تھے۔ ہر وقت کمپوزر بننے والی مسز عالیہ قریشی بہت برے طریقے سے ٹوٹی تھیں، وہ تو بڑی سے بڑی بات پر بھی بہت محل کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

”ہادی اب بھی ہمارا ہی بیٹا ہے عالیہ۔“ قریشی صاحب نے محبت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔  
”آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں، یہ حقیقت جاننے کے بعد میں اب ہادی کو اپنی سکی اولاد نہیں سمجھوں گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔“ وہ ایک دم جھڑک اٹھیں۔

”میرے نزدیک جنم دینے والے سے زیادہ پالنے والے کا حق ہوتا ہے، اور میرا اللہ گواہ ہے کہ وہ بچہ میرے لیے کیا ہے؟ میری سانسوں کی ڈور اس کے ہونے سے جڑی ہوئی ہے۔ میرے زندہ رہنے کا سب سے بڑا جواز ہے وہ، اور اس حقیقت کو جاننے کے بعد اگر وہ مجھ سے دور ہوا تو میں آپ دونوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ جذباتی انداز میں بولتے ہوئے مسز عالیہ قریشی کی آواز بلند ہوئی اور کمرے میں داخل ہوتے ہادی نے ان کے یہ تمام جملے بھائی ہوش دھوا سنے۔

وہ ان کی میڈیسن لے کر ابھی ابھی گھر پہنچا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑا الفا فاسائیڈ میز پر رکھا اور مسز عالیہ قریشی کے بیڈ پر بیٹھ کر بڑی محبت سے اپنا بازو پھیلایا کر انہیں خود سے قریب کیا، وہ ان کے سارے خوف جانتا تھا۔ مسز قریشی کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ ہادی کا اپنا چہرہ افسردگی میں ڈوبا ہوا تھا لیکن وہ ایک مرد تھا، اس لیے خود کو کافی حد تک سنبھال چکا تھا۔

”میرا اس میں کوئی تصور نہیں ہے بیٹا! اللہ گواہ ہے، میں بھی اس حقیقت کو نہیں جانتی تھی۔“ وہ ہادی کی خاموشی سے گھبرا کر خود ہی صفائی دینے لگیں۔  
”مئی! مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! یہ بات جان کر تمہیں مجھ سے زیادہ تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن یقین مانو، مجھے اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کی اولاد ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے وجود کا حصہ سمجھا ہے اور سمجھتی رہوں گی۔“ وہ روتے ہوئے اسے اپنی محبت کا یقین دلارہی تھیں اور اس سے زیادہ برداشت کرنا ہادی کے بس میں نہیں تھا اور اس کے ضبط کا بیانا نہ جھلک ہی پڑا۔

”بابا! آپ بتا کیوں نہیں دیتے مئی کو، میں یہ حقیقت کچھ سال پہلے جان چکا ہوں۔“  
ہادی کے اس جملے پر مسز عالیہ قریشی کے سر پر ایک اور آسمان ٹوٹا، وہ سخت بے یقینی اور صدمے بھری کیفیت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی چلی گئیں، آج کی تاریخ میں ملنے والا یہ دوسرا شاک تھا، جو پہلے سے زیادہ ان پر عذاب بن کر ٹوٹا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر بیٹھیں اور کھنگلی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں، وہ مگر کبھی اس بات کا یقین نہیں کر سکتی تھیں کہ ہادی اس حقیقت سے باخبر ہوگا۔

”کیا کہا تم نے؟ تم اس سچائی کو جانتے تھے؟“ ان کا تحریر میں ڈوبا ہوا انداز ہادی کو خفت میں مبتلا کر گیا۔  
”آئی ایم سوری مئی! مجھے لگتا تھا کہ کہیں آپ یا باپانی دنیا میری حقیقت کھلنے کے بعد مجھے دھتکار نہ دے۔“

اس کی بات پر مسز عالیہ قریشی کے کلیجے میں ہاتھ پڑا۔  
یہ اس کے خود ساختہ خوف ہی تھے جنہوں نے اسے حریم کے سامنے محبت کا اظہار کرنے سے روک دیا تھا،

وہ جزہ کا بیسٹ فرینڈ تھا اور اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے والد حسب نسب کے بہت قائل تھے اور انہوں نے جزہ کی محبت کی حقیقت جاننے کے بعد بھی سب سے پہلے شہر زاد کے بیک گراؤنڈ اور اس کے والدین کے بارے میں پوچھا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عبداللہ قریشی صاحب نے اسے یہ سچ حقیقت بتانے کے بعد وعدہ لیا تھا کہ وہ اپنی لائف پارانسر اور اس کے خاندان سے اس بات کو نہیں چھپائے گا کیونکہ قریشی صاحب، زندگی کے سب سے بڑے معاملے کی بنیاد جھوٹ پر رکھنے کے قائل نہیں تھے، اور اس بات نے ہادی کو اتنا ڈرا دیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی حریم کے سامنے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کر پایا۔  
”آپ نے کب بتایا ہادی کو؟“

فائزہ کا تعجب میں ڈوبا ہوا لہجہ اس بات کا گواہ تھا کہ انہیں بھی اس بات کا علم نہیں، وہ تو سمجھتی تھیں کہ دونوں ماں بیٹائی اس حقیقت سے لاعلم ہیں۔

”پانچ چھ سال پہلے میں نے ہادی کو اعتماد میں لے کر یہ ساری بات بتا دی تھی۔“ قریشی صاحب کے اس انکشاف پر عالیہ بیگم نے ہلکی سی ناراضی سے ان کی طرف دیکھا، صدمے کی کیفیت پر اب غصہ غالب آ گیا تھا۔  
”اس کا مطلب ہے، آپ سب لوگ مل کر مجھے بے وقوف بناتے رہے، بہت افسوس کی بات ہے قریشی صاحب! کم از کم میں آپ سے اس بات کی توقع نہیں رکھتی تھی، کیا آپ کو میرا طرف اتنا چھوٹا لگتا تھا آپ مجھے اس قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔“ وہ ناراضی ہو گئیں۔

”آئی ایم سوری عالیہ! میرا مقصد ہمیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“  
”ہرٹ تو آپ دونوں باپ بیٹا مجھے کرتی تھیں، اب پیچھے باقی بچتا ہی کیا ہے، آپ خود سوچیں، اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ بے وقوف تو مجھے ہی سمجھا گیا۔“ انہوں نے غصے سے کھل تان لیا اور رخ موڑ کر لیٹ گئیں۔ عبداللہ صاحب نے پریشانی سے ہادی کی طرف دیکھا۔  
”مئی! آپ میری بات تو سنیں۔“ ہادی نے ہلکا سا جھجک کر انہیں مخاطب کیا تو انہوں نے غصے سے کھل اتار پھینکا۔

”ماں سمجھتے تو کیا ایسا کرتے میرے ساتھ؟ مجھ سے اتنی بڑی بات چھپاتے؟ تمہیں میں اتنی گھٹیا لگتی تھی جو یہ بات جاننے کے بعد تمہیں دھتکار دیتی۔ تم نے میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی کو ختم کیا، تمہاری وجہ سے میں نے دوبارہ اپنے کیریئر پر فوکس کیا اور تمہیں کیا لگتا تھا کہ میں انگلی سے پکڑ کر تمہیں گھر سے نکال باہر کروں گی۔“ غصے کی زیادتی پر جذبات غالب آ گئے، وہ ایک دفعہ پھر رو پڑیں۔

”بس کرویں ناں مئی! کیوں خود کو اور مجھے اذیت دے رہی ہیں؟ میں نے محض آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے خود سے کھن محسوس ہوتی تھی، مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید میں کسی گناہ کی پیداوار تھا جسے اس کی ماں نے اپنے وجود سے نوج کر دیا ہوگا، میں نے مڑ کر بھی اپنی اصل شناخت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، میری ولدیت کے خاتمے میں عبداللہ قریشی تھا جسے ”اللہ کا بندہ“ اور اللہ نے مجھے آپ کی ویران گود کو آباد کرنے کے لیے بھیجا تھا تو میں کیوں دائیں بائیں بھٹکتا اور میں تو مگر کبھی آپ لوگوں کا یا احسان نہیں بھول سکتا۔“  
اس نے اپنے لہجے کی لڑش پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی تو مسز عالیہ قریشی کو نہ جانے کیوں لگا کہ ان کا دل پھٹ جائے گا۔

”اور میرا اللہ گواہ ہے، میں نے یہ حقیقت جان کر اور زیادہ دل سے آپ کی عزت کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ یہ بات کبھی کھل کر آپ کے سامنے نہ آئے۔ آپ کو کبھی زندگی میں یہ خیال نہ آئے کہ میں اگر آپ کی سکی اولاد ہوتا تو شاید اس سے زیادہ آپ کا خیال کرتا۔“



وہ جذباتی ہوا۔ سزا عالیہ قریبی نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا، وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ عبداللہ صاحب اور فائزہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

☆☆☆

گھر کی گھنٹی دوبار بج چکی تھی شاید چوکیدار گیت پر نہیں تھا۔ ٹیٹا ہاؤس میں وہ طوفان اچکا تھا جس کے خوف سے رومیہ اپنا گھر چھوڑ کر اسل کے ساتھ بروٹائی جا چکی تھی، جیسے ہی خبر اس کی ماں کو پتا چلی، تب سے پورے گھر کی شامت آئی ہوئی تھی، شہر زاد نے ملازمہ کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

”وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملک چھوڑ کر چلی گئی۔ اور مجھے کسی نے بتانا تک گوارا نہیں کیا۔“

ٹیٹا بیگم کی سرخ ہوئی ہوئی رنگت ان کی دلی اور ذہنی کیفیت کی گواہ تھی، شہر زاد نے پوری ہمت مجتمع کر کے ٹیٹا بیگم کی طرف دیکھا، جن کا چہرہ غصے و اہانت سے تپ اٹھا تھا۔ انہوں نے سائیڈ میز پر رکھا کرسل کا شوپیس اٹھا کر پوری قوت سے زمین پر دے مارا، وہ اپنے ہوش و حواس کھورہی تھیں اور ان کا غصہ کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رومیہ کو گردن سے پکڑ کر واپس لے آئیں۔

”شیری! مجھ سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔“ انہوں نے سلگتی نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔

”مام! اس کا پاکستان سے چلے جانا ہی بہتر تھا۔“ وہ رسان سے بولی۔

”اب تم مجھے بتاؤ گی کہ کیا چیز بہتر ہے اور کیا نہیں؟ میں ماں ہوں تم دونوں کی اور تم دونوں نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے دودھ میں سے بھی کی طرح نکال باہر کیا۔ بس یہی ہے میری اوقات۔“ انہوں نے استغماہیہ انداز میں ہنسی اچکائی۔ غصے کی زیادتی سے ان کا جسم ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا۔

”رومیہ کا کیس ختم ہو چکا تھا مام! اور جس خاندان میں اس کی شادی ہوئی، اس کے ساتھ میرے پروفیشنل لیول پر اتنے اختلافات ہیں، وہ لوگ کسی بھی وقت اسے نقصان پہنچا سکتے تھے اور اب تو وہ ارسل کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی، آپ خود بتائیں، ایسی پوزیشن میں اس کا یہاں رہنا ٹھیک تھا کیا؟“ اس نے بڑی سمجھ داری سے گیندان کے کورٹ میں ڈال دی۔

”تم کچھ بھی کوشی! لیکن تم دونوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے، اور یاد رکھنا رومی اپنے اس فیصلے پر بہت پچھتائے گی، وہ خاندان اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ میں تم لوگوں سے بہتر جانتی ہوں انہیں۔“ وہ اپنے مخصوص نکتے میں بولیں جو ان کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔

”مام! آپ کو اعتراض رومی کے باہر جانے پر ہے یا اس کی میرحاکم علی کے نواسے ارسل سے شادی پر ہے؟“

شہر زاد کا دھیما لہجہ سنگ روم میں داخل ہوتے میر خاقان کے پیروں کی زنجیر بنا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آرہے تھے، آج وہ لچھا آئی چکا تھا جس سے ٹیٹا بیگم ساری زندگی ڈرتی آئی تھیں۔

خاقان صاحب کی سیٹنگ روم کے پاس سے گزرتے ہوئے نظر شہر زاد اور ٹیٹا بیگم پر پڑی اور وہ ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے ادھر ہی چلے آئے، شہر زاد کی آنکھوں میں آنے والی حیرانی، تعجب اور پھر ناگواری میں بدلی، جبکہ ٹیٹا بیگم تو کچھ لمحوں کے لیے لنگ سی رہ گئیں۔ ظالم وقت ایک بار پھر ان دونوں کو ایک دوسرے کے سامنے لے آیا تھا۔ شہر زاد کے اشارے پر ملازمہ گھبرا کر کمرے سے نکل گئی جبکہ ٹیٹا بیگم کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے نکلے۔

میر خاقان وہ شخص تھا جس کے لیے وہ اپنے باپ فاروق سہگل کے سامنے ڈٹ گئی تھیں اور پھر ان کے

ساتھ شادی کی، باپ کی وفات کے بعد ان کی والدہ نے بھرپور ان کا ساتھ دیا لیکن خاقان انہیں بچہ راستے میں چھوڑ گئے، اس کے بعد انہوں نے مٹر کراس ٹھکانے دیکھا جبکہ خاقان صاحب نے بے اختیار ان سے نظریں چرائیں۔

”تم؟“ ٹیٹا بیگم نے انگلی اٹھا کر وارننگ کے انداز میں ان کی طرف دیکھا، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے ناخنوں سے سامنے کھڑے شخص کا چہرہ نوچ لیں۔ ”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر آنے کی؟“

”میری ہمت کو چھوڑ دو، یہ بتاؤ، رومیہ کی شادی کس نے کی ہے ارسل کے ساتھ؟“ انہوں نے بے ترتیبی سے دھڑکتے دل پر قابو پاتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا، جبکہ شہر زاد ابھن بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”اچھا؟ تمہیں نام یاد ہے اپنی اولاد کا؟“

ٹیٹا بیگم کے زہر آلود الفاظ پر شہر زاد کی رنگت یک لخت بدلی اور لنگ سی کیفیت کے ساتھ اپنی ماں کے سینے کے سامنے کھڑے شخص کو دیکھنے لگی جو کسی مجرم کی طرح کٹھنرے میں کھڑا تھا۔

”یہ وہی رومی ہے، جس کی پیدائش پر تم نے مجھے طلاق کا پروانہ تحفے میں بھجوا دیا تھا کیونکہ تم بیٹیوں کی پیدائش سے خوف زدہ تھے، تمہیں اس بات کا ڈر تھا کہ بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے تمہاری سلی ختم نہ ہو جائے، تمہیں اپنا وارث چاہیے تھا لیکن تم بھول گئے تھے کہ اللہ کی لاسی بے آواز ہے، کتنی شادیاں کیں؟ کتنی جائز اور ناجائز اولادیں پیدا گئیں، سب کی سب بیٹیاں۔“ ٹیٹا بیگم نے تو گویا ان کے جسم پر چا بک مارا۔

”دیکھو ٹیٹا! غلط بات مت کرو۔“ وہ بدقت کہہ پائے۔

”غلط چیزوں کا آغاز تو تم نے کیا تھا میر خاقان، میں نے تو اپنے باپ کا سارا غرور اور رومان روئند کر تمہارے ساتھ شادی کی اور ملل دیانت داری کے ساتھ اس رشتے کو بھانے کی کوشش کی، لیکن شہر زاد کی پیدائش پر ہمارے رشتے میں پہلی دڑار پڑی، یہ سامنے کھڑی ہے تمہاری وہ بیٹی، جس کے پیدا ہونے پر تم پورے دو ماہ گھر نہیں آئے تھے اور رومیہ کے پیدا ہونے پر تو تمہارے ضبط کا پتا نہ ہی پھلک پڑا تھا۔ بھول گئے کیا؟“

ایک تیز گزرا ہٹ کے ساتھ شہر زاد کے جسم سے ٹرین گزرنی چلی گئی، جبکہ میر خاقان کی خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ ٹیٹا بیگم کا حرف حرف سچائی پر مبنی ہے۔ وہ غصے سے میر خاقان کی طرف بڑھیں اور انگشت شہادت سے ان کی پیشانی کو چھو کر تھوڑا اونچا کیا۔

”اب نظریں جھکائے کیوں کھڑے ہو؟ ہمت ہے تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو اور تسلیم کرو اپنی

اولاد کے سامنے کہ تم ایک انتہائی بزدل، کم ظرف اور پست ہمت انسان تھے۔ تم نے شخص اولاد دینے کے لیے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا اور کئی عورتوں کو برباد کیا، اب بتاؤ کہاں ہے تمہارا والی وارث؟ کس کے نام کے ساتھ چلے گی تمہاری اگلی نسل؟“ ٹیٹا بیگم کا زہر آلود لہجہ، میر خاقان کو چھری کی مانند لگ رہا تھا اور شہر زاد لنگ سی کیفیت میں ان دونوں کو دیکھے چلی جا رہی تھی۔

”اور ماں! اس بات کو تم نے اپنے بھانجے کے ذریعے گھسیا سازش کی۔ اس نے میری بیٹی کو ورغلا کر نکاح پڑھوایا اور اسے لے کر راتوں رات ملک چھوڑ کر بھاگ گیا، تمہارا بھانجا بھی تمہاری طرح ہی بزدل۔ نکلا۔“ انہوں نے ہاتھ جھاڑ کر طنز کیا۔

اس الزام پر خاقان صاحب نے تڑپ کر اپنے سامنے کھڑی اس عورت کی طرف دیکھا، جس سے انہوں نے حقیقتاً محبت کی تھی لیکن میرحاکم علی کے خوف سے اس کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ دوسری بیٹی کی پیدائش پر حاکم صاحب نے صاف کہہ دیا تھا کہ ان کی دوسری بیوی اور اولاد کی اس گھر میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی اور اس کے بعد تیسری



”چند لمحے جا چکی اور تولتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”وکالت میرا پیشہ ہے اور میرا کسی سے کوئی ذاتی عناد یا لینا دینا نہیں، میں اپنی پروفیشنل لائف کے فیلے کسی کی پسند یا ناپسند پر نہیں کرتی، چاہے وہ میری مٹی کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں بہت کچھ کہہ گئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم بابا جان کے خلاف کیس لڑو گی؟“ وہ ناراض ہوئے۔

”میری ماں بھی اگر کوئی غلط کام کرے گی تو میں اسے بھی کوئی فیور نہیں دوں گی۔ ویسے بھی آپ کے خاندان سے یا آپ سے میرا کوئی تعلق نہیں اور بہتر ہوگا کہ آپ بھی دوبارہ اس سلسلے میں ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کریں۔“ اس نے دونوں انداز میں اپنے باپ کی غلط فہمی کو دور کیا۔

خاقان صاحب کو دھچکا لگا، وہ صدمے کی سی کیفیت سے اسے دیکھتے چلے گئے، وہ ان کی سب اولادوں میں سب سے زیادہ نڈر اور بے باک تھی، اور وہ اپنی اولاد کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے تھے لیکن انا بیہ اور طوطی میں سے کوئی بھی ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتر پائی اور جس نے ان کے خواب کو پورا کیا تھا۔ وہی ان کے صبر کا امتحان بن کر ان کے سامنے تھی، اور ماضی میں کیے جانے والے غلط فیصلوں میں سے ایک فیصلہ ان کے پورے خاندان کے لیے پھندا بننے والا تھا۔

☆☆☆

فائزہ بیگم کی آمد کی اطلاع ملتے ہی منال فوراً ہاسٹل سے گھر پہنچ گئی۔ جیسے ہی اسے اس حقیقت کا ادراک ہوا تو وہ بھی کئی لمحے تنگ کیفیت کے ساتھ اپنے سامنے کھڑے ہادی کو دیکھتی چلی گئی، جو اس سے نظریں چرائے کھڑکی کے پاس کھڑا تھا اور اس کی نظر آسمان پر موجود چاند کی طرف تھی، جو ڈور سے کسی گھڑیال کی مانند نظر آ رہا تھا۔

”ایسے کیوں دیکھ رہی ہو منال؟“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”میں حیران ہوں، یہ سب جاننے کے بعد تم نے اپنے اصل والدین کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔“ وہ حجب کر بولی۔

”ان والدین کو جو اپنے معصوم بچے کو زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔“ وہ تلخ ہوا۔

”پتا تو چلے آ آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ گئی تھی ان پر، جو تمہیں اس رات اکیلا چھوڑ کر چلے گئے؟ وہ تمہاری ماں تھی یا تمہارا باپ تھا، یا کوئی اور فرد؟“ منال کا پس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ایک منٹ میں اس کے اصل والدین کا کھوج لگا لے۔

”جی بوجھ تو میرا دل بھی چاہا ہی نہیں، مہی، پاپا نے زندگی میں مجھے وہ سب کچھ دیا جو شاید میرے اصل والدین بھی مجھے نہیں دے سکتے تھے اور میں تو اس بات سے بھی خوف زدہ تھا کہ پتا نہیں میری سچائی کیا ہوگی، اور پتا نہیں وہ سب جان کر میں کسی سے نظر ملانے کے قابل رہوں گا بھی کہ نہیں۔“ وہ افسردگی سے بولا ہوا فائزہ بیگم کو انتہائی معصوم بچہ لگا، وہ ان دونوں کو ڈر کے لیے بلانے آئی تھیں۔

”مجھے لگتا ہے تمہارے پیرئس کا تعلق کسی ہائی فائی خاندان سے تھا، کیونکہ تمہارا لباس اور تمہارے وجود سے لپٹی ہوئی براؤنڈ چیزیں جی جی کر بتا رہی تھیں کہ اس بچے کو یہاں پھینکنے کے پیچھے غربت یا ایسی کوئی کہانی نہیں۔“ فائزہ ہچکچاتی بات پر وہ چونکا۔

”آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ بے تابی سے گویا ہوا۔

شادی انہوں نے حاکم صاحب کی رضامندی سے ندرت بیگم سے کی جن سے ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور اس کے بعد ان کے مختلف اسکینڈلز سامنے آتے رہے لیکن شادی کرنے کی غلطی دوبارہ انہوں نے زندگی میں کبھی نہیں کی۔

”میں اپنے سارے گناہ اور ساری غلطیاں مانتا ہوں تانیہ! لیکن تم نے جو میری اولاد کو میرے ہی خلاف کورٹ میں لاکھڑا کیا، اس سے گھٹیا کام تم نہیں کر سکتی تھیں۔“ اب بولنے کی باری خاقان صاحب کی تھی۔ اس الزام پر بیٹا بیگم کا چہرہ سرخ ہوا۔

”میں نے بابا جان کی ناراضی کے باوجود تمہیں اپنایا، کیونکہ میں تم سے محبت کرتا تھا اور میں نے تمہارے تحفظ کی خاطر بھی انہیں کان خبر نہیں ہونے دی کہ میری دوسری بیوی کون ہے اور کس خاندان سے اس کا تعلق ہے، وہ صرف اور صرف تمہارا نام جانتے تھے یا میری بیٹیوں کی پیدائش کی اطلاع، وہ بھی میں نے انہیں خود دی تھی۔“ وہ غصے میں سانس لیے بغیر بولتے چلے گئے۔

”میرا اللہ گواہ ہے کہ میں نے تمہارے لیے اسٹینڈ لینے کی کوشش کی، میں مانتا ہوں، میں بزدل تھا اور اپنے والد کے سامنے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا اور مجھے مجبوراً تمہیں ڈائیوڑس دینا پڑی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ وہ تمہاری کھوج لگا کر تم تک پہنچ نہ جائیں اور تمہیں یا میری اولاد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔ تم نے ڈائیوڑس پیپر ز پر جو جو شرائط لکھوائیں۔ میں نے مانیں۔“ انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک خاکی رنگ کا بوسیدہ لفافہ ان کے سامنے پھینکا۔

”تم نے مجھ سے لکھوایا کہ میری اولاد کا مستقبل میں مجھ سے کوئی لینا دینا نہیں ہوگا، میں نے دل پر جبر کر کے دوبارہ کبھی مڑ کر نہیں دیکھا۔“ انہوں نے جذباتی انداز میں بیٹا بیگم کی طرف دیکھا، جن کی آنکھوں میں ان کے لیے شفر کے سوا کچھ نہیں تھا۔

”تم نے اپنی بیٹیوں سے کہا کہ تمہارا باپ مر چکا ہے اور میں نے جیتے جی اس بات کو تسلیم کیا، تم نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میرا خاندان تمہارے یا بچوں کے خلاف کچھ ایسا دیا نہیں کرے گا، تو میں نے اس بات کو بھی نبھایا، آئے دن تمہارے اسکینڈلز اخبارات کا حصہ بنتے تھے لیکن میں اس پر بھی چپ رہا کہ تمہاری ذاتی زندگی ہے، تم کچھ بھی کرنے کا حق رکھتی ہو لیکن۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔

”تم نے میری بیٹی کو میرے ہی خلاف کورٹ میں لاکھڑا کیا، میں جب تک اس حقیقت سے باخبر نہیں تھا میں چپ رہا، لیکن اب بات بہت بڑھ چکی ہے بیٹا بیگم! تمہاری نفرت، تمہاری بے رخی میرے لیے ہوئی چاہیے، مجرم میں ہوں، مجھ سے بدلہ لو، لیکن میں تمہیں اپنے پورے خاندان کی عزت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ ان کا ناراضی میں ڈوبا لہجہ اب پھر یلا ہوا اور اس سے زیادہ چب رہنا شہر زاد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

”ایسکلیو زی۔“ وہ پراعتقاد انداز میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”میرے پروفیشن اور میرے معاملات سے میری ماں کا کوئی لینا دینا نہیں، آپ اس حوالے سے ان پر مزید کسی قسم کی الزام تراشی نہیں کر سکتے، یہ تو وہ عورت ہے جس نے ہمیشہ مجھے اس خاندان سے دور رہنے کا مشورہ دیا، لیکن اس دوری کے پیچھے کیا راز کاغذ کا تھا، وہ آج کل کمر سامنے آ گیا، آپ کو جو مسئلہ ہے مجھ سے بات کریں۔“ شہر زاد نے بمشکل اپنے لہجے پر قابو رکھا۔

خاقان صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، وہ میرا حاکم کی طرح دونوں انداز میں گفتگو کرنے کی قائل تھی۔ تاہم تازہ ملنے والے اس جذباتی دھچکے سے باہر نکل کر اب وہ ایسے کھڑی تھی جیسے ایک عام سی بات ہو۔ اس کی آنکھوں میں موجود بغاوت، سختی اور ہٹ دھرمی نے میرا خاقان کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر دی،



”میری دوست ڈاکٹر باب کے شوہر نے مجھے بتایا تھا اور انہیں شک ہے کہ تمہاری ماں نے شاید خود کشی کر لی تھی کیونکہ اس سے اگلے دن ایک عورت کی کٹی پھٹی لاوارث لاش بھی کچھ میل کے فاصلے پر ملی تھی۔“ اس اطلاع پر ہادی بے چین ہوا۔

”ہادی، تمہیں انکل معیز سے ضرور ملنا چاہیے کیونکہ ان کے پاس ایسا کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا جو تمہیں اپنی اصل شناخت تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہے۔“ منال نے اسے اکسایا اور یہ بات فائزہ بیگم کو سخت بُری لگی۔

”تم کیا اسے اٹنی سیدھی پٹیاں پڑھا رہی ہو، اس کے پیرس بھی بھائی اور بھائی جان ہی ہیں، اسے کیا ضرورت پڑی ہے، خواہ مخواہ کی درد مری پالنے کی اور ہادی تم ایسا ویسا کچھ نہیں کرو گے۔“

فائزہ بیگم کی جھاڑن کر منال ایک دم چپ کر کے بیٹھ گئی، جبکہ ہادی کا تو ویسے ہی دل و دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اس کے پاس بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

میجر حمزہ نے تاسف بھری نگاہوں سے شہر زادی کی طرف دیکھا جو اضطرابی انداز میں ہاتھ میں پکڑا کچھ بھی کھول اور بھی بند کر رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر یہاں موجود ہونے کے باوجود کہیں اور تھی اور آج حمزہ کے بے پناہ اصرار کے بعد یہاں آئی تھی، وہ فون پر اسے میر خاقان والا سارا قصہ بتا چکی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو شہر زادا!“ حمزہ نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ زبردستی مسکرائی۔

”تم جب بھی زبردستی مسکراتی ہو تو عجیب لگتی ہو۔ کسی بھی معاملے میں جبر تم پر چلتا نہیں ہے، اس لیے جو کام بھی کیا کرو، دل سے کیا کرو۔“

اس کی بات پر شہر زادنے بے اختیار نظریں چرائیں۔ اس کی آنکھوں میں موجود چمکتے آنسو حمزہ کے لیے امتحان بننے لگے۔ وہ اس کے سامنے شاید ایک آدھ بار ہی جذباتی ہو کر روئی تھی کیونکہ اسے رونا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

”سوچ رہی ہو حمزہ! زندگی کی بعض حقیقتیں کتنی تلخ ہوتی ہیں، ان پر جتنی دیر پردہ پڑا رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ کاش میرے باپ کا تعلق معاشی طور پر کسی کمزور خاندان سے ہوتا، وہ کوئی بھی ہوتا لیکن میر حاکم کی فیملی سے نہ ہوتا۔“

اس نے پہلی بار کسی کے سامنے اس دکھ کا اظہار کیا، درنہ کل خاقان صاحب کے جانے کے بعد ٹیٹا بیگم خاصی ڈسٹرب ہوئی تھیں اور انہوں نے شہر زاد کو اپنے ماضی کے بارے میں بھی بتانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس نے انہیں صاف منع کر دیا۔

”اب پتا چلا، میں اور تمہاری مام ہمیشہ اس خاندان سے فاصلے پر رہنے کا مشورہ کیوں دیتے تھے۔“ وہ روانی میں اس کے سامنے بول تو گیا لیکن شہر زاد کے تاریک پڑتے چہرے کو دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا فوراً احساس ہو گیا۔

”کیا کہا تم نے؟“ شہر زاد کو لگا جیسے اس کی سماعتوں نے دھوکا کھایا ہے۔ ”کیا تم اس حقیقت کو جانتے تھے کہ اس خاندان کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟“

حمزہ کے اثبات میں سر ہلانے پر شہر زاد کے ہاتھ سے کچھ چھوٹے چھوٹے بچا، بے یقینی کی کیفیت اب صدمے میں ڈھل رہی تھی۔

”کب سے؟“ شہر زاد کو اپنی آواز کی کنویں میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”جانتا تو بہت عرصے سے تھا اور دل ہی دل میں اس بات سے خوف زدہ بھی تھا کہ کہیں حاکم صاحب تمہاری حقیقت نہ جان لیں، اس لیے میں نے تمہیں معلّم ان کے خاندان کے خلاف کچھ بھی کرنے سے ہمیشہ منع کیا لیکن پھر تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو جاتا تھا۔“

وہ تنہائی سے کہہ رہا تھا۔

”لیکن مجھے اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ ارسل بھی اسی خاندان کا فرد ہے اور جب ارسل کی حقیقت کھلی تو اس دن مجھے احساس ہوا کہ بے رحم تقدیر کی دن تمہیں بھی اس خاندان کے سامنے لے آئے گی، جو کسی نہ کسی حوالے سے تمہاری شناخت کا ایک حصہ ہے۔“

”میں نہیں مانتی اس شناخت کو۔“ اس نے تلخ انداز میں اس کی بات مسترد کی۔

”میرے آئی ڈی کارڈ میں گارجین کے آگے میرے نانا فاروق سہگل کا نام تحریر ہے اور میں نے زندگی میں کبھی یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ میرا باپ کون تھا یا اس کا تعلق کس خاندان سے تھا، اور آج جب یہ معمہ سلجھ گیا ہے تو تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”اگر فرق نہیں پڑتا تو پھر اتنی ڈسٹرب کیوں ہو، اس چیز کو اپنے ذہن سے نکال دو۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا شہر زادی آنکھیں میٹکین پانیوں سے بھر گئیں۔ حمزہ کو دل دکھا کا احساس ہوا۔

”میرے اختیار میں ہوتا تو سب سے پہلے اس خاندان کا خون اپنی رگوں سے نکالتی، مجھے ساری زندگی اس بات کا انوس رہے گا کہ میرا باپ ایک کرپٹ اور انسانیت سے عاری خاندان کا فرد ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”آئی ایم سوری شہر زادا! میرا مقصد ہرگز تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔“

اس نے محبت سے اس کے میز پر رکھے ہاتھوں کو تھامنے کی کوشش کی، لیکن شہر زادنے ایک جھٹکے سے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا، وہ میز پر رکھا اپنا کچھ اٹھا کر کھڑی ہوئی۔

”تم مجھ سے کیوں خفا ہو رہی ہو؟“ وہ بھی پریشانی سے کھڑا ہوا۔

”تو اور کس سے خفا ہوں؟ مام سے؟ جو کل سے اپنا غلط کرنے کے لیے سیفی انکل کے ساتھ مری گئی ہوئی ہیں یا رومیہ سے، جسے میں نے خود یہاں سے بھجوا دیا ہے تاکہ کوئی ایک تو سکون کی زندگی گزار سکے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہوئی۔

”تم اس بات کو ضرورت سے زیادہ اپنے حواسوں پر سوار کر رہی ہو؟“

”تم یہ کیوں سمجھتے ہو حمزہ! میں لوہے کی بنی ہوئی ہوں اور مجھے کسی دکھ یا تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، تم مجھے ایک عام لڑکی سمجھ کر ری ایکٹ کرنے کا مار جن کیوں نہیں دیتے ہو۔“ وہ اس کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے دھکی انداز میں گھر کر رہی تھی۔

”اس لیے کہ تم ایک عام لڑکی نہیں ہو۔ تم مجھ سے زیادہ پریکٹیکل اور زندگی کے بارے میں پوزیٹیو اپروچ رکھتی ہو، اس لیے میں تم سے ان عام چیزوں کی توقع نہیں رکھتا۔“ حمزہ نے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑا تو شہر زادنے جھنجھلاہٹ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

”کیوں بار بار ہاتھ پکڑ لیتے ہو میرا؟“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”اس لیے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم سچا ہاتھ چھڑا کر نہ چلی جاؤ۔“ اس نے مذاق میں بات کو اڑانے کی کوشش کی۔

”جانے والوں کو کون روک سکا ہے اور دیکھ لیتا کسی دن خاموشی سے اس سارے قصبے سے نکل جاؤں گی۔“ اس کی زبان پھسلی۔



”اور میرا کیا ہوگا؟“ حمزہ نے اس کا موڈ بہتر کرنے کے لیے شرارت سے پوچھا۔  
 ”تمہاری ویسے ہی پوسٹنگ آنے والی ہے، کہیں دور پہاڑوں پر چلے جانا، اور وہاں بیٹھ کر میری جدائی میں  
 لمبی لمبی نظمیں لکھنا، جسے پڑھ کر لوگوں کو اشتیاق ہو کر یہ شہر زادوں کو بھی، کہاں سے آئی اور کس دیس چلی گئی۔“ اس  
 کے انداز میں کچھ تھا، حمزہ کو لگتا جیسے کسی نے اس کا دل کھینچ لیا ہو۔  
 ”تمہاری بکواس ختم ہو گئی تو ہم چلیں۔“ وہ سچ سچ تھا ہوا۔  
 ”اتنی سی بات پر ڈر گئے؟“ فضا میں شہر زاد کا آداسی میں لپٹا ہوا تہقہہ گونجا۔  
 ”محبت کو صرف ایک ہی چیز توڑ دیتی ہے اور وہ ہے جدائی، تمہیں پتا ہے کسی محبت کرنے والے کی زندگی جہنم  
 بنائی ہو تو اسے اس شخص سے دور کر دو، جسے وہ زندگی میں سب سے زیادہ چاہتا ہو۔“ حمزہ نے اس کے لیے گاڑی  
 کا دروازہ کھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔  
 ”کیا تمہیں بھی اب یہ بتانا پڑے گا کہ میں مذاق کر رہی تھی۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے سن گلاسز  
 آنکھوں پر لگائے۔  
 ”دوبارہ مذاق میں بھی ایسی بات مت کرنا۔“ حمزہ نے گاڑی اشارت کرتے ہوئے اسے التجائیہ نظروں  
 سے دیکھا۔

”شکر ہے زندگی میں کوئی ایک بندہ مجھ سے بے غرض محبت کرتا ہے۔“ وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ہلکے  
 پھلکے انداز میں مسکرائی تو حمزہ تھوڑا پرسکون ہوا۔ ورنہ اس کی کچھ چیزیں اسے بار بار چونکا رہی تھیں وہ آج پہلی بار  
 اس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔

☆☆☆

”تم میرا حکم کے خلاف کیس واپس نہیں لے سکتیں؟“  
 اگلے دن ناشتے کی میز پر ٹینا بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہی پریشان انداز میں کہا تو اس نے جا چٹتی ہوئی  
 لگا ہوں سے ان کا چہرہ ٹٹولا، جہاں نظر اور پریشانی کے سارے ہی رنگ نمایاں تھے۔  
 ”آپ کو میرا خاقان نے کوئی دھمکی دی ہے یا ان کے والد صاحب نے کسی کے ذریعے پیغام رسانی کی  
 ہے۔“ وہ سامنے رکھا فریش اورنج جوس، جگ سے گلاس میں اٹھیلے ہوئے انتہائی سرسری انداز میں بولی، جیسے  
 اس چیز سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ ویسے بھی کل ساری رات اس نے اسی کیس پر کام کیا تھا اور سچ میں ایک دو  
 بار اس نے مسز عالیہ قریبی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا نمبر مسلسل آف چار تھا۔  
 ”مجھے ان میں سے کسی نے بھی ایسا کرنے کو نہیں کہا۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئیں۔  
 ”تو پھر ٹینشن کس بات کی ہے؟“ شہزاد کو ان کی پریشانی سمجھ میں نہیں آئی۔

”دیکھو شیر، میرا تعلق بھی کسی عام گھرانے سے نہیں تھا اور اس کے باوجود میں نے اس خاندان سے پنگا  
 لینے کی کوشش نہیں کی۔ تمہارے نانا نے میری اس شادی کی سب سے زیادہ مخالفت کی تھی کیونکہ وہ ایک جہاں  
 دیدہ انسان تھے اور خاقان کی کم زور شخصیت کو ایک ہی ملاقات میں سمجھ گئے تھے۔“ انہوں نے بات شروع کرنے  
 کے لیے ایک لمبی تمہید باندھنے کی کوشش کی۔

”مام پلیز کم ٹو دپوائنٹ۔“ وہ اس تفصیل سے اکتا کر بولی۔ ”آپ کو جو بات کرنی ہے، صاف صاف  
 کریں، مجھے ماضی کے ان قصوں سے کوئی دلچسپی نہیں، جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں ماضی میں نہیں حال میں جینے کی  
 قائل ہوں۔“

”صاف صاف بات یہ ہے کہ تم اس خاندان سے دور رہو۔“ انہوں نے بھی صاف گوئی کی انتہا کر دی۔

”مام! میں کون سا بازو پھیلائے ان کے سامنے کھڑی ہوں اور آپ کیوں اتنی خوف زدہ ہو رہی ہیں۔“  
 اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش شامل ہوئی۔  
 ”میں اس لیے خوف زدہ ہوں کیونکہ میں اس خاندان کی حرام زدگیوں کے قفسے جانتی ہوں۔“ وہ جھنجھلا کر  
 گویا ہوئیں۔

”پلیز مام، اتنی رف لینکو کچ تو یوز نہ کریں۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا گلاس ہلکی سی برہمی کے ساتھ میز پر پٹخا۔  
 ”کاش میرے بس میں ہوتا تو یہ سارا زہرا ان کے سامنے جا کر اٹھتی، تم نہیں جانتی ہو، خاقان کے باپ نے  
 اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا پورا گھر تباہ کر دیا تھا۔“ وہ روانی میں بولیں تو شہزاد  
 کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ دوڑی۔

”اسی بیٹے کے خاندان کو ہی تو انصاف دلانا ہے، لیکن آپ کیسے جانتی ہیں ان سب کو؟“  
 ”اسی بات سے خوف زدہ ہو کر تو تمہارے باپ نے مجھے چھوڑا تھا، اسے لگا تھا کہ میرا حکم میرے ساتھ بھی  
 کچھ غلط کروادے گا۔“ ان کا لہجہ تھوڑا دھیمہ ہوا۔

”پھر تو انہوں نے آپ کو چھوڑ کر بہت بڑا احسان کیا تھا آپ پر۔“ وہ شہزاد کے طنز کو کچھ نہیں پائیں۔  
 ”ہاں اگر سوچا جائے تو یہ واقعی اس کا بہت بڑا احسان تھا، اس نے ساری زندگی اپنے فرعون باپ کے  
 سامنے کبھی اس بات کی بھاپ نہیں نکالی کہ اس کی دوسری بیوی کون تھی اور اس کا تعلق کس خاندان سے تھا، وہ  
 صرف میرا نام اور بچپن کے بارے میں جانتے تھے اور ویسے بھی میں ڈائریس کے بعد لاہور سے اسلام آباد  
 شفٹ ہو گئی تھی۔“ ٹینا بیگم نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اب آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟“ اس نے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔  
 ”تم اس کیس سے دست بردار ہو جاؤ اور میری بات مانو تو واپس لندن چلی جاؤ، اب تو میں شکر ادا کرتی  
 ہوں کہ رومی یہاں سے چلی گئی، ورنہ اس نے علیحدہ اس بات پر طوفان کھڑا کر دیتا تھا۔“ ان کے مشورے پر  
 شہزاد ہلکا سا ہنسی۔

”آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے، میں ان لوگوں سے ڈر کر اپنا ملک، اپنا گھر اور اپنی ماں کو چھوڑ کر یہاں سے  
 بھاگ جاؤں؟ آئی ایم سوری مام! میری رگوں میں ایک بزدل مرد کا خون کبھی لیکن میری پرورش ایک بہادر  
 عورت نے کی ہے۔ جس نے نہ صرف زندگی کے ہر محاذ پر اکیلے مقابلہ کیا بلکہ بزنس اور فیشن کی دنیا میں اپنی ایک  
 الگ پہچان بھی بنائی۔“

”شیر! تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو، مجھے سبھی نے صاف صاف کہا ہے کہ اگر تم یہ کیس  
 واپس نہیں لو گئی تو وہ لوگ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔“ ٹینا بیگم کی آواز جھنجھلاہٹ سے بلند ہوئی۔  
 ”مام! جو کر رہے ہیں، وہ برستے نہیں، ڈونٹ دوری ایسا کچھ نہیں ہوگا، میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں،  
 شام میں آکر بات ہوگی۔“

وہ ہاتھ میں پکڑا ٹوسٹ پلیٹ میں رکھ کر کھڑی ہوئی اور اپنا سیل فون اٹھا کر ڈائلنگ روم سے نکل گئی۔ ٹینا  
 بیگم کے ماتھے کی شکن مزید گہری ہوئی۔ وہ جانتی تھیں کہ ضد اور ہٹ دھرمی میں وہ اپنے باپ کے خاندان پر ہی گئی  
 ہے اور ڈرنا تو گویا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کی وہ تمام عادتیں جو انہیں کسی دور میں بہت بھائی تھیں، اب  
 وہی ان کے لیے پریشانی کا باعث بن رہی تھیں۔

☆☆☆

ایکشن کے نتائج نے میرا دس میں تو گویا بھونچال ہی برپا کر دیا۔



مونیکا کیس کو حاکم صاحب کے مخالفین نے کھل کر ان کے خلاف استعمال کیا، اور وہ مونیکا کے بھائی دلاور کو اپنے سیاسی جلسوں میں لانے میں کامیاب ہو گئے، جس کی جذباتی تقریروں نے ماضی کے مٹی گڑے مردے اکھاڑ کر سامنے رکھ دیے تھے۔ شہزاد اپنے تعلقات کے استعمال سے میر حاکم کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور پورا گھرانہ اس کیس کی وجہ سے شدید تناؤ کا شکار تھا۔

ارسل اپنا گھر چھوڑ کر جا چکا تھا اور میر خاقان نے شہزاد کے حوالے سے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ وہ آج بھی اندر ہی اندر اپنے والد سے اتنے ہی خائف تھے لیکن اب معاملہ ان کی اولاد کا تھا اور اولاد بھی ایسی جو جھٹلے اور پیچھے ہٹنے کی قائل نہ تھی۔

ارسل کے گھر چھوڑ کر جانے کے بعد ندرت بیگم بیمار ہو گئی تھیں اور نمبرہ کو بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ اگرچہ ارسل نے بروٹائی پیچھے ہی کال کر کے اس کی رومیصہ سے بھی بات کروائی تھی، لیکن دونوں کو کسی بل بھی سکون نہیں آ رہا تھا۔ ان دنوں حاکم صاحب چونکہ اپنے معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ اس لیے ارسل اور اس کی شادی کا قصہ وقتی طور پر ان کے دماغ سے محو ہو چکا تھا۔

میر حاکم اپنے شہر کی آبائی سیٹ ملتان سے اور خاقان صاحب اسلام آباد سے نری طرح ہار گئے تھے۔ بہت سالوں بعد اس خاندان کو سیاست کے میدان میں اتنی نری شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ حاکم صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مونیکا کے بھائی کو سرعام کوئی سے اڑا دیں، لیکن دلاور کے پاس سب سے بڑا ہتھیار امریکی پاسپورٹ اور اس کی ایکسیسی کی سپورٹ تھی۔ دوسری طرف کرپشن کیونٹی اور میر خاقان کے مخالفین نے بھی کھل کر دلاور کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ لی وی کے سیاسی ٹاک شوز کا یہ آج کل پسندیدہ موضوع تھا، جہاں میر خاقان کی سیاسی زندگی کے زوال اور مونیکا کیس میں تیزی سے ہونے والی پیش رفت کو بڑے بے باک انداز میں ڈسکس کیا جا رہا تھا۔ یہ باتیں سن کر حاکم صاحب کو ڈپریشن ہونا ایک فطری عمل تھا۔

میر ہاؤس کے کینون کو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حاکم علی کی سوچنے بجھنے کی صلاحیت بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ گھر کی خواتین کا لحاظ کیے بغیر سرعام اپنے مخالفین کو گالیاں دینے لگتے اور لی وی کے مٹی ریموٹ کنٹرول وہ غصے میں توڑ چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ باقاعدگی سے نیوز چینل دیکھنے سے باز نہیں آتے تھے، ملک کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہو چکا تھا۔ الیکشن کی گہما گہمی کے بعد وزارتوں کی بھاگ دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ اپنے سیاسی کیریئر میں پہلی بار میر خاندان اس دوڑ سے باہر ہوا تھا۔

اس دن تو حاکم صاحب کی برداشت کی حد بالکل ہی ختم ہو گئی، جب انہوں نے ایک نیوز لیٹن میں اپنے مرحوم باپ مراد علی شاہ کے مزار پر ہونے والی لائیو کوریج میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے ذوالکفل کو دیکھا، جو وہاں پر سائیں بابا کے نام سے مشہور تھا اور لوگ دور دور سے اس کے پاس دعا کے لیے آتے تھے۔ وہ کئی گھنٹے خاموشی سے گھٹنوں میں سر دے بیٹھا رہتا اور کبھی کبھی اٹھ کر عالم وجد میں جھومنے لگتا۔

مونیکا کیس کی قائل گھٹنے کے بعد ایک گھاگ صحافی مونیکا کے شوہر ذوالکفل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب ان کا چینل، ناظرین کے سامنے چیخ کر سب سے پہلے اس خبر کو بریک کرنے کا اعزاز اپنے نام کر رہا تھا۔

”یہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے، پتا کرواؤ، یہ کون الوکا پٹھا ہے۔“ حاکم صاحب آگ بگولہ ہوئے۔

اسکرین پر گلے میں رنگ برنگی مالا لیں پہنے، پچھے ہوئے چوغے میں ملبوس سائیں بابا سے صحافی اوٹ پٹانگ سوالات کیے جا رہا تھا اور سائیں بابا کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان سوالات کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے، ان کی آنکھوں کی روشنیاں تو بہت سال پہلے بجھ چکی تھیں، جب انہوں نے اخبارات میں

اپنی بیوی کی کئی پھٹی لاش دیکھی تھی اور ان کے بیٹے کی لاش کہیں سے نہیں ملی تھی اور قریبی لوگوں کا خیال تھا کہ اسے کوئی جانور اٹھا کر قریبی جنگل میں نہ لے گیا ہو، ان صدقات نے ان کا دماغ الٹا کر رکھ دیا تھا، وہ این سی اے کا بڑا حاکم تھیں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر ملتان کی گلیوں میں اپنے بیٹے کو تلاش کرتا۔ تنگ آ کر ان کے بھائی انہیں مری لے آئے جہاں وہ اپنے دادا کے مزار کو اپنا مستقل ٹھکانا بنا چکا تھا۔

لی وی کیسرے کی لاش اور لوگوں کے ہجوم سے گھبرا کر سائیں بابا نے ہاتھ میں پکڑا گھنٹہ گھر والا ڈنڈا زمین پر زور سے مارا اور اللہ ہو کہ نعرہ لگا کر گول گول چکروں کی صورت میں جھومنے لگے اور جرنلسٹ بوکھلا کر اپنے سارے سوالات ہی بھول گیا۔

☆☆☆

درشہوار کافی گامگ ہاتھ میں تھا۔ اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے کمرے کی کھڑکی کے عین سامنے ہادی کا کمرہ تھا اور درمیان میں صرف چند فٹ کا فاصلہ تھا اس لیے دونوں گھر بہت صاف دکھائی دیتے تھے اور اس وقت سامنے کا منظر درشہوار کو بے چین کر رہا تھا۔

راکنگ چیئر پر موجود ہادی کے چہرے پر گہری اداسی کی چھاپ تھی اور اس کے ہاتھ میں موجود جلتا سگریٹ پورے کمرے کو دھواں دھواں کر چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگائے وہ کسی ذہنی پڑمردگی کا شکار لگ رہا تھا۔

درشہوار نے جب اسے سگریٹ کے دوسرے پکٹ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دیکھا، تو اس کے دل میں اضطراب لہریں لینے لگا اور اس نے ڈھیٹ بن کر اپنے میل فون پر ہادی کا نمبر ڈائل کیا اور ساتھ ہی اپنے روم کی تمام لائٹس بھی آن کر دیں۔

ہادی جو کہ سبز عالیہ قریبی کی بیماری کی وجہ سے خاصا اب سیٹ تھا، کیونکہ کچھ دنوں سے وہ اپنے جیمبر بھی نہیں جا رہی تھیں۔ ان کے دماغ میں یہ خوف بیٹھ چکا تھا کہ کہیں ہادی اپنے اصل والدین کو تلاش کر کے ان کے پاس نہ چلا جائے، اس سوچ نے ان کا فشارخون خاصا بلند کر رکھا تھا۔

ہادی انہیں بھرپور تسلی دینے کے بعد مری واپس چلا آیا اور اس نے آتے ہی اپنے فرانسفر کی درخواست دے دی تھی، وہ اب سبز عالیہ قریبی کے ساتھ رہ کر ان کے دل سے یہ خوف نکالنا چاہتا تھا، فون کی گھنٹی نے ہادی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس نے بے زاری سے اسکرین پر درشہوار کا بلنگ کرنا نمبر دیکھا اور کچھ سوچ کر کال انیڈ کر لی۔

”اگر سگریٹ سے کام نہیں چل رہا تو اپنے مرحوم دادا کا حقہ بھجوادوں، ہندوستان سے لے کر آئے تھے وہ۔“

ہادی اس کی بات پر افسردگی سے مسکرایا اور اپنا میل فون اٹھا لے کر کھڑکی کے پاس پہنچ گیا، اس نے درشہوار کو سامنے کھڑے دیکھ لیا تھا۔

”میرے خیال میں اس حقے کی ضرورت ان دنوں تمہارے دادا جی کو زیادہ ہے تاکہ اس کے دھوکے میں وہ اپنی حسرت ناک شکست کا غم اڑا سکیں۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنز کر بیٹھا اور اس کی اس بات نے درشہوار کو دھکی دیا۔

”اگر میری فیملی کی شکست کا مذاق اڑا کر آپ کی ذہنی تیش دور ہو سکتی ہے تو یقیناً مائیں، میں آپ کا اس معاملے میں بھی بھرپور ساتھ دوں گی۔“ اس کے لہجے میں چھپا گلہ ہادی کو شرمندہ کر گیا۔

”آئی ایم سوری، مذاق کر رہا تھا میں۔“ اس نے فوراً ہی معذرت کی۔

”میں جانتی ہوں، آپ کے نزدیک میری اہمیت ایک مذاق سے زیادہ نہیں۔“ درشہوار کی آنکھوں میں نمی



اتری۔

”مذاق تو بہت سال پہلے تقدیر نے میرے ساتھ کیا تھا۔“ وہ آہستگی سے بڑبڑایا لیکن آگے بھی درشہوار تھی، ہادی کے معاملے میں تو اس کا پورا وجود جسم ساعت بن جاتا تھا۔

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“ اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔ نہ جانے کیوں آنسو اٹھنے چلے آ رہے تھے۔

”بات کا مطلب تو بعد میں سمجھاؤں گا لیکن تم رو کیوں رہی ہو؟“ وہ کھڑکیوں کے درمیانی چند فٹ کے فاصلے کے باوجود اسے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے دیکھ چکا تھا، اس کے فکر مند انداز پر درشہوار کا دل یک بارگی دھڑکا۔

”ہادی! میں بہت بُری لڑکی ہوں ناں، بلکہ میرے خیال میں تو لڑکیوں کو محبت کرنے کا حق ہوتا ہی نہیں چاہیے۔“ اس کا دل جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔

”درشہوار! بات لڑکے یا لڑکی کی نہیں ہے، اس جرأت کی ہے جو ہمارا معاشرہ لڑکیوں کے حوالے سے کبھی قبول نہیں کرتا۔“ ہادی اس کے شکایتی انداز سے نظریں چرا کر بولا۔

”ہمارا معاشرہ لڑکیوں کو انسان ہونے کا مار جن کیوں نہیں دیتا، غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔۔۔“ درشہوار دھکی ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے، مجھ سے محبت تمہاری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔“ وہ ہنسیوں اچکا تا جیسے اس صورت حال سے لطف اٹھانے لگا۔

”محبت کرنا غلط نہیں تھی، اس کا اظہار کرنا اور اس کے لیے پورے گھر کی عزت کو داؤ پر لگانا ایسا گناہ تھا، جسے شاید اللہ تو معاف کر دے لیکن اس کے بندے کبھی نہیں کریں گے۔“ درشہوار نے لہجے کی لڑش پر قابو پاتے ہوئے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

”خیر اپنے گھر کی عزت کو تو تم نے واقعی داؤ پر لگایا ہے وہ سارے ڈاکو منٹس مجھے دے کر، دیکھا نہیں اس ایک کیس نے پورے الیکشن کی بساط پلٹ دی۔“

وہ اب ہلکے پھلکے انداز میں اسے چھیڑ رہا تھا۔

”لیکن وہ میں نے آپ کے لیے نہیں کیا، یہ بات اپنے دماغ سے نکال دیجیے گا۔“ وہ تڑت بولی تو دوسری طرف ہادی بے ساختہ مسکرایا۔

”اچھا تو پھر کس کے لیے کیا تھا۔“

”دیکھیں ہادی، میری ماں کہتی ہے کہ میں ایک انتہائی جذباتی اور بے وقوف لڑکی ہوں۔“

”بالکل ٹھیک کہتی ہیں وہ۔“ اس نے مسکرا کر پیچ میں لقمہ دیا۔ اس کا موڈ اب کافی بہتر ہو چکا تھا۔

”میں اگر محبت میں بغیر سوچے سمجھے قدم اٹھا سکتی ہوں تو کسی کو اس کے ظلم کی سزا دینے کے لیے بھی آخری حد تک جا سکتی ہوں، چاہے دوسری طرف میرا کوئی خونی رشتہ ہی کیوں نہ ہو۔“ اس کی صاف گوئی ہادی کو اچھی لگی۔

”تم ایک اچھی لڑکی ہو درشہوار! اگر دل کے ساتھ ساتھ اپنے دماغ کو بھی ساتھ لے کر چلو۔“ اس کے سادہ انداز پر وہ ہنسی، ایک شفاف اور ٹھنک دار ہنسی۔

”اب تو بتا دیں، کس غم کو مسگریٹ کے دھوئیں میں اڑا رہے تھے آپ۔“ درشہوار کا دماغ اسی منظر میں اٹکا ہوا تھا۔

”اپنی بے قدری اور شناخت کے غم کو، تمہیں پتا ہے میں اپنے پیرئس کی لے پالک اولاد ہوں۔“ وہ نہ جانے کیوں اپنی زندگی کا سب سے بڑا غم اس لڑکی کے ساتھ شیئر کر گیا، جس سے وہ سب سے زیادہ چڑتا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

”تمہارے نزدیک اس چیز سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا کہ تمہارے پیرئس کون تھے۔ تمہاری اصل شناخت کیا تھی؟“ وہ ذرا سا رمان گیا۔

”بعض دفعہ انسان کی شناخت ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن جاتی ہے، جیسے میرے بس میں ہوتا تو میں شاید میر خاندان میں بھی پیدا نہ ہوتی، جن کا دین محض پیسہ اور اقتدار ہے، چاہے اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے، ہمارے ہاں لاشوں پر سیاست ہوتی ہے اور میت کے سر ہانے بیٹھ کر رشوت کے لفافے چلتے ہیں۔ آپ خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر انصاف کو آواز دیں، اگر میرا تعلق اس خاندان سے نہ ہوتا تو کیا آپ تب بھی میرے ساتھ اس قدر رہے رنجی سے پیش آتے۔“ درشہوار پر آج بچہ بولنے کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف ہادی اس کی بات پر ایک دم چپ کر گیا۔

”اس لیے جس چیز پر اللہ نے پردہ ڈال دیا ہے اسے کھوجنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کون ہیں اور آپ کا حسب نسب کیا ہے، وہ انسان کی شخصیت سے اور اس کی اچھی تربیت سے عیاں ہو جاتا ہے، ورنہ تو اچھے چاٹے حسب نسب والے ایسا کرتے ہیں کہ انسانیت منہ چھپائے پھرتی ہے۔“ اس کے لہجے میں نہ جانے کیوں غمی آئی۔

”خیر تم پریشان مت ہو، یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں اسے بہلاتے ہوئے بولا۔

”مسئلہ سارا اسی زندگی کا ہی تو ہے، جو کچھ لوگوں کو کسی بھی معاملے میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتی۔“ درشہوار کے چہرے پر اضطراب بڑھا اور اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ ہادی کو پہلی بار اس کا ل کے یوں ختم کیے جانے پر افسوس ہوا۔

☆☆☆

تاج دار بیگم آج بڑی فرصت سے ہال کمرے کے تخت پر مہارانیوں کے انداز میں بیٹھی تھیں۔

بابا جان کی شکست نے اصل لطف تو انہیں دیا تھا، وہ ابج کی موت کے بعد ان کے سوچنے کا انداز بالکل مختلف ہو چکا تھا اور وہ دل میں ٹھان چکی تھیں کہ وہ مزید اس گھر کے غلط فیصلوں پر چپ نہیں رہیں گی۔ میر حاکم نے اس معاملے میں مصالحانہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی، اور ویسے بھی یکے بعد دیگرے ہونے والے واقعات نے انہیں بولنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔

ان سارے پریشانی میں ڈوبے ہوئے دنوں میں انابیہ کے امید سے ہونے کی خبر نے آج بہت دن بعد ان کا موڈ خوش گوار کیا تھا۔ برہان کا رویہ کافی حد تک انابیہ کے ساتھ بہتر ہو چکا تھا اور کل تو وہ اسے خود ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر گئے تھے۔

”سنائے آپ کے سر صاحب نے آج ٹی وی کی اسکرین ہی تو زدی۔“ شاہ میر اپنا بیک اٹھائے ہال کمرے میں داخل ہوا، اسے گیٹ پر ہی یہ اطلاع مل چکی تھی کہ حاکم صاحب انتہائی غصے میں ہیں۔ وہ یونٹ سے ایک ہفتے کی چھٹی پر لوٹا تھا۔

”بے فکر ہو، وہ دن دور نہیں، جب تمہارے دادا کا دماغ بھی تمہارے بچا کی طرح الٹ جائے گا اور شاہ صاحب کے مزار پر ایک اور سائیں کا اضافہ ہو جائے گا۔“ اپنی بات پر لطف لینے کے انداز میں وہ خود ہی ہنسیں اور شاہ میر نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا، اسے وہ تہقہہ ٹھوڑا عجیب لگا۔



”بہت بُری بات ہے ای ایسے مذاق نہیں اڑاتے۔“

”ارے مذاق تو اتنے سالوں سے انہوں نے ہم سب کا بنا رکھا تھا اور میں حیران ہوں کہ کیوں ہم سب ہلکے گھوڑے بنے ان کے احکامات پر سر ہلاتے رہتے تھے۔ انہیں ان کی غلط باتوں کا احساس کیوں نہیں دلایا۔“ وہ تلخ انداز میں گویا ہوئیں۔

”الیکشن کی شکست کو تو انہوں نے دماغ پر سوار کر لیا ہے۔“ وہ اپنے جوگرز کے تھے کھولتے ہوئے افسردگی سے بولا۔

”اس شکست سے زیادہ تو انہیں جیل کی سلاخوں کا خوف کھائے جا رہا ہے، تمہارا کیا خیال ہے، اتنے بے گناہ لوگوں کی موت کا حساب نہیں دینا پڑے گا انہیں، مختتم بتا رہے تھے، کسی بھی وقت ان کی گرفتاری کے آرڈرز آسکتے ہیں۔“

”ہاں یہ خبریں تو ہر طرف گرم ہیں، پتا نہیں کیا ہوگا۔“

وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تو وہ محبت سے اس کے گھنے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگیں۔ اسی وقت طوئی ٹرے میں دو چائے کے کپ رکھے کمرے میں داخل ہوئی، شاہ میر کی طرف دیکھ کر وہ ہلکا سا مسکرائی تو اس نے بھی ماں کی گود میں سر رکھے ہوئے اس دکن جاں پر ایک بھر پور نظر ڈالی۔

”تمہاری طرف بڑوں سے سلام دعا کا کوئی رواج نہیں۔“

شاہ میر نے بہت دنوں بعد اسے اس انداز میں چھیڑا تھا۔ ورنہ وہاج کی موت کے بعد تو وہ گویا ہنسنا ہی بھول گیا تھا۔

”کیوں اس بے چاری کے پیچھے بڑے رہتے ہو۔“ تاج دار بیگم نے محبت سے طوئی کی طرف دیکھا، جس کے چہرے پر پھیلا گلابی پن ان کے سینے کا مہیون منت تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں دونوں کو نظر بد سے بچنے کی دعا دی۔

”چلیں، میں پیچھے ہٹ جاتا ہوں، آپ خاقان چچا اور شارقہ چچی کے سامنے درخواست کر لیں، معاملہ ہی ختم ہو جائے۔“ اس کے شرارتی انداز پر طوئی بوکھلا کر کمرے سے نکل آئی اور تاج دار بیگم نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

”شارقہ سے تو میں بات کر چکی ہوں، اسے تو کوئی اعتراض نہیں، اچھا ہے دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں آجائیں گی تو ایک دوسرے کا خیال بھی رکھیں گی، باقی خاقان آج کل اپنی ہی کسی پریشانی میں گم ہے، کسی دن موقع دیکھ کر اس سے بھی بات کروں گی لیکن بہتر ہے فارحہ کی عدت ختم ہو جائے۔“

”فارحہ بھابی سے یاد آیا، کہیں واجی اب مجھے پھانسی کے پھندے پر چڑھانے کی کوشش نہ کریں۔“ اسے اپنی فکر ہوئی۔

”وہ دن گئے جب خلیل خان، فاختہ اڑایا کرتے تھے۔“ تاجدار بیگم ہنوز طنزیہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”مندرت چچی کی طبیعت ٹھیک ہوئی؟“ اسے اچانک یاد آیا۔

”مندرت نے تو ارسل کے ملک سے باہر جانے کو سر پر ہی سوار کر لیا ہے، شکر نہیں کرتی اس جہنم سے کوئی تو نکل کر گیا، اچھا ہے اپنی زندگی بنالے گا، یہاں تو سیاست کی جوڑ توڑ نے ہی زندگیاں برباد کر رکھی ہیں۔“

”میری بات ہوئی تھی ارسل سے، وہ نمبرہ کے ڈاکوئٹس بنا کر اسے بلوا رہا ہے۔“ شاہ میر کی اطلاع پر وہ چونکیں۔

”چلو اچھا ہے، اسے بھی کھل کر سانس لینے کا موقع ملے گا۔“ تاج دار بیگم کے تلخ انداز پر شاہ میر ہنسی سے

انداز میں مسکرایا، وہ جانتا تھا اتنے سالوں کی گھٹن کو پہلی بار کھل کر نکلنے کا موقع ملا ہے۔

☆☆☆

”اوہ مائی گاڈ۔“

ہادی کے منہ سے نکلنے والی اس داستان نے حمزہ کو دنگ کر کے رکھ دیا۔ وہ دونوں اس وقت دامن کوہ پر منال ریسٹورنٹ میں موجود تھے۔ حمزہ کی آنکھوں میں پہلے حیرانی اور پھر بے یقینی اتر آئی۔

”کس فلم کی اسٹوری سنار ہے ہو مجھے۔“ اسے یقین نہیں آیا۔

”اگر ایک ایسی فلم جس کے بندے کو بھی اس بات کا یقین نہیں آ رہا تو یقیناً یہ پھر ایک فلم کی اسٹوری ہی ہوگی۔“ ہادی نے اپنا مذاق خود اڑایا، اور سامنے رکھا میو اٹھا کر یونیورسٹی دیکھنے لگا، وہ نہ جانے کیوں پچھلے چند دن سے عجیب سی افسردگی کے حصار میں تھا۔

”سچ بتاؤ کیا واقعی سچ کہہ رہے ہو تم۔“ حمزہ نے اس کے ہاتھ سے میو کاڑھیں کر ایک طرف رکھا۔

”کاش یہ سب جھوٹ ہوتا۔“ ایک ہلکے سے توقف کے بعد ہادی نے اس کی کھوجی نظروں کی تاب نہ لا کر افسردہ لہجے میں کہا۔

”اور کاش تم یہ بات اسی وقت مجھے بتا دیتے تو میں تمہارے خاندان کا اتنا پتا پتال سے بھی نکال کر لے آتا، لیکن افسوس تم نے اپنے بیسٹ فرینڈ کو اس قابل ہی نہیں سمجھا۔“ حمزہ نے اس سے شکوہ کیا تو وہ ہنسی سے انداز میں مسکرایا۔

”سچ کہوں تو مجھے کبھی اس بات میں انٹرسٹ پیدا ہی نہیں ہوا تھا لیکن فائزہ پھپھو کی اس بات نے مجھے بے چین کر دیا کہ اس رات کسی عورت نے ٹرین سے کود کر خود کشی کی تھی، اگر وہ واقعی میری ماں تھی تو پھر مجھے یہ جانتا چاہیے کہ اس کے پیچھے ایسی کیا وجہ تھی۔“ وہ حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل بناتے ہوئے بولا۔

”تم ابھی اور اسی وقت اپنی پھپھو کو فون کر دو اور ان سے معزز صاحب کا کاغذیٹ نمبر لو، ہم دونوں ان سے ملنے کے لیے چلتے ہیں۔“ حمزہ نے سیکندروں میں فیصلہ کیا تھا اور ہادی اس بات پر حیران ہوا۔

”کیا تم سیر نہیں ہو؟“ اس کی بے یقینی پر حمزہ مسکرایا۔

”تمہارا پتا نہیں لیکن میں شہر زاد کے بعد اگر کسی معاملے میں سیریس ہوا ہوں تو وہ یہی ہے۔“ اس نے دانستہ ہلکا پھلکا انداز اپنایا۔

اسی رات ہادی نے بمشکل فائزہ بیگم سے ان کی فرینڈ کے میاں کا نمبر لیا، وہ کسی بھی قیمت پر دینے پر راضی نہیں ہو رہی تھیں لیکن ہادی اور منال نے انہیں جیسے تیے کر کے منایا لیا تھا۔ معزز صاحب سے اس نے فائزہ بیگم کے حوالے سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے علم ہوا کہ وہ آج کل لاہور میں مقیم تھے اور انہوں نے چند ایک باتوں کے بعد انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

ہادی اگلے ہی دن پہلی فلائٹ سے حمزہ کے ساتھ ان کے گھر لاہور جا پہنچا، معزز احمد ریلوے پولیس سے ایس بی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے اور ہادی نے جب انہیں اپنا مکمل تعارف کروایا تو انہوں نے بہت گرم جوش کے ساتھ اسے اپنے گھر لگایا اور بتایا کہ وہ اکثر اپنی بیوی سے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے تھے جو کہ ہادی کی پھپھو کی بیسٹ فرینڈ تھیں اور انہیں اس بات کا مکمل اطمینان تھا کہ وہ بچہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ ہادی نے وہی گفتگو کے بعد ان سے ڈائریکٹ اس دن کے واقعے کے بارے میں پوچھا۔ جس کے لیے وہ اتنا لمبا سڑ کر کے یہاں پہنچا تھا۔

”انکل! آپ کو اس رات کا واقعہ یاد ہے ناں۔“ ہادی کی آنکھوں میں امید کا ایک جہان آباد تھا۔



”بیٹا! میں کیسے بھول سکتا ہوں کیونکہ وہ میری پروفیشنل لائف کا سب سے حیران کن اور عجیب واقعہ تھا کہ کوئی عورت اپنے چند دن کے بچے کو ایک ویران انٹینسٹی پر چھوڑ کر چلی جائے، اس کے لیے بہت بڑا حوصلہ اور ہمت چاہیے، یقیناً اس کے پس منظر میں کوئی بڑی بات ہوگی۔“

”کیا آپ تفصیل سے بتا سکتے ہیں کہ اس رات کیا ہوا تھا۔“ ہادی کی بے تابی پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔  
 ”ہاں ہاں کیوں نہیں، میں تو اس دن اتفاق سے اپنے ریلوے کے کھٹے کے کسی اہم کام سے اس قصبے میں موجود تھا اور میرا قیام انٹینسٹی کے پاس ایک ریسٹ ہاؤس میں تھا اور واقعے کی اگلی صبح میں انٹینسٹی ماسٹر واجد کے آفس پہنچا تو وہاں جا کر مجھے اس واقعے کا علم ہوا۔“  
 ”آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس بچے کو کسی ٹرین کے مسافر نے وہاں چھوڑا ہے۔“ حمزہ نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

”اس لیے کہ اس انٹینسٹی پر کسی بڑی گاڑی کا اسٹاپ تھا ہی نہیں، اس دن کوئی کر اس پڑ گیا تھا تب ہی خیر میل گاڑی وہاں کچھ منٹ کے لیے رکی تھی اور یہ بات مجھے انٹینسٹی ماسٹر واجد صاحب نے بتائی تھی جو میرے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ انہیں وہ بچہ ایک قلی نے لا کر دیا تھا، جس نے رات کے کسی پہر ایک عورت کو اس ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔“ معیز احمد کی بات پر وہ دونوں زبردست انداز میں چونکے۔  
 ”کیا اس قلی نے اس عورت کا چہرہ دیکھا تھا۔؟ ہادی بے تابی سے گویا ہوا۔

”نہیں۔ وہ اس وقت ہلکی سی نیند میں تھا، لیکن اسے اس بات کی کافی حیرانی تھی کہ وہ عورت کیوں اس گاڑی میں سوار ہو رہی ہے، جس کا یہاں طے شدہ کوئی اسٹاپ نہیں تھا، پھر اس نے خود ہی اندازہ لگایا کہ وہ شاید نکلے سے پانی وغیرہ لینے کے لیے اسی ٹرین سے اتر رہی ہوگی۔ وہ وہیں پلیٹ فارم کے ایک بیچ پر سٹپ اور سٹپ ہوا تھا اور صبح سویرے اس کی آنکھ کسی بچے کے رونے کی آواز سے کھلی، اور یہ آواز اسے شیشم کے درخت کے نیچے موجود سنگ مرمر کے بیچ کے پاس سے آرہی تھی۔ اس نے فوراً جا کر دیکھا تو اسے ایک بچہ سلپنگ بیک میں لیٹا ہوا نظر آیا۔“

معیز احمد سانس لینے کو رک کے اور ہادی کو لگا جیسے اس کا سانس رک جائے گا، وہ بے تاب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خون جمائی سردی کی شدت سے بچے کی حالت بگڑ رہی تھی، وہ قلی گھبرا کر اس بچے کو اپنے کبل میں لپیٹ کر انٹینسٹی ماسٹر کے آفس میں لے آیا، اور اس وقت میں بھی وہیں موجود تھا۔“ انہوں نے اپنی یادداشت کھنگال کر مزید بتایا۔

”پہلے تو ہم لوگ اس بچے کو لے کر ایک کلینک میں گئے۔ کیا ڈور نے کہا کہ فوراً کسی اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے کیونکہ بچے کو نمونہ کی شکایت لگ رہی تھی، اور وہ سانس بھی رک رک کر لے رہا تھا، میں نے اپنی مسز سے رابطہ کیا جو خود بھی ڈاکٹر تھیں، انہوں نے فوری طور پر اسے اپنے ساتھ لانے کا مشورہ دیا، میں یہی سوچ کر اس بچے کو اپنے ساتھ لے آیا کہ اس کا علاج کروا کے اسے کسی شیشم خانے میں چھوڑ دوں گا کیونکہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کے حالات مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا اور مجھے اس بات کا بھی خوف تھا کہ بچہ کہیں غلط ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔“ وہ رکے۔

”آپ نے اس کے پیرنٹس کو تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ حمزہ بے چین ہوا۔  
 ”بیٹا! جو ماں اپنے بچے کو خود ایسے بے آسرا چھوڑ کر چلی جائے۔ اس کو میں کس امید پر تلاش کرتا، اوپر سے بچے کی حالت خاصی خراب تھی، ہم نے تھوڑی بہت بھاگ دوڑ ضرور کی تھی، اس بچے کی باسکٹ میں اس کا برتھ

سرٹیفکیٹ، میڈیسن اور کچھ چیزیں ہمیں ملی تھیں، لیکن اسی دن جب یہ پتا چلا کہ اسی خیر میل ٹرین سے کسی عورت نے بھی رات خود کشی کی ہے تو سارا معاملہ ہماری سمجھ میں آ گیا، اس لیے ہم نے اس بچے کے بانی رشتے داروں کو تلاش کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔“ معیز احمد کی بات پر ہادی کا چہرہ تاریک ہوا۔

”اس برتھ سرٹیفکیٹ پر باپ کے خانے میں کس کا نام لکھا تھا؟“ حمزہ نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔  
 ”بچہ چھوٹو بیٹا! مجھے بچے کا نام وغیرہ تو یاد نہیں، البتہ ملتان کے نشتر ہسپتال کا نام میرے ذہن میں ضرور ہے۔ مجھے واجد نے کہا بھی تھا کہ ہم ہسپتال جا کر اس دن کا ریکارڈ نکھوئے ہیں لیکن میں نے منع کر دیا کیونکہ اسی دن میری مسز نے اپنی بیسٹ فرینڈ کی بھابی کا ذکر کیا تھا، جس کے لیے وہ کوئی بچہ تلاش کر رہی تھی کیونکہ اس کی دوست کی ڈیوری کے دوران ایسی پیچیدگی ہوئی تھی، جس کی وجہ سے نہ تو وہ دوبارہ ماں بن سکتی تھی اور نہ ہی اس کا بچہ جنم لے سکتا تھا، چنانچہ ہم نے یہی بہتر سمجھا کہ اس بچے سے اس عورت کی گودا یاد کر دی جائے، جس کو واقعی اس کی ضرورت تھی۔“

معیز احمد کی بات سن کر ہادی اور حمزہ ایک دم خاموش ہو گئے اور معیز احمد ایک لمبا سانس لے کر مزید بولے۔  
 ”میں تو صرف اتنا جانتا ہوں بیٹا! جس عورت نے اپنے بچے کو ایک سنان انٹینسٹی پر چھوڑ کر خود گاڑی سے چھلانگ لگا دی ہو، یقیناً اس کے پاس زندہ رہنے یا اپنے بچے کو اس کے خونی رشتے داروں کے پاس چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں ہوگا، ورنہ کوئی ماں کیسے اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی ہے۔“  
 ”کیا وہ برتھ سرٹیفکیٹ مجھے مل سکتا ہے؟“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد ہادی نے امید بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”شاید واجد کے پاس پڑا ہو، اس کی پوسٹنگ آج کل سکھر میں ہے، تم لوگوں کو اس سے رابطہ کرنا ہوگا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اتنے سال پرانی چیز اس نے سنبھال کر رکھی ہوگی۔“ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا تو ان دونوں کے چہروں پر مایوسی کی لہر دوڑی۔

”انکل! امید پر دنیا قائم ہے، جب اتنے سال پرانی بات آپ کو یاد ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بھلا بچے ہوں، آپ ان کا کوئی کامیکٹ نمبر مجھے دے دیں، ہم ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ حمزہ کی بات پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔

”میں آپ لوگوں کے سامنے ہی اس سے بات کر کے پوچھ لیتا ہوں، وہ میرا بہت اچھا اور قریبی دوست ہے۔“

انہوں نے فوراً ہی اپنے سیل فون سے واجد صاحب کا نمبر ملایا، ہادی کے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہوئیں۔ دوسری طرف نیل جاری تھی اور چار پانچ گھنٹیوں کے بعد کال انیڈ کر لی گئی۔ معیز احمد بڑے بے تکلف انداز میں اپنے دوست سے محو گفتگو تھے اور تھوڑی سی رکی گفتگو کے بعد وہ ڈائریکٹ اس موضوع پر آ گئے۔  
 ”تم اپنے ڈاکومنٹس چیک کر کے مجھے ابھی بتاؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

انہوں نے جیسے ہی فون بند کیا، ہادی کو ایسے لگا جیسے اس کا وجود فضاؤں میں معلق ہو گیا ہو، وہ دوبار پر لگی گھڑی پر نظریں اٹکائے بیٹھا تھا اور ٹھیک بیس منٹ اور پندرہ سیکنڈ کے بعد معیز صاحب کے سیل فون کی گھنٹی بجی اور ہادی کو اپنی رگوں میں خون کی گردش تھمتی ہوئی محسوس ہوئی۔

☆☆

آخری قسط اگلے ماہ



## میری زندگی ہے تو

”اگر میں تم کو حقیقت بتاؤں تو یہ بات سچ ہے کہ میں بی جان کالے پاک پوتا ہوں۔“  
 ”جس طرح کا برتاؤ وہ کرتی ہیں، کم از کم اس سے یہ ہی معلوم ہوتا ہے۔“ ارمغان نے تپ کر کہا۔  
 ”اچھا، یعنی کیسا برتاؤ۔“  
 وہ جو رات دیر تک تمہارا انتظار کرتی ہیں اور اس سردی میں کھڑکی سے لگی کھڑکی رہتی ہیں یا جب شہزادے کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو بے تاب ہو کر دو اور خدا کا خیال رکھتی ہیں — کس قسم کے برتاؤ کی تم بات کر رہے ہو؟“ دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر منظم میدان جنگ بنا رکھا ہے اور اب تک تمہاری کل

## نافذ ط

سیدھی نہیں ہوئی۔“  
 منظم کی بات سن کر ارمغان بولا۔ ”دیکھو میں بالکل سیریس ہوں، کل میں نے الگ گھر میں شفٹ ہونے کی بات کی، تو رات کا ڈنر آف ہو گیا، میں تو باہر چلا گیا، رات دیر سے لوٹا تو دیکھا بی جان اپنی جگہ پر بیٹھی تھیں اور ڈنر اپنی جگہ پر۔“  
 ”بہت افسوس کی بات ہے ارمغان، تم ان دونوں کا دل دکھاتے ہو۔“  
 ”تو کیا کروں جو انہوں نے میرے ساتھ کیا، اوکے یار! آج مجھے ذرا جلدی گھر جانا ہے۔“  
 منظم کو پانی پیتے اچھو لگ گیا اور بولا۔ ”کیا؟ یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں کہ سید ارمغان شاہ آج جلدی شاہ پریس تشریف لے جائیں گے۔“  
 ارمغان نے گھور کر کہا۔ ”میں نے کب کہا کہ





میں شاہ جیلس جاؤں گا۔ میں تو اس جنگی کی بات کر رہا ہوں جو بابا نے وفات سے چند دن قبل خریدا تھا، مگر اس کے ڈاکو منٹس کلیر نہیں ہوئے تھے اور قانونی کارروائی باقی تھی، اس لیے۔ پھنس گیا تھا، لیکن دو دن پہلے ویل کی کال آئی تھی کہ گھر کلیر ہو گیا ہے۔ لہذا چیک کر لیں، سو میں نے دادا جان اور بی جان سے اس جنگی میں رہنے کی بات کی تھی کہ وہ آفس سے قریب ہے، ویسے بھی میں تنہائی کو پسند کرتا ہوں، اکیلے رہنا چاہتا ہوں، مگر بس پھر کیا ہو امت پوچھو۔“

”یار وہ بوڑھے ہیں، تمہیں کھونا نہیں چاہتے“

منظم نے جواب دیا۔

”بس مغرب کی یہ چیز مجھے پسند ہے وہاں کوئی کسی کی پرسنل لائف میں ٹانگ نہیں آڑتا چاہے وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ چہ جائیکہ دادا اور دادی۔“

اس کی بات سن کر منظم آفس سے دائیں بائیں سر ہلاتا ہوا منظم کو دیکھتا رہا۔

ارمغان نے اس کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ آج اس جنگی کو چیک کر کے اس میں کمپیوٹر سسٹم سیٹ کر لوں تاکہ آفس کا پیپر ورک ذرا یکسوئی سے کر لیا کروں گا۔“

”ہاں تو شاہ جیلس میں کون سا تمہارے درجن بچے ہیں جو تمہیں آفس کا پیپر ورک کرنے میں یکسوئی سے کام نہیں کرنے دیتے۔ بہر حال تم خود مختار ہو تمہیں کون روک سکتا ہے۔“ ارمغان نے منظم کی بات سن کر جواب دیا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو مگر جب میں شاہ جیلس جاتا ہوں میرا تم تازہ ہو جاتا ہے کہ جو سلوک انہوں نے جیسی فرماندہ کے ساتھ کیا۔“

”ہاں تو اس میں ان کا کیا قصور؟ تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں تو کس نے کہا تھا کہ امریکن لڑکی سے دل لگاؤ اور پھر دیدہ دلیری سے لاکر شاہ جیلس میں پورے خاندان کے سامنے کھڑا کرو۔“

”تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ

مذہب بدلنے پر تیار تھی مگر ہمارے ہی دلوں میں وسعت نہیں تھی۔“ ارمغان نے ناراضی سے منظم کی بات کا جواب دیا۔

”مگر یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں کہ جیسی کتنے دن کے لیے مذہب بدلتی۔ دیکھو ارمغان! تم اس کو کلمہ پڑھا کر شادی کر لیتے اور وہ امریکہ جا کر اپنی سابقہ روش اپناتی تو تم کیا کرتے۔“

اس نے بی جان اور دادا جان کے حتیٰ انکار کے بعد ایک بار بھی تم سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور تمہاری واپسی کے بارے میں کوئی وجہی ظاہر نہیں کی سو معلوم ہوا کہ تم الوداع۔“

ارمغان آرام دہ کرسی پر بیٹھا غور سے منظم کی باتیں سن رہا تھا اور دل میں کہیں ان کی تصدیق بھی کر رہا تھا مگر وہ پھر بھی ناراض تھا کہ گھر والوں نے جیسی کو عزت نہیں دی اور اس بات کو لے کر بی جان اور دادا جان اور بی جان کو ناراض کرنے والے تمام کام وہ بہت خوشی سے سرانجام دے رہا تھا۔

☆☆☆

”انزلہ کی بیٹی جلدی کر رہی ہے پھر پھو جان اٹھ گئیں تو دوبارہ پروگرام کیسٹل کرنا پڑے گا۔“ ستائش نے ساتویں بار انزلہ سے کہا جو جلدی جلدی میں کبھی اس کلمے سے غمگین رہی تھی ابھی اس طرف والے سے۔

”ہائے ستائش تم بہت اچھی خالہ بنو گی جس کو ہر وقت میرے بچے یاد آتے ہیں۔“ اور ستائش نے اس بات پر ایک زور کی چٹکی کاٹی اور ساتھ ہی انزلہ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر نکلنے والی جھجکا بھی دبا دیا۔ اب وہ دونوں راز داری سے باہر نکل کر ساتھ والے جنگی کی درمیانی دیوار پھلانگنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اور کامیاب بھی ہو گئیں۔

اندر ایک بہت خوبصورت گھر تھا جس کے چاروں اطراف لان۔ جس میں اعلیٰ مالے اور انار کے درخت لگے تھے اور درمیانی گھاس عدم توجہ کی وجہ سے جھگ جھگ کا سا روپ اختیار کر چکی تھی۔ درمیان سے راستہ نکال کر سیدھا کار پورج اور پھر سڑکیاں اور آگے گھر

کے اندر ہال کا بڑا دروازہ جو کہ بند رہتا تھا۔ گھر اپنے مالکوں کے بہترین ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا مگر مالک اس طرح غائب تھے جس طرح گدھے کے سر سے سینگ (اف اللہ) وہ دونوں بے لکڑی سے چلتی اعلیٰ کے پیڑ کے پاس پہنچیں جس پر کتارے (پچی اعلیٰ) کے ڈھیر سارے کچھے لٹک رہے تھے۔

انزلہ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پیالا بنایا اور درخت کے ساتھ لگا دیا پھر بڑی مہارت سے ستائش نے اپنی فراخ کونخ سے اسے انداز میں اٹھا کر اوپر کیا اور پیالے پر پھر رکھ کر اس کو زینت بخشی اور پھر دوسرا پیالہ درخت کی ڈال پر پھر وہ اوپر اور مزید اوپر چلی گئی اور کتاروں کی بارش شروع کر دی اپنی اس کارکردگی میں وہ دونوں سیاہ کار کو جو پورج میں کھڑی تھی یکسر فراموش کر چکی تھیں۔ گھر کے دروازے جو ایک عرصہ سے بند تھے ان کے کھلنے کی مخصوص آواز سے

انزلہ نے فوراً اس طرف دیکھا اور ہاتھ میں تھا سے کتارے پھینک کر بھاگی مگر جاتے ہوئے ستائش کو پیغام دینا نہ بھولی ”ستائش آگئی آزمائش“ ستائش نے بھی اترنے میں جلدی کی اور جب نیچے کودی اور اپنی محنت کو زمین پر پڑا دیکھ کر انزلہ کو کوئی ان کو اپنی نہیں کے دامن میں بھرنے لگی ایک آدمی کو گھر سے نکلتا دیکھ کر فوراً گاڑی کے پیچھے چھپ گئی۔

گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا تھا کیونکہ ابھی ہی

ارمغان کمپیوٹر نکال کر اندر لے کر گیا تھا اور سیٹ کرنے کا کام کل پر چھوڑ دیا تھا کیونکہ بی جان نے کہا تھا کہ معیار کو ایئر پورٹ چھوڑنے جاتا ہے منظم کی باتوں کا اثر تھا لہذا ماننا پڑا کہ دادا جان کی گھوڑی اور گھوڑی نگاہیں بھی یاد آ رہی تھیں، لہذا گھر پر سرسری سی نگاہ ڈال کر کمپیوٹر رکھا اور واپس ہوا۔

اعلیٰ نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھا تو پچھلے دروازے پر نظر پڑی جو کہ کھلا رہ گیا تھا وہ بند کرنے کے لیے نکلا تو نائز میں ہوا کم ہونے کے اندیشے سے گھوم کر گاڑی کے ٹائر چیک کرنے لگا ستائش کو لگا

اب سانس بند ہوئی کہ تب۔ اس نے جلدی سے کتارے پھینکے اور کھلے ہوئے دروازے سے اندر نیچے کو ہو کر گاڑی میں بیٹھ گئی اسی وقت ارمغان کا فون بجنے لگا اس نے جھنجھلا کر فون نکالا تو دادی کی کال تھی اس نے فون ریسو کیا۔

”آ رہا ہوں آپ نے تو بالکل ڈرا بیور ہی تصور کر لیا ہے“ اور زور سے پاؤں مار کر دروازہ بند کر دیا۔

وہ جو نکلنے کے لیے پر توں رہی تھی دبک کر بیٹھی رہ گئی کہ ارمغان نے گاڑی اشارت کر دی جب جنگی سے گاڑی باہر نکلی تب ستائش کو ہوش آیا مگر اس کی پرانی عادت تھی مصیبت میں کیوتر کی طرح آنکھیں بند کر لو۔ البتہ باہر انتظار کرتی انزلہ نے ستائش کو گاڑی میں دیکھ کر فوراً گاڑی کا نمبر نوٹ کیا اور گھر بھاگی۔ گھر پہنچ کر انزلہ نے ماموں کو فون ملایا اور ایک بی سانس میں ساری بات ردو بدل سے سنا دی کہ کوئی آدمی ستائش کو اس گاڑی میں اغوا کر کے لے گیا ہے ماموں تو ڈی ایس پی تھے گاڑی کے نمبر کے ذریعے پتا لگوا دیا اور کارٹھیل لے کر روانہ ہو گئے۔

معیار بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا اور بی جان کو اس کی ٹالائچوں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ ارمغان کی گاڑی آئی دیکھ کر فوراً بیک لے کر پورج میں آ گیا۔

”کیا ضرورت تھی اب بھی آنے کی؟“ وہ بی جان اور دادا جان کو اللہ حافظ کہتا لگا دروازہ کھول کر بیٹھنے لگا لیپ ٹاپ پیچھے رکھنے کے لیے پیچھے دیکھا تو وہ حیرت سے منہ کھولے پہلے ارمغان کو اور پھر پچھلی نشست پر بیٹھے وجود کو دیکھنے لگا۔

”معیار! کیوں اشیو بن گئے ہو پلیز جلدی کرو“ بیٹھو بھی، ارمغان بولا۔

معیار جھج کر بولا ”یہ بھابھی کو کہاں سے لا رہے ہو اور اگر گھر لے آئے ہو تو گھر کے کینوں سے بھی ملو اور ان بزرگوں سے سلام دعا کرو۔“

اس کی بات سن کر ستائش بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی کہ آزمائش شروع ہو گئی تھی۔



معیز کی بات سن کر ارمغان نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا تو اسے واقعی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ۔۔۔ وہ۔۔۔ اس سے بات ہی نہ بنی کہ معیز نے فوراً دروازہ بند کیا اور پیچھلا دروازہ کھول کر بازو سے پکڑ کر ستائش کو باہر نکالا۔ بی جان اور دادا جان جواب تک کے ہونے والے مکالمے کو سمجھنے کی کوشش میں بھی ارمغان کو دیکھ رہے تھے بھی معیز کو گاڑی سے نکلتی جیتی جاگتی لڑکی کو دیکھ کر رنگ سے رہ گئے۔

”یہ دیکھیں بی جان! ارمغان صاحب کے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ہیں آپ کی بیہوش نام ان سے خود ہی پوچھ لیں۔ ویسے ارمغان صاحب کی اصطلاح میں اس کو نیا کمپیوٹر سسٹم کہتے ہیں۔ سر جھکا کر ہنستے ہوئے معیز نے کہا۔

بی جان سیز صیال اترتی نیچے آئیں۔ ستائش نے آنکھیں بند کر کے درود شریف پڑھنا شروع کر دیا جبکہ ارمغان آنکھیں کھولے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا بھی حیران سا گاڑی کو بھی معیز کو اور کبھی اس لڑکی کو دیکھتا جو نہ جانے کیسے گاڑی میں نازل ہوئی تھی۔

بی جان آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں ”میں بھی سوچوں کہ ارمغان تمہیں الگ گھر کی کیا سوچیں مگر اب میں سب سمجھ گئی ہوں تم اپنی فیملی کو ہم تم ظرف لوگوں میں رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ بہت انسوس ہوا۔“ پھر ستائش کی طرف منہ کرتے ہوئے پوچھا ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی ستائش! ستائش نے تھوگ نکلتے ہوئے جواب دیا۔

”کب کی شادی؟“ بی جان نے اگلا سوال داغا۔

”جی کس نے؟“ ستائش نے حیرانی سے اہل خانہ پر اک نگاہ ڈالی

”تم دونوں نے اور کس نے؟“

میں۔۔۔ وہ کہہ پوچھ لیں سائرن کی آواز نے سب کو متوجہ کر لیا اسنے میں ڈی ایس بی اورنگ زیب اکیلے ہی گھر میں داخل ہوئے تو ستائش فوراً بھاگتی ان کے گلے سے جا گئی۔

”شکر ہے بابا آپ آ گئے“

”قانون کے ساتھ بہت لمبے ہوتے ہیں وہ مجرم کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔“ وہ گاڑی کا نمبر دیکھتے ہوئے بولے ”کس کی گاڑی ہے؟“

معیز نے پکڑ کر ارمغان کو سامنے کر دیا۔ انہوں نے سر سے لے کر پیر تک اس کو بغور دیکھا اور بولے۔

”ہم ان کو ایسٹ کرنے آئے ہیں انہوں نے لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کی ہے۔“

ارمغان حیرانی سے معیز کو دیکھنے لگا جو معاملے کو سمجھنے میں ہلکا ہورہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بی جان اور دادا جان فوراً آگے آئے ”دیکھیں جی بچے ہیں! جو کیا اپنی مرضی سے کیا اور شادی کر لی تو کیا برا کیا۔ ہاں طریقہ غلط ضرور ہے ارمغان کا“ اور گھور کر ارمغان کو دیکھا۔

”ہم ستائش کو اپنی بہو تسلیم کرتے ہیں اور شاہ بیس میں جائز مقام دیتے ہیں گھر کی بات کو تھانے لے کر جانا کچھ اچھا نہیں لگتا ہم عزت دار لوگ ہیں۔ تھانے آج تک کوئی نہیں گیا۔ مجھے بچی بہت پسند ہے، ناور تائید کے لیے بی جان کو دیکھا تو انہوں نے بھی سر ہلا کر ان کا ساتھ دیا۔

ارمغان ان دونوں کی باتیں سن کر سر تھام کر رہ گیا۔

جبکہ ڈی ایس بی اورنگ زیب گھر اور پھر ارمغان کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ معاملہ اغوا کا نہیں ہے۔

معاملہ کچھ اور ہے پھر ستائش سے بولے۔

”یہ سب کیا ہے۔“

”بابا! میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتی میرا یقین کریں، نہ ہی میں نے کوئی شادی وادی کی ہے پلیز بابا۔“

توروں سے ستائش کو دیکھا اور آگے بڑھ کر دادا جان کے بالکل سامنے آئے اور بولے ”ہم عزت دار ہیں اور آپ بھی لیکن عزت داروں ہی کے گھر بھی تالاقی اولاد پیدا ہوتی ہے اور وہ اصل میں سارے خاندان کا امتحان ہوتی ہے، آپ کا لڑکا ابھی میری بیٹی کو اغوا کر کے لے آیا ہے اس لیے میں اس کو گرفتار کرتا ہوں۔“

دادا جان کے پاؤں کے نیچے سے تو زمین ہی کھسک گئی کہ الو کا۔۔۔ لڑکی لایا جی تو ڈی ایس بی کی۔“ فوراً بولے۔

”دیکھیں میں آپ کی بات سمجھتا ہوں لیکن اس کا حل ہے میرے پاس۔ اس کا نکاح کل شام کو ستائش سے کر دیں تاکہ اس کی کرنی اس کو ہی بھرنی پڑے۔ بولیں آپ کو منظور ہے۔“

اورنگ زیب نے ستائش کو دیکھا جو ارد گرد سے بے پروا ہو کر ارمغان کا معاملہ کر رہی تھی جو کہ گرنے ڈریں پنٹ اور بلیک شرٹ پہنے ہوئے تھا پھر بولے ”مجھے منظور ہے“ ان کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی انہیں ستائش کی اس بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ”ان سب کو نہیں جانتی“

”لیکن دادا جان کوئی میری بات تو سنے، اتنی بڑی بات سن کر گویا ارمغان کے ساکت ہوئے جسم میں حرکت ہوئی اور اس نے مقابل سے ٹکر لینے کا سوچا۔

”ارمغان تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے کہاں کہاں اور کتنا شرمندہ کرو گے۔ مجھے تمہاری وجہ سے اور کتنی باتیں سننی پڑیں گی مگر اب نہیں اب اور من مانی بالکل نہیں۔ اب اگر ہماری بات نہ مانی تو کبھی ہماری شکل مت دیکھنا اور نہ اپنی شکل دکھانا چلے جاؤ واپس نہ آنا اور ہاں اگر ہمیں کچھ سمجھتے ہو تو اب ہم کل ملیں گے نکاح پر میں تم سے دوبارہ اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنے والا سمجھتے تم۔“

”لیکن دادا جان میرا قصور کیا ہے۔“ اور دادا جان کے تو مانو آنکھوں سے خون نکل آیا

مگر بولے تو صرف اتنا ”تمہارا قصور تمہارا قصور یہ ہے کہ تم۔۔۔ تم الو کے چٹھے ہو“

ستائش کو دادا جان کے اس جواب پر اتنی زور سے ہنسی آئی کہ سب ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے وہ کھسیانی ہو گئی۔

اورنگ زیب بولے ”ستائش تم باہر گاڑی میں میرا ویٹ کرو میں آتا ہوں“ وہ چلی گئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر دادا جان کا ہاتھ تھام کر اپنا فیصلہ سنایا کہ رات آٹھ بجے آپ لوگوں کا انتظار کروں گا اور پھر فون نمبر اور ایڈریس دے کر روانہ ہو گئے۔

معیز جو اس سارے وقت میں گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگا کر بڑے مطمئن انداز میں کھڑا معاملہ کی تہ تک جانے کی کوشش کر رہا تھا سیدھا ہوا اور فون نکال کر نمبر پریس کرنے لگا۔

”میں نہیں پہنچ پاؤں گا میٹنگ کینسل کر دو“ اور فون بند کر کے بولا ”فلائیٹ تو جا چکی اب اس ارمغان کی شادی میں شرکت تو بنتی ہے نا“

اس کی بات سن کر ارمغان نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور بولا ”مائی فٹ“ اور اندر چلا گیا۔

معیز نے کندھے اچکائے اور دادا جان اور بی جان کو لے کر اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

اورنگ زیب ستائش کو لے کر گھر آئے تو فوراً شیم شیم کمرے میں آنے کا کہا جو ستائش کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینا چاہتی تھیں محض گھور کر بھائی کے کمرے میں چلی گئیں۔

”خیریت بھائی صاحب کیا ہوا؟“ اورنگ زیب بولے۔ ”میں نے کل ستائش کا نکاح طے کر دیا ہے جن چیزوں کی ضرورت ہے بتاؤ میں منگو دوں گا۔“

”لیکن بھائی کہاں کن لوگوں سے اس طرح یوں اچانک سب خیریت تو ہے نا۔“



”وہ پریشانی سے پولیس ”بھائی آپ نے فیملی کے متعلق کوئی معلومات نہیں دیں اور لڑکا اس کے بارے میں بھی تحقیق نہیں کی پھر اتنی جلدی۔“

”بس۔۔۔“ اورنگ زیب نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا جو میں نے کہہ دیا ہے وہ کرو دیے میں نے ستائش کی آنکھوں میں پسندیدگی دیکھی ہے اور میں اچھی طرح جانتا ہوں جب اولاد ہاتھ سے نکل جائے تو وہ ہی کردو جو وہ چاہتی ہے ورنہ دوسرا راستہ اختیار کر لیتی ہے جو زیادہ تکلیف دہ ہے اور مجھ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہوگا اور رہی بات فیملی کی تو میں نے تحقیق کروائی ہے وہ لوگ اچھے اور شریف لوگ ہیں۔“

شیم بیگم نے بچھے دل سے کہا ”ٹھیک ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو۔۔۔“

ستائش جب سے واپس آئی تھی مسلسل روری تھی انزلہ نے بہت بار پوچھا مگر وہ کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

”انزلہ!“

”جی امی!“

”ٹیپو کو کال ملا دو“ وہ موبائل ہاتھ میں لے کر آئیں ”اور اسے بھی ستائش کی شادی میں انوائٹ کرلو“ اور انہوں نے طنز سے ستائش کو دیکھا جو شرم سے بانی بانی ہو گئی اور آہستہ سے بولی۔ ”چھوٹی سی خواہش گتارے کھانے کی اتنی بڑی سزا۔“ اس کی سرگوشی صرف انزلہ ہی سن سکی۔ البتہ اس نے نمبر ملا کر امی کو دیا اور وہ فون لے کر باہر چلی گئیں ادھر اس نے ستائش سے ساری کہانی سنی اور تصور میں اس ہیرو کو دیکھنے لگی جو اپنی صفائی بھی نہ دے سکا۔

☆☆☆

شیم بیگم اور اورنگ زیب دو ہی بہن بھائی تھے۔ گھر میں بیسے کی کوئی فروانی نہ تھی۔ والد ایک دکان چلاتے تھے مگر اس غربت میں بھی اورنگ زیب کو اچھی تعلیم دلوائی۔ والد کا انتقال ہو گیا تو اورنگ زیب والدہ اور بہن کو لے کر شہر آ گئے یہاں پولیس کی

نوکری مل گئی اور جلد ہی ترقی کی منازل طے کرنے لگے۔ ایک دوست سے بہن کی شادی کر دی۔ شادی کے چھ ماہ بعد ماں بھی وفات پا گئیں۔ اب بہن کو بہت دکھ ہوا کہ بھائی گھر میں اکیلے ہوتے ہیں لہذا ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھی اب شادی کر لیں۔

اورنگ زیب بہن کے گھر جاتے آتے نہ جانے کب خیالوں میں اس کی نند سے محبت کر بیٹھے سو فوراً اس کا نام لے لیا بہن تو نہال ہی ہو گئی کہ چاندی اپنی نند تو اسے بھی بہت پسند تھی اور جلد ہی رشتے کی بات چلائی مبارک صاحب (شیم کے شوہر) ان کے ساتھ تھے سو والدہ کو بھی منالیا یوں منالیا رخصت ہو کر اورنگ زیب کے گھر کی مہارانی بن گئی لیکن شادی کے بعد جہاں اورنگ زیب بہت مطمئن ہوئے وہاں منالیا بولا کی سی رہتی تھی۔

ایک دن منالیا فون پر اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی تھی کہ اورنگ زیب نے سن لیا کہ وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں تھی کیونکہ اورنگ زیب اس کی چاہت نہیں تھے اور جو چاہت تھا وہ خود مجبور ہو کر دوسری جگہ شادی کر چکا تھا۔ لہذا وہ سمجھوتے کی زندگی گزار رہی تھی تب اورنگ زیب کو اس کے گریز اور ہر کام میں عدم دلچسپی کی اصل سبب مل آئی مگر وہ اس وقت رشتوں کی ان زنجیروں میں بندھ چکے تھے کہ کوئی فیصلہ کرنا گویا مرجانے سے زیادہ مشکل تھا جبکہ منالیا کے رویے کو وہ اس بات پر محمول کرتے رہے کہ کم عمر بھی ہے اور پہلی بار ماں بننے جا رہی ہے سو پریشانی ہے لیکن اس کے بعد اصل پریشانی والی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اورنگ زیب اس کا خیال تو رکھتے تھے مگر اس کے اپنی دوست کو کہے کہ باتیں بہن محبت بھی بھولی نہیں جاسکتی۔ انہیں کسی طور پر چین نہیں لینے دیتے تھے سو دن اسی طرح گزرتے رہے۔

ایک دن منالیا ایک پیاری سی گڑیا اورنگ زیب کو دے کر خود دنیا سے رخصت ہو گئی۔ تم اورنگ زیب کی شدید لہر نے کچھ عرصہ اہل خانہ کو اپنی پیٹ میں لیے رکھا پھر ستائش کی چیخوں نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ستائش کو لے کر شیم بیگم اپنے سرال چلی

گئیں جبکہ اس وقت ان کی اپنی بیٹی انزلہ بھی چھ ماہ کی تھی مگر ساس نے ساتھ دیا اور انہوں نے دونوں پر مٹا پنچھا ور کی۔

ادھر اورنگ زیب نے تہا زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ پہلی شادی کا تجربہ کوئی اچھا نہیں تھا کہ وہ دوبارہ اس عمل سے گزرتے۔ شیم بیگم کے پاس ستائش کو گئے چھ سال ہو گئے تو ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا اور جب بیٹو چوٹی جماعت میں تھا تو مبارک صاحب پولیس مقابلے میں گولی لگنے سے ہلاک ہو گئے یوں ستائش انزلہ اور ٹیپو کو لے کر شیم بیگم دوبارہ بھائی کے گھر آ گئیں اور اب یہاں پر آئے بھی انہیں دس سال ہو چکے تھے۔ ستائش اور انزلہ ایم اے کر کے آج کل فارغ التحصیل جبکہ ٹیپو بی ایس سی کا طالب علم تھا اور ہاسٹل میں رہتا تھا۔

☆☆☆

سید نعمان شاہ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے ابرار شاہ تھے جو ملک سے باہر پڑھنے کی غرض سے گئے تھے پھر وہاں پر ہی شادی کر لی۔ بیٹھنٹی مل گئی بعد میں کاروبار کیا اور وہ بھی خوب جما پھر جلد ہی صاحب اولاد ہو گئے کہ ارمان نے زندگی کی تمام خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دیں لیکن ساتھ ہی روزی کی بدلتی عادات بھی سامنے آنے لگیں۔

وہ ارمان کو بوجھ سمجھتی تھی اپنی آزادی میں رکاوٹ، سو معمولی جھگڑے ہونے لگے اور پھر روزی دوبارہ پہلے والی زندگی میں لوٹ گئی۔ ابرار صاحب کے پاس سوائے صبر کے اب کوئی چارہ نہ تھا کہ گھر والے پہلے ہی روزی سے شادی والی بات پر سخت ناراض تھے بس بی بی جان بات کر کے حال احوال معلوم کرتیں پھر دادا جان ان سے بہانے سے خیریت پوچھ لیتے مگر خود بات کرنے پر راضی نہ ہوتے وہی کہ ابرار نے غیر ملکی اور غیر منظم لڑکی سے نکاح کر لیا اگرچہ نکل ان کو کلمہ پڑھایا مگر باقی تقاضے پورے کرنے سے روزی عاجز ہی رہی۔

بی جان ہر ہفتے ابرار سے بات کرتیں۔ پہلے وہ

بہت مطمئن تھے مگر اب اکثر فون پر بی جان سے روزی کی شکایت اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے تھے پھر ایک روز ابرار نے فون کیا اور روتے ہوئے خبر دی کہ روزی کو کینسر ہو چکا ہے جو کہ بالکل آخری حدوں تک پہنچ چکا ہے پھر جلد ہی فوت ہونے کی خبر بھی آ گئی۔

ابرار ارمان کو ساتھ لگا کر بہت روئے لیکن پاکستان واپس آنے کا فیصلہ پھر بھی نہ کر سکے۔ اس وقت ارمان چھ سال کا تھا حالانکہ بی جان اور بابا جان نے بہت منت کی لیکن وہ طبیعت کے شروع ہی سے ضدی تھے سو ابرار نے ارمان کو تنہا ہی پالا اور دوبارہ شادی نہ کی۔

اس کے بعد نعمان شاہ کی بیٹی تھی جو ابرار سے چھوٹی تھی اور اس کی شادی سید فرقان شاہ کے چھوٹے بیٹے افتخار سے ہوئی جو کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کی طرف سے لندن میں مقیم تھے مگر شادی کے وقت شرط یہ رکھی کہ وہ کبھی ان کی بیٹی کو ساتھ لندن نہیں لے کر جائیں گے۔ لہذا ایسا ہی ہوا چونکہ دونوں بھائیوں کے گھر ساتھ ساتھ تھے اس طرح بی جان کی بیٹی شادی کے بعد چچا کے گھر گئی تھی سوان کی نظروں کے سامنے ہی رہی اور اپنے گھر کم یہاں زیادہ پائی جاتی تھی ان کی ایک بیٹی تھی نمرہ اور اس کے سات سال بعد عبدالباری ہوا تھا۔

اور سب سے چھوٹے نثار شاہ کی شادی نعمان شاہ کے دوست کی بیٹی سے ہوئی جس کے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ڈالے بڑی پھر معیار اور چھوٹی صبا تھی۔ ڈالے ابھی ایف اے کی اسٹوڈنٹ تھی جب ان کے گھر میں قیامت ٹوٹی کہ نثار شاہ کاروبار کی غرض سے بیرون ملک گئے اور جہاز خرابی کے باعث گرے کہ تباہ ہو گیا۔ ملائکہ نے نثار کے جانے کے دکھ کو بہت زیادہ لیا اور کتے ہی دن اسپتال میں داخل رہیں جبکہ دادا جان نے اپنے پیارے بیٹے کی تدفین محض چند چیزوں کی شناخت سے کر دی۔

بی جان نے بیٹے کی موت کا بہت صدمہ لیا پھر حقیقت کو قبول کرتے ہوئے خود کو سنبھالا اور بچوں کو



بھی بھلایا۔ دادا جان نے بڑے حوصلے سے گرتے کاروبار کی لگا میں تھا میں اور کسبیتہ ہو گئے چونکہ ان کی امیدیں اب معجز سے وابستہ تھیں کہ کب وہ بڑا ہوگا اور اس کاروبار کو سنبھالے گا جس کو اس کے والد نے اندرون اور بیرون ملک پھیلایا تھا۔

وقت کا کام ہے گزر جانا اچھا ہو یا برا۔ بچے بڑے ہو گئے اور بوڑھے مزید بوڑھے ہو گئے۔ معجز بھی آج کل کاروبار میں دلچسپی ظاہر کر رہا تھا اور دادا جان تھکان اتار رہے تھے کہ پچھو جان نے نمرہ کی شادی کی تیاری کر لی اور ابرا صاحب کو بہت تاکید کی آنے کی بڑی بات تو یہ کہ ابرا صاحب مان بھی گئے بلکہ بی جان کو فون پر کہہ دیا میں سارا کاروبار سنبھال کر رہا ہوں اور ایک گھر بھی خرید لیا ہے اب میں اور ارمان مستقل پاکستان رہیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ جوانی میں جو غلطی میں نے کی تھی وہ ہی ارمان بھی کرے کیونکہ وہ بالکل میرا ہی عکس ہے اور بی جان مسکرانے لگیں کہ ان کا بیٹا آ رہا تھا مگر شاید رب کائنات کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ نمرہ کی شادی سے محض چھ ہفتے قبل حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ بی جان اور دادا جان بے حال ہو گئے۔ ملائکہ بھی ایک کو دلا سے دیتی تو کبھی دوسرے کو دیکھتی لیکن جب ارمان ابرا کی ڈیڈ باڈی لے کر پاکستان پہنچے جو کہ ابرا کی وصیت تھی تو ججج ارمان کو دیکھ کر سارا خاندان ہی حیران ہو گیا۔

وہ مغربی اور مشرقی حسن کا استخراج تھا۔ شہزادوں کی سی آن بان والا ارمان دادا اور دادی کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ وہ اس میں ابرا کی شبیہ ڈھونڈنے لگے اور دل کو پچھ سکون میسر آنے لگا۔ جبکہ معجز ڈالے اور صہ بالکل خاموش تھے کہ بتایا سے کوئی انتقامی لگاؤ نہ بن پایا تھا شاید بچے اس سے بڑے عم برداشت کر چکے تھے۔

ارمان نے والد کی ساری رسومات ادا کیں اور وکیل سے مل کر معلوم ہوا کہ بابا نے یہاں پر کوئی بنگلہ لیا تھا ارمان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہذا

اس نے واپس امریکہ جانے کو ترجیح دی لیکن اس وعدہ کے ساتھ کہ وہ نمرہ آپنی کی شادی میں ضرور آئے گا اس عرصے میں اس کی معجز سے کافی دوستی ہو گئی تھی اور وہ کاروباری معاملات میں بھی بات کرتے رہتے تھے۔ پھر ارمان پاکستان آتا جاتا رہتا تھا لیکن دادا جان اور بی جان کی خواہش تھی کہ وہ اچھی سی لڑکی دیکھ کر اس کی شادی پاکستان میں کر دیں تاکہ وہ پاکستان میں مستقل ٹھکانہ بنالے اسی کو کس میں چھ سال کا عرصہ گزر گیا۔

نمرہ دو بچوں کی ماں بن گئی اور ڈالے کی شادی طے ہو گئی جو کہ عبدالباری سے ہونا تھی سو بہت خوشی کا دن تھا اور اس خوشی میں ارمان غیر حاضر تھا جبکہ معجز اس کو دھکی بھی دے چکا تھا کہ اگر وہ اس گھر کی پہلی شادی میں نہ آیا تو آئندہ کسی بھی شادی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صبا آج کل میڈیکل کے فائل ایئر کی طالبہ تھی۔

ڈالے کے نکاح کے دن ارمان نے سب کو سر پرانز دیا اور وہ آگیا لیکن اکیلے نہیں بلکہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بدلیسی حسینہ جیسی فرمائش کے ساتھ اور اس کے مختصر لباس اور ہر ایک سے ہاتھ ملا کر گلے لگنے والی ادا پر جہاں بہت سے لوگ دلچسپی سے اسے دیکھ رہے تھے وہیں پر دادا جان اور دادی جان پورے خاندان سے نظریں نہ ملا سکے۔ ان کے تو اس کی حرکتیں دیکھ کر پسینے ہی چھوٹ گئے بس پھر تو سارے خاندان والے سیدوں کے بیٹے کے کارنامے خوب نمک مرچ لگا کر دو ماہ تک یاد کرتے رہے اور اس کے بعد جو سلوک بی جان نے جیسی کے ساتھ کیا وہ اب تک ارمان نہیں بھولا تھا ایک تو بی جان کو یہ غم کہ ابرا سے کسی جدائی کی وجہ بھی اس کی تو مسلم بیوی بنی اور مرنے کے بعد اس شرمندگی سے نہ ملا کہ والدین کی بات نہ مان کر اب اپنی اجڑی حالت ان کو دکھا کر غمگین نہ کر دے اور اب ارمان بھی بالکل ابرا کے نقش قدم پر چل پڑا ہے بس پھر دادا جان اور بی جان نے مشترکہ پلان بنایا جیسی فرمائش کو رو کر کہ بتایا کہ

ابرا نے معصوم روزی پر کیسے ظلم ڈھائے۔

دادی جان روزی کے لیے اس قدر دردمیں کہ اگر روزی خود ہوتی تو ایک بار دوبارہ مر جاتی بی جان نے بتایا کہ کیسے ابرا نے اس کو قید کر کے رکھا اور اتنے ظلم۔ وہ تو شکر گزار تھی کہ کینسر ہو گیا اور مرنے لگی بس پھر کیا تھا جیسی تو ویسے بھی ارمان سے کم اور اس کی دولت سے زیادہ محبت کرتی تھی اٹنے پاؤں بھاگی امریکہ، اور ارمان پریشان کہ جیسی کو کیا ہو گیا کوئی رابطہ نہیں پھر ایک دن خاندان نے ساری بات ارمان کو بتادی۔ پھر تو ارمان بی جان سے اکھڑا سا رہتا تھا کہ بی جان نے میری خواہش کا احترام نہیں کیا اور یہ ناراضی وقت کے ساتھ مزید بڑھتی گئی بس یہ ہی وجہ تھی کہ اس قدر حسین اور انجلیکس ارمان صاحب اب تک کنوارے گھوم رہے تھے۔

پھر دادا جان نے ارمان کو معجز اور منظم کے ذریعے پاکستان میں بزنس کرنے پر آمادہ کیا۔ منظم دراصل دادا جان کے بہت ہی عزیز دوست کا پوتا تھا اور بہت سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ دادا جان نے خاموشی سے اس کو ارمان کی جاسوسی پر لگا دیا تھا اب اگر ارمان امریکہ تو منظم ساتھ ارمان پاکستان تو وہ بھی پاکستان میں ہوتا تھا اور پھر اس کی ہر حرکت کی خبر روزانہ دادا جان کو دیتا نہ بھولتا تھا، لہذا معجز ارمان اور منظم ان کے بزنس کے بڑے ستون تھے بزنس امریکہ اور پاکستان میں پھیلا تھا دادا جان نے سوچ رکھا تھا کہ کسی طرح اس کی شادی بھی پاکستان میں ہو جائے لیکن ارمان ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

ستائش کو دیکھ کر دادا جان نے فوراً منصوبہ بنایا اور ارمان کو ٹیکل ڈال دی۔

سواب سب اہل خانہ کو باخبر کر دیا تھا جو سب لاؤنج میں ارمان کو موضوع بنائے بیٹھے تھے ڈالے بھی آچکی تھی اور صہ بھی جو کہ نمرہ سے اس واقعہ کی مکمل تفصیل سن رہے تھے ارمان کے چھپرے رستم ہونے اور لڑکی کو بھگانے کے قصے کو خوب نمک مرچ لگا کر سنار ہی تھی جبکہ معجز اس قصے کو اس طرح غور سے سن رہا تھا۔

تھا جیسے بالکل نئی بات ہو۔ ”ہیلو ایوری بڈی“ منظم کی آواز پر ہنسی صہ کو فوراً بریک لگا جس کو فوراً منظم نے محسوس کیا۔

ڈالے فوراً بولی ”ہاں تو جناب آپ اس کارنامے میں کس قدر حصہ دار ہیں۔“

منظم گھبرا کر بولا ”یقین مانیں لیڈر یہ کارنامہ ارمان شاہ نے اکیلے سرانجام دیا ہے لیکن سنا ہے بھابھی ہیں بہت خوب صورت اور بالکل معصوم سی لیکن پھر مچھی میں حیران ہوں میں تو اس کو مستقل نوٹ کر رہا تھا معلوم نہیں یہ لڑکی کہاں سے نکل آئی۔“

”نکل آئی کہ نکلی گئی بے چاری“ نمرہ نے کہا۔ ”ارے نہیں نمرہ آپنی! میرے خیال میں کچھ غلط ہے جو ہم سمجھ نہیں پا رہے۔“

”اچھا چلو تم سب نکاح کی تیاری کرو اپنے چھوٹے سے دامخ پر زور مت ڈالو۔“ اسنے میں ملائکہ سب کے لیے چائے اور ساتھ ہی خاندانی زیورات کے ڈبے لیے حاضر ہو گئی اور بات کا رخ بدل گیا۔

☆☆☆

منظم، معجز کو لے کر دادا جان کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ دادا جان پہلے ہی منتظر تھے وہ شادی کے سارے انتظامات کی تفصیل بتانے لگے وہ چاہتے تھے۔ شادی ارمان کی شان کے مطابق ہی ہو سب اہل خانہ کو متحرک کر رکھا تھا۔ تمام لڑکیاں تیاری کر کے شاپنگ کے لیے روانہ ہو گئیں کہ دھن کا جوڑا ہی لینا تھا، منظم کو ارمان کی کال آگئی کہ وہ ریٹورنٹ میں اس کا انتظار کر رہا ہے سو وہ اور معجز بھی دادا جان کی باتیں خوب اچھی طرح سمجھ کر روانہ ہو گئے۔ ارمان معجز اور منظم ڈنر کر رہے تھے اور ارمان ساتھ اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

”اف ایسی ہوتی شکل کی لڑکی میں خواب میں بھی اسے نہ دیکھوں اور میں یعنی سید ارمان شاہ اس کو بھگا کر“ جھنجھلا کر فوراً کی صبح کی ”مطلب اغوا کر کے لے جا رہا تھا؟“ معجز کافی غور سے اس



بذوق شخص کو دیکھ رہا تھا جو اچھی خاصی خوب صورت لڑکی کے بارے میں ایسے ارشادات فرما رہا تھا کہ اگر وہ خود سن لیتی تو لازماً اس کا سر اس پلیٹ جس میں رکھا تھا کھائے جانے کا منتظر تھا مگر پھاڑ دیتی پھر بولا۔  
”ویسے یار ارمغان وہ لڑکی تمہاری گاڑی میں آئی کیسے؟“

”یہ تو سوچ سوچ کر میرا سر پھٹا جا رہا ہے کہ وہ میری گاڑی میں کیسے آئی جبکہ میں نے گاڑی کہیں روکی بھی نہیں میں آفس سے نکل کر شاہ پبلز گیا وہاں سے جا کر بنگلہ دیکھا اور پھر شاہ پبلز کیا معلوم نہیں۔ او یاں منظم یہ کہیں کوئی بھوتی تو نہیں جو مجھ پر عاشق ہو گئی ہو۔“

”ہاں بالکل اور پھر اس بھوتی کا باپ بھی ڈی ایس بی نکل آیا۔ منظم نے چل کر جواب دیا۔

”بس میری قسمت ہی خراب ہے۔ اب دادا جان کو کون سمجھائے۔“ پھر بڑی دلیری سے بولا، ”تم دیکھنا منظم اگر یہ نکاح ہو گیا تو اس کا انجام بہت عبرت ناک ہوگا۔“

”کس کے لیے تمہارے لیے یا تمہاری سسر کے لیے؟“ منظم نے پوچھا۔

”واٹ کیا کہا؟ سید ارمغان شاہ کی سسر مائی فٹ۔“

”تم نہ مانو تو کیا ہے مگر کل اس وقت تک سب لوگ اسے تمہاری سسر ہی کہیں گے۔ اب یہ اور بات ہے تم کسی کو دعوت نہ دو۔ ویسے مجھے تو دادا جان نے دعوت دے دی ہے۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری دعوت اور شادی۔“

مجھے ان سب سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ارمغان چلا اٹھا۔

☆☆☆

ستائش کی ساری رودادیں کہ انزلہ لوٹ لوٹ ہو گئی اس کی ہسی رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی بمشکل سانس لے کر بولی ”یقین کرو ٹیپو! بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ آزمائش ہو تم اب دیکھو کیا نام بتایا تم نے اس لڑکے کا؟“

ستائش نے گھور کر کہا ”ارمغان۔“

”ہاں ارمغان! اس کو آزمائش میں ڈال دیا۔“

ستائش سنجیدگی سے انزلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”انزلہ بی سیریس مجھے ڈاؤٹ ہے کہ وہ شخص ہائے کریکٹر کلیر نہیں ہے۔ اس کے سب گھر والے اس کے بارے میں عجیب رائے دے رہے

تھے اور اس کی بات کسی نے بھی نہیں سنی۔ ہاں وہاں پر ایک اور لڑکا تھا معلوم نہیں اس کا ارمغان سے کیا رشتہ تھا مگر مجھے وہ بہت نرم دل لگا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس سے کسی طرح رابطہ کروں اور اس کے ذریعے دادا جان کو پیغام دوں کہ ہم بھی اس کو ارض پر پہلے نہیں ملے وہ تو اس ارمغان سے اتنے ناراض ہو رہے تھے۔

ہمارا لحاظ تھا۔ بعد میں جوتے سے ضرور اس کی پٹائی کی ہوگی۔ حالانکہ وہ بالکل بے قصور ہے۔“

”دیکھو ستائش! پلیز اب ایسا کچھ مت کرنا اب ان باتوں کا بالکل وقت نہیں ہے ماموں جان کو تم اچھی طرح جانتی ہو اور ای کو بھی۔ وہ تو پہلے ہی ہماری حرکتوں سے مشکوک رہتی تھیں پھر تصدیق اس واقعہ نے کر دی وہ تو مجھ سے بھی بات نہیں کر رہی ہیں۔“

انزلہ نے کہا۔

ستائش نے کہا ”ویسے اگر پتا ہوتا تو میں کبھی بھی دیوار نہ پھٹا لیتی۔“

انزلہ بولی ”لوہم نے کوئی گناہ تھوڑی کیا تھا یا ر رزق ضائع ہو رہا تھا۔ ہم نے سوچا چلو ہم ہی استفادہ کر لیں۔ اس میں کیا برائی ہے۔“ دونوں ہنسنے لگیں۔

”ویسے انزلہ وہ ارمغان تھا بہت حسین میں تو بالکل اس کی ماسی لگ رہی تھی لیکن مجھے اس کی خاموشی بہت کھٹک رہی ہے۔“ ستائش نے کہا۔

”چلو اب سو جاؤ اتنا سو چو گی تو مزید پریشان ہوگی تم اللہ پر چھوڑ دو۔“ انزلہ نے کہا۔

اسی وقت دھاڑ سے دروازہ کھول کر ٹیپو اندر داخل ہوا اور بولا۔

”ہاں بھی آزمائش اور زلزلے نے ہمارے گھر کی بنیاد تو ہلا دی تھی مگر سنا ہے ہمارے ہمسائے بھی

لڑکے کا؟“

اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔“

وہ دونوں بستر سے نکل کر ٹیپو کے پیچھے پکیں جو نکاح میں شامل ہونے آیا تھا۔ سید حامی کے کمرے میں جا کر سانس لیا۔

☆☆☆

اگلے دن تمام اہل خانہ کافی مصروف تھے پھوپھو دولہا اور تمام اہل خانہ کے تحائف خریدنے

انزلہ کو لے کر مارکیٹ چلی گئیں ٹیپو بھی اور رنگ زیب کے ساتھ مل کر گھر کی ڈیکوریشن کر داتا رہا کہ شام کو فٹشن لان میں ہونا طے پایا تھا۔ پھوپھو اور انزلہ گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک گاڑی میخ ڈرائیور نکاح کے مکمل سامان اور صبا کے ساتھ پہنچ گئی۔ صبا ستائش کو دیکھ کر حیران ہو گئی اور بہت اپنائیت سے ملی اور پھر ستائش کو لے کر پار پار چلی گئی۔

☆☆☆

”امی معلوم نہیں پھولوں کی پلیٹیں کہاں غائب ہو گئی ہیں دولہا والے گاڑیوں سے باہر آگئے مگر پھول غائب ہیں۔“ اتنے میں ٹیپو نے جلدی سے لا کر پھولوں کی ساری پلیٹیں انزلہ کو دیں۔ انزلہ اپنی فراک بڑا دوپٹا اور چوڑیوں گجروں سے مزین ہاتھ اور بال سنہا پٹی پلیٹیں لے کر جلدی سے باہر بھاگی کہ

مٹھائیوں کے ٹوکے لے کر اٹھا کے اندر آتے معیز سے اس زور سے کرائی کہ سارے پھول اچھل کر دونوں کے اوپر گر گئے اور انزلہ سیدی معیز کے قدموں میں بچہ رہی ہوئی۔

☆☆☆

”ماشاء اللہ بھابھی کے گھر پر استقبال تو بڑا شان دار ہوا ہے پیچھے سے آتے منظم نے معیز کی بات پر زور دار قہقہہ لگایا۔ انزلہ اٹھی اور گھور کر معیز کو دیکھتی

ایک طرف سے باہر چلی گئی جبکہ معیز دل پر ہاتھ رکھ کر مڑ کر منظم سے بولا ”ہائے خالہم نکائیں۔“ منظم اس کی حرکت پر مسکرا کر اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں ستائش کے آنے کا شور بلند ہو گیا۔ انزلہ اور صبا کو لے کر کمرے میں چلی گئیں

پھر نکاح ہوا اور اس کے بعد ستائش کو باہر لے جا کر

ارمغان کے پہلو میں بٹھایا گیا، ستائش اگر حسین لگ رہی تھی تو ارمغان حسین تر لگ رہا تھا۔ ارمغان نے بلیک کٹر کا تھری پیس پہن رکھا تھا جس کا گلا شروانی اسٹائل میں تھا اور مین اور سامنے کی پٹی گولڈن ٹکر کے کام سے مزین تھی جو اس کی سرخ سفید رنگت پر خوب جگ رہا تھا، جبکہ ستائش پنک اور گولڈن ساتھ فون ٹکر کی کام والی فراک میں کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

بی جان فوراً آگے آئیں اور ان دونوں کا صدقہ اتارا۔

منظم حیرت کی گہرائیوں سے کنارے پر آیا اور بولا ”ارمغان تمہاری آئی سائٹ کب ویک ہوئی تم اسی لڑکی اغوا کر کے لائے تھے یا کوئی اور تھی؟“ اس سرگوشی پر ستائش نے فوراً نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ارمغان اور منظم کی نگاہیں خود پر پا کر فوراً ہی نظر جھکا لی۔

ارمغان جواب تک بیزار سا بیٹھا تھا اس کی جھکی نظریں دیکھ کر حیران ہو گیا وہ واقعی کل کی نسبت آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور مغرب کی پیداوار ارمغان نے شرمانے کے لیے اندازہ کب دیکھے تھے۔

تب ہی فوٹویشن شروع ہوا فوٹو گرافر دہن کے مختلف پوز لے رہا تھا لہذا ارمغان منظم کو ساتھ لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس کی نئی فرمائش نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”انگل مجھے چند دنوں میں امریکہ جانا ہے اور وہاں مجھے سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے میں چاہتا ہوں کہ آپ آج ہی رخصتی بھی کر دیں۔“

اس نئی فرمائش پر بی جان سر پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور منظم حیران نظروں سے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارمغان! یقیناً کچھ ضرور دال میں کالا ہے تو اس لڑکی یعنی میرا مطلب ہے بھابھی کے پیار میں گوڈے گوڈے غرق ہے۔“ ارمغان نے منظم کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے کر آیا۔

پھر نکاح ہوا اور اس کے بعد ستائش کو باہر لے جا کر ارمغان کے پہلو میں بٹھایا گیا، ستائش اگر حسین لگ رہی تھی تو ارمغان حسین تر لگ رہا تھا۔ ارمغان نے بلیک کٹر کا تھری پیس پہن رکھا تھا جس کا گلا شروانی اسٹائل میں تھا اور مین اور سامنے کی پٹی گولڈن ٹکر کے کام سے مزین تھی جو اس کی سرخ سفید رنگت پر خوب جگ رہا تھا، جبکہ ستائش پنک اور گولڈن ساتھ فون ٹکر کی کام والی فراک میں کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

بی جان فوراً آگے آئیں اور ان دونوں کا صدقہ اتارا۔

منظم حیرت کی گہرائیوں سے کنارے پر آیا اور بولا ”ارمغان تمہاری آئی سائٹ کب ویک ہوئی تم اسی لڑکی اغوا کر کے لائے تھے یا کوئی اور تھی؟“ اس سرگوشی پر ستائش نے فوراً نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ارمغان اور منظم کی نگاہیں خود پر پا کر فوراً ہی نظر جھکا لی۔

ارمغان جواب تک بیزار سا بیٹھا تھا اس کی جھکی نظریں دیکھ کر حیران ہو گیا وہ واقعی کل کی نسبت آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور مغرب کی پیداوار ارمغان نے شرمانے کے لیے اندازہ کب دیکھے تھے۔

تب ہی فوٹویشن شروع ہوا فوٹو گرافر دہن کے مختلف پوز لے رہا تھا لہذا ارمغان منظم کو ساتھ لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس کی نئی فرمائش نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”انگل مجھے چند دنوں میں امریکہ جانا ہے اور وہاں مجھے سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے میں چاہتا ہوں کہ آپ آج ہی رخصتی بھی کر دیں۔“

اس نئی فرمائش پر بی جان سر پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور منظم حیران نظروں سے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارمغان! یقیناً کچھ ضرور دال میں کالا ہے تو اس لڑکی یعنی میرا مطلب ہے بھابھی کے پیار میں گوڈے گوڈے غرق ہے۔“ ارمغان نے منظم کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے کر آیا۔

پھر نکاح ہوا اور اس کے بعد ستائش کو باہر لے جا کر ارمغان کے پہلو میں بٹھایا گیا، ستائش اگر حسین لگ رہی تھی تو ارمغان حسین تر لگ رہا تھا۔ ارمغان نے بلیک کٹر کا تھری پیس پہن رکھا تھا جس کا گلا شروانی اسٹائل میں تھا اور مین اور سامنے کی پٹی گولڈن ٹکر کے کام سے مزین تھی جو اس کی سرخ سفید رنگت پر خوب جگ رہا تھا، جبکہ ستائش پنک اور گولڈن ساتھ فون ٹکر کی کام والی فراک میں کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بیٹھے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔

بی جان فوراً آگے آئیں اور ان دونوں کا صدقہ اتارا۔

منظم حیرت کی گہرائیوں سے کنارے پر آیا اور بولا ”ارمغان تمہاری آئی سائٹ کب ویک ہوئی تم اسی لڑکی اغوا کر کے لائے تھے یا کوئی اور تھی؟“ اس سرگوشی پر ستائش نے فوراً نظر اٹھا کر اوپر دیکھا اور ارمغان اور منظم کی نگاہیں خود پر پا کر فوراً ہی نظر جھکا لی۔

ارمغان جواب تک بیزار سا بیٹھا تھا اس کی جھکی نظریں دیکھ کر حیران ہو گیا وہ واقعی کل کی نسبت آج بہت پیاری لگ رہی تھی اور مغرب کی پیداوار ارمغان نے شرمانے کے لیے اندازہ کب دیکھے تھے۔

تب ہی فوٹویشن شروع ہوا فوٹو گرافر دہن کے مختلف پوز لے رہا تھا لہذا ارمغان منظم کو ساتھ لے کر اورنگ زیب کی طرف بڑھ گیا۔ اور اس کی نئی فرمائش نے سب کو ہلا کر رکھ دیا۔ ”انگل مجھے چند دنوں میں امریکہ جانا ہے اور وہاں مجھے سات آٹھ ماہ لگ جائیں گے میں چاہتا ہوں کہ آپ آج ہی رخصتی بھی کر دیں۔“

اس نئی فرمائش پر بی جان سر پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور منظم حیران نظروں سے ارمغان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

”ارمغان! یقیناً کچھ ضرور دال میں کالا ہے تو اس لڑکی یعنی میرا مطلب ہے بھابھی کے پیار میں گوڈے گوڈے غرق ہے۔“ ارمغان نے منظم کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے کر آیا۔



اب سب لوگ پھوپھو چچی دادا جان بی جان نمرہ آئی اور ڈالے فیم فیم اور اورنگ زیب کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

”اس لڑکی نے میرا تماشا بنا دیا ہے سب کہہ رہے ہیں شادی مبارک۔ مائی فٹ یونو یہ خود چھپیں اپنے منہ سے اپنی بربادی کی کہانیاں سنائے گی جو میں اس کے نصیب میں لکھ دوں گا۔ یہ جھٹکتی بھی اس آگ کو بجھانے کے لیے ہے جو کل سے میرے اندر جل رہی ہے۔ تم دیکھنا میں اس کے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔“ ارمان نے کہا۔

منظم یہ سن پر بہت پریشان ہو گیا وہ ارمان کی جذباتیت سے اچھی طرح واقف تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ستائش کے تمام حقوق اپنے نام کروا چکا تھا۔ لہذا سب بڑوں کے متفقہ فیصلے پر رخصتی کا فیصلہ کیا گیا انزلہ اور ستائش مل کر خوب ہی روئیں اور ارمان یوں ہی اس حرکت پر غصہ ہوتا رہا پھر بابا اور پھوپھو نے بھی بڑی دل گرفتگی سے اس کو الوداع کیا۔

☆☆☆

نمرہ اور ڈالے اس کو ارمان کے کمرے میں بٹھا کر چلی گئیں۔ وہ بہت کشادہ کمرہ تھا۔ لکڑی سامان سے بھرا ہوا تھا ہر چیز سے مالک کا ذوق اور پسینا نمایاں تھا۔ سارے کمرے کا جائزہ لیتے ستائش کی نظر ایک تصویر پر پڑی درمیان میں ارمان اور اس کے دائیں بائیں اس کے ممی پاپا تھے اوہ تو ارمان کی ماما غیر ملکی تھیں۔ اسی لیے اس میں ان لوگوں کی مشابہت ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز پر فوراً نظر جھکا گئی۔

ارمان نے اس کی معصومیت اور ہوش اڑانے والے حسن کو دل سے تسلیم کیا لیکن سخت آواز میں بولا۔

”دیکھو تم نے جو بھی کیا وہ تمہاری مجھ تک آنے کی پلاننگ تھی مگر میں کوئی ٹاسک نہیں ہوں۔ تم ہمیشہ میری جوتی کے مقام پر رہو گی سواں سے اوپر آنے کی کوشش بھی مت کرنا اور اس خوب صورتی کے داؤ مجھ پر مت چلانا کہ یہ بالکل بے کار ہوں گے۔ ہاں

البتہ۔“ پھر ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی سے چہرہ اوپر کیا اور بولا۔ ”میں تم سے تم کو چھین لوں گا تب تمہیں اندازہ ہوگا کہ ایک مرد کی اتنا اور غیرت سے کھیلنے کا انجام ہوتا کیا ہے۔ تم نے کیا سمجھا کہ دادا جان کی بات مان کر نکاح کر کے میں یہاں قید ہو جاؤں گا بالکل غلط۔“

ستائش نے آنکھیں بند کر لیں۔ زندگی پہلے بھی ایسی ہی تھی پہلے بابا جان کی بے اعتباری اور اب شوہر کے روپ میں ارمان کی تو جان لو ستائش زندگی تمہارے لیے کھل بھی نہیں ہوگی سواں نے طاقت کے نشے میں اپنا کہا بچ کر دیا اور ستائش کو بالکل ہی بے قیمت کر دیا۔ ان گناہوں کی وجہ سے جو اس نے کبھی کیے ہیں نہیں تھے نہ تو عدالت گئی نہ کوئی گواہ بس فیصلہ سنا دیا گیا حالانکہ اگر ارمان کے ساتھ غلط ہوا تھا تو اس کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوا تھا سواں نے خود کو وقت کے سپرد کر دیا۔

☆☆☆

دیے کی تقریب بھی ختم کر کے محض پانچویں دن ارمان نے امریکہ جانے کی تیاری کر لی زندگی میں تم اس سے قبل بھی تھے کہ بی بی جان نے انکوئی اولاد والی حیثیت اسے نہیں دی تھی مگر اب تو زندہ رہنا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے دادا جان اور بی جان کی محبت میں اور ان کی خدمت میں ہی خوشی کو تلاش کر لیا سواں ستائش کمرے میں کم اور وہاں زیادہ پانی جاتی تھی۔

بی جان نے ارمان کے امریکہ جانے کے فیصلے پر بہت شور مچایا اور سبھایا۔ ”دیکھو ارمان ابھی چند دن اور مت جاؤ۔“

”بی جان! آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ امریکہ میں میرے کتنے کام ادھورے ہیں۔“

”پاکستان میں تمہارے اپنے تمہارے بغیر ادھورے ہیں۔“ اور آنکھوں میں آنے آنسو صاف کرنے کے لیے مڑیں تو نظر ستائش پر پڑی جواتی توجہ سے بیڈ شیٹ درست کرنے میں مصروف بھی گویا

دنیا میں سب سے اہم کام یہ ہی ہو۔ بی جان پلٹیں اور فوراً ارمان سے بولیں۔ ”اچھا پھر ستائش کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔“

ارمان سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا وہ اس کی وجہ سے ہی تو جلدی جا رہا تھا کہ شروع میں اس کے آنے کی جتنی کوفت تھی اب نہ جانے کہاں لپٹی گئی تھی حتیٰ کہ اب آس سے آ کر ارمان کا دل چاہتا تھا سب سے پہلے ستائش نظر آئے، مگر وہ اکثر اس وقت دادا جان کے کمرے میں ہوتی تھی۔ پھر بچن اور جب بالکل سونے کا وقت ہوتا اس وقت کمرے میں آئی تھی سو اس نے سوچا یہ سب اس کے قریب ہونے کی وجہ سے ہے لہذا چلے جانے کا فیصلہ کیا اب بی جان کی نئی فرمائش پر بکھلا کر بولا۔

”بی جان! یہ اکیلی وہاں کیا کرے گی۔ میں کام کے سلسلے میں سارا دن باہر رہوں گا پھر چند دوستوں سے ملنے لندن بھی جانا ہے سو یہ پریشان ہو جائے گی۔“

جواب سن کر ستائش نے سر اٹھایا اور بولی۔ ”بی جان واقعی میں ابھی کہیں نہیں جانا چاہتی آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ پلیز مجھے اچھی کہیں مت بھیجیں۔“

ستائش کے جواب نے ارمان کو جلا کر رکھ دیا ہونٹ بھیچ کر ستائش کو گھورنے لگا۔

تو ارمان صاحب آپ کے بغیر مرنے میں بھی نہیں رہی، جائیں اپنی آزادی کی زندگی میں گمن ہو جائیں اگر آپ کو میری کوئی ضرورت نہیں ہے تو میں بھی اپنے دل میں پیدا ہونے والی محبت کا گلا دبا دوں گی۔ کبھی بھی آپ کی طرف مائل نہیں ہوں گی۔ اتنی عزت نفس تو ہے ہی میرے اندر اور پھر اپنی اس سوچ کو خود ہی تصور میں داد دینے لگی۔ اپنی اتنی گہری سوچ میں مستقل نظریں ارمان کے چہرے پر مرکوز تھیں جو کہ جانے کی تیاری میں مصروف کھڑی ہاتھ پہ باندھ رہا تھا۔ کمرے کی خاموشی کی وجہ سے نظریں اٹھائیں تو ستائش کو اس انہماک سے اپنی طرف

دیکھتے پا کر فوراً بی جان کو دیکھا جو ہنستی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ارمان کھڑکھڑا کر بولا ”تم کھڑے کھڑے اسٹیپو بن جاتی ہو۔ بی جان دیکھ رہی تھیں اور تم مجھ پر نظریں گاڑے معلوم نہیں کون سا خزانہ دریافت کر رہی تھیں۔“ او۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ نظریں جھکانیں اور پلٹ کر ایسی کام میں مصروف ہوئی کہ اس کے بعد ارمان سے سامنا نہ ہوا اور وہ چلا گیا۔

☆☆☆

دادا جان نے خاص کر منظم کو ساتھ جانے کا کہا تھا کہ وہ ارمان کی روزانہ رپورٹ دادا جان کو دے گا اور وہ اس کام کو اچھے سے کرنے کا ماہر تھا۔ اسی طرح دن گزرتے رہے۔ ستائش کی گھر کے سب افراد سے ہی دوستی ہو گئی تھی خاص کر دادا جان سے وہ اکثر ان ہی کے کمرے میں پانی جاتی تھی ایک دن چائے پیتے ہوئے بولی۔

”دادا جان آپ ارمان کے والد کے بارے میں کچھ بتائیں وہ کیوں چلے گئے تھے۔“

”بس بیٹا میرا شوق تھا کہ وہ باہر کی یونیورسٹی میں پڑھے۔ بی جان تو مانتی ہی نہ تھیں بس پھر ہماری قسمت اس نے وہاں پر شادی کر لی۔ شروع میں تو سب ٹھیک تھا لیکن ارمان کی پیدائش ہی جھگڑے کا سبب بنی بس پھر پریشان ہی رہتا تھا۔ کیونکہ روزی کو بچے آزادی میں رکاوٹ لگتے تھے۔“

”تو کیا؟ وہ میرا مطلب ہے ارمان کی والدہ غیر مسلم تھیں۔“

”ارے نہیں بچے مسلمان کیا تھا مگر پھر شاید وہ شادی کے بعد مستقل اس دین پر نہ رہی اور واپس پہلے والی زندگی میں لوٹ گئی۔ بس اس چیز نے ابراہ کو توڑ ڈالا تھا۔ میں خوف زدہ تھا کہ ابراہ کے بعد میں ارمان کو نہیں کھونا چاہتا تھا تو ارمان کے لیے مجھے تم بہت پسند آئیں۔“

”لیکن دادا جان وہ جو پوچیشن بنی وہ محض اتفاق تھی میں ارمان کو یا ارمان مجھے بالکل نہیں جانتے



تھے بس سب اس طرح ہو گیا۔

”مجھے معلوم ہے بچے اول روز سے ہی! تجربات میں زندگی گزری ہے اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہوں پھر منظم نے بھی تصدیق کر دی کہ تم لوگ پہلے کبھی نہیں ملے مگر مجھے اسے قابو کرنے کا چھابہ نہ مل گیا تو میں نے اس کو ٹیکل ڈال دی۔“

معیز جو دادا جان کی دوائیاں لے کر کمرے میں آ رہا تھا ساری بات سن کر حیران ہو گیا اور دادا جان کے پاسی دماغ کو داد دینے لگا۔

”واؤ دادا جان آپ نے اس تیل کو ایسی ٹیکل ڈالی کہ نہ ہاتھ چلے نہ پیر۔ بس چھری چلے گی“

”کیا؟“ ستائش چیخ کر بولی ”یہ تیل کس کو کہا؟“

تینوں زور سے ہنسنے لگے بس اس دن اس راز

میں منظم کے ساتھ یہ دو افراد اور شامل ہو گئے اور

زندگی کی گاڑی آگے چلنے لگی۔ ارمغان کو گئے تین ماہ

ہو گئے تھے وہ اس کاٹ پر پی جان سے روزانہ بات

کرتا تھا لیکن ستائش کبھی سامنے نہیں آئی اور نہ ہی

ارمغان نے اس کی خواہش ظاہر کی منظم روزانہ اس کی

یومیہ رپورٹ دادا جان کو دے رہا تھا۔ زندگی مشین کی

طرح چل رہی تھی۔

☆☆☆

انزل ستائش کے بعد گھر میں بالکل اکیلی ہو گئی

تھی سو ہی کو اور ماموں کو راضی کرنے میں مصروف تھی

کہ وہ چاہ کرنا چاہتی ہے لیکن وہ لوگ کسی صورت

نہیں مان رہے تھے۔ ستائش اور معیز دونوں اورنگ

زیب سے ملنے گئے تو ہاں جا کر معلوم ہوا کہ انزل

جاب کے لیے ضد کر رہی ہے۔

اورنگ زیب بولے ”میں کسی جاننے والے

کے ہاں ہی جاب کی اجازت دوں گا۔“

انکل! ہمارے آفس میں جگہ ہے اگر آپ برانہ

مائیں تو وہ قریب بھی ہے۔“

اس طرح انزل معیز کے ساتھ کام کرنے لگی۔

☆☆☆

ستائش کی طبیعت میں بے انتہا سستی آتی تھی

وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی تو معیز کو صوفے پر لیٹے پایا۔

”معیز بھائی اچانک نہیں گئے؟“

”ہاں کیوں نہیں! نمرہ! آپنی بھی آگئیں“ نمرہ کو

آتے دیکھ کر معیز بولا۔

ستائش چائے بنانے چلی گئی جبکہ نمرہ اور معیز

باتوں میں مصروف ہو گئے۔ چائے بن کر آئی اور

اچھے ماحول میں چائے پی گئی کہ نمرہ کو پھوپھو نے

بلوایا وہ لوگ آج کل صبا کے لیے آئے منظم کے رشتے

کے بارے میں غور کر رہے تھے وہ چلی گئی معیز اور

ستائش لاؤنج میں رہ گئے۔

”یار کب سے ارمغان کا نمبر پڑائی کر رہا ہوں

وہ فون نہیں اٹھا رہا۔“ موبائل ستائش کی طرف

بڑھاتے ہوئے بولا ”اگر کال آئی تو تم ریسیو کر لینا“

میں بس چیخ کر کے آتا ہوں بہت ضروری بات

ڈسکس کرتی ہے۔“

”اوکے“ موبائل پکڑتے ہوئے ستائش بس

اتنا جواب ہی دے بانی معیز چلا گیا اور واقعی موبائل

کی تیل ہونے لگی ستائش نے ایک دم اچھل کر موبائل

کو دیکھا اب کیا کروں فون ریسیو کروں کہ نہ کروں

پھر جلدی سے اوکے کا بٹن دبا کر موبائل کان سے لگا

لیا مگر ہمت نہیں کہ بات کر سکے سو بہت ہمت کر کے

اسلام علیکم کہا۔

معیز کے نمبر پر ستائش کی آواز سن کر ارمغان تو

آپے سے باہر ہو گیا۔ ”تم تو بہت ڈھیٹ لڑکی ہو۔“

ابھی تک یہاں پر ہی عیش کر رہی ہو حالانکہ میں نے

تمہیں کبھی گھاس نہیں ڈالی اور نہ ہی میرا بولنے کا کوئی

ارادہ ہے لہذا تم اپنا قیمتی وقت ضائع مت کرو اور کوئی

اور شکار بھانسو مگر پلیز میں تمہیں معیز کو چھانے کی

پریشانی بھی نہیں دوں گا۔“ سمجھیں لہذا یہاں سے دفعان

ہو جاؤ۔“

اس قدر تلخ باتیں سن کر تو ستائش کا دماغ ہی

گھوم گیا اور وہ چکر اڑھڑام کی آواز سے زمین پر گر

گئی نمرہ فوراً اٹھ گئی آئی اور ساتھ ہی سیڑھیاں اترتے

معیز نے ایک چھلانگ میں فاصلہ طے کر کے ستائش کو

اٹھانے کی کوشش میں نمرہ کی مدد کرنے لگا۔

پھوپھو اور ملائکہ بیگم بھی دوڑی آئیں معیز نے

ستائش کے سر سے خون بہتا دیکھا تو چیخ کر بولا ”میں

گاڑی کھاتا ہوں اس کے سر سے خون نکل رہا ہے فوراً

اسپتال لے کر جانا پڑے گا

سب ہی اٹھتے ہو گئے تھے جبکہ معیز اور نمرہ

ستائش کو لے کر روانہ ہو گئے۔ نمرہ نے ستائش کو اپنے

ساتھ لگایا ہوا تھا جب وہ ایک کراہ کے ساتھ سیدھی

ہوئی۔

”ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔“ ستائش کی بات

پر نمرہ نے جواب دیا ”تمہیں لے کر ڈاکٹر انکل کی

طرف۔“

ستائش فوراً گھبرا کر بولی ”نہیں میں بالکل ٹھیک

ہوں دراصل صبح ناشتہ نہیں کیا تھا اسی وجہ سے ذرا چکر

آگئے اب گھر جا کر کچھ کھالوں گی آپ لوگ فکر مت

کریں مجھے گھر لے چلیں“

”اوکے! مگر بینڈیج تو کر والو۔“ پھر قریبی

ڈسپنسری سے بینڈیج کروا کر گھر آگئے۔

بی جان نے ستائش کو سینے سے لگایا اور بولیں

”خدا کا شکر ہے میری بچی ٹھیک ہے۔“

نمرہ نے کہا ”گزروی ہے اس کو کھانے کی

تلفیق کی گئی اور جان چھوٹ گئی مگر ستائش اسے اندر

ہونے والی تبدیلی سے اچھی طرف واقف تھی اور کسی کو

شریک راز نہیں بنانا چاہتی تھی جس کو چاہتی تھی وہ اس

کے بارے میں کیا سوچتا ہے یہ جان کر تو اس کی دماغ

کی ریلیں ہی پھٹ رہی تھیں حالانکہ جس منصب سے

وہ فیض یاب ہونے جا رہی تھی اس کا تقاضا۔

یہ تھا کہ وہ ساری زندگی ارمغان کے ساتھ

گزارتی اور وہ گزارنا چاہتی تھی کیونکہ بن ماں

یا بن باپ کے اولاد کن خرمیوں کا شکار ہوتی ہے وہ

بہت اچھی طرح جانتی تھی لیکن ارمغان تو اس کو کوئی

اور قسم کی لڑکی سمجھتا ہے اور غلط فہمی ان میں شادی سے

پہلے ہوئی تھی وہ اس کو اس کے تخریب کار ذہن کی

کارستانی سمجھتا ہے وہ تو اس بات پر سر رہی تھی۔

اگر ارمغان نے طلاق دے دی محض تین ماہ

بعد تو وہ کیا منہ دکھائے گی بابا کے گھر کس طرح جائے

گی لیکن پھر دماغ کی سن کر وہ ان واقعات پر غور

کرنے لگی اگر یہاں پر رہ کر بھی عزت نفس مجروح

کرنی ہے تو بابا کا گھر ہی ٹھیک ہے وہاں پر کوئی بہتان

تو نہیں لگا سکتا لہذا ایک فیصلہ کر کے مطمئن ہو گئی

کیونکہ وہ بھی تھکنے لگی تھی اس قدر غلط سوچ ہے

ارمغان کی اس پر کس طرح سمجھو تا کروں۔“ ان ہی

سوچوں کے درمیان اس کی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

”میلو ستائش آریو اوکے۔“ مگر کوئی جواب نہ

ملنے پر اس نے کال کاٹ دی کیونکہ منظم کافی دیر سے

اس کو بلا رہا تھا۔

”یار ارمغان! اتنی دیر کر دی میٹنگ تھی اور تم

ابھی تک اسی طبلے میں گھوم رہے ہو جلدی درست کرو اپنا

پلیز۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں تم بیٹھو میں ابھی تیار ہو کر آتا

ہوں۔“

ارمغان جلدی سے چیخ کر کے باہر آیا وہ

دونوں آفس چلے گئے آج ان کی کمپنی دوسری کمپنی کا

آرڈر سائن کر رہی تھی جس کی تیاری میں تقریباً پانچ

ماہ لگ سکتے تھے اور شرط یہ تھی کہ وہ کام اپنی نگرانی میں

کروا تھا سو انہوں نے عمدہ پرافٹ کو دیکھ کر ڈیل

سائن کر دی۔

منظم بار بار اس کی غائب دماغی کو نوٹ کر رہا

تھا وہ بار بار پانی کو منہ تک لے کر جاتا اور کلاس واپس

رکھ دیتا۔ آخر تھک کر بولا۔ ”چلو اب بتا بھی دو کیا

بات ہے جو اتنے بے چین ہو رہے ہو۔“

ارمغان بولا ”کچھ نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے۔“

”وہ بس ذرا تھک گیا ہوں گھر جا کر ریٹ

کروں گا تو بہتر محسوس کروں گا“ اور منظم کے کندھے

پر ہاتھ رکھتا ہوا چلا گیا۔



کمرے میں آکر ارمغان نے لیپ ٹاپ کھولا اور لی جان سے باتیں کرتا اپنا کوٹ اتار کر ساتھ ہی ٹائی ڈھیلی کی آج وہ کمرے میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی آخر مجبور ہو کر سٹائش کے بارے میں پوچھ لیا۔ دادی جان کو تو پہلے ہی بہانہ چاہیے تھا خوب کلاس لی اور ایسی کھری کھری سنائیں کہ بس۔ پھر کہنے لگیں ”ارمغان چلو اب ایک چکر پاکستان کا لگاؤ لگتے جاؤ سے پیارہ کر تم اس کو لائے تھے اس بات پر ارمغان کی آنکھیں باہر آ گئیں۔

”دیکھو بیٹا! اسے تمہاری ضرورت ہے وہ تمہاری بیوی ہے تمہارے لیے اپنا سارا گھر چھوڑ کر یہاں آئی ہے اب دیکھو تم نے اسے کبھی فون نہیں کیا مگر اس نے بھی شکایت نہیں کی حالانکہ تمہارا کام تھا تم اس کو تین چار بار تو دن میں کال کرتے۔“

”بی جان میں یہاں پر کب فارغ ہوں۔ آپ نہیں جانتیں یہاں کتنا کام ہوتا ہے۔“

”ہاں بیٹا درست کہا تم نے مجھے کیا معلوم تمہارے دادا نے یہ سارا کاروبار بھی سنبھالا اور گھر کو بھی وقت دیا۔ پتا نہیں اب کے بچوں کے پاس فیکل کے لیے وقت کیوں نہیں ہے بس بیٹا ایک چکر لگاؤ دل بہت پریشان ہے سٹائش بھی بالکل کھائی گئی ہے بہت کمزور ہوئی ہے۔“

”بی جان دراصل ابھی پانچ ماہ تو سوچا بھی نہیں جاسکا کیونکہ۔“

”بس کرو ارمغان بس۔ کوئی بہانہ نہ بیانا تم نے پہلے کب کوئی بات لی جان کی مانی ہے جواب مانو گے۔ تم سے تو وہ پرانی پٹی ہی اچھی ہے کم از کم ہماری خدمت کر کے ٹواب ہی کما لیتی ہے ورنہ ہم اس کے لگتے ہی کیا ہیں۔“ دادا جان نے گرج کر کہا۔

دادا جان کو دیکھ کر ارمغان نے اللہ حافظ کہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

معزز کمرے میں لیٹا موبائل چیک کر رہا تھا کہ ارمغان کی کال دیکھ کر حیران ہو گیا۔ یعنی شاہ

میں نے سب کو بچ بتانے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر پھر اس کے بعد کون سا میرے ناکردہ گناہوں کا ازالہ ہوگا لہذا تم میری طرف سے بالکل آزاد ہو جب چاہو اس بندھن سے خود کو آزاد کر کے اپنے آزاد معاشرے میں زندگی کی نئی شروعات کر سکتے ہو اور جو بھی ہوا اس میں میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی تم سے معافی مانگتی ہوں۔“ وہ آنسوؤں کو بے دردی سے ہاتھوں کی پشت سے صاف کیے بانی کے چھیننے منہ پر مارے کر بالوں کو کچھ میں قید کر کے لیپ ٹاپ ملازمہ کے ذریعے بی جان کو پہنچایا اور بیک لے کر باہر آ گئی کہ معزز مسلسل ہارن پر ہارن وے رہا تھا۔

آخری نظر کمرے پر ڈالی تو بیڈ کی سائڈ پر رکھی نکاح کی تصویر اٹھائی اور پنڈ بیک میں ڈال کر باہر چلی آئی۔ چکراتے سر کو مسلسل ایک ہاتھ سے دباری لگتی اس کی اس غیر ارادی حرکت کو میسر حیاں اترتے ہوئے معزز نے دیکھ لیا تھا۔

”وہ میں موبائل بھول گیا تھا وہ لینے گیا تھا۔“

بیک اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ”سٹائش! تم اسے کے لیے جا رہی ہو۔“

”جی۔“ سٹائش نے معزز کی بات پر نظر چڑا کر جواب دیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد ہے۔“ گاڑی میں بیٹھے سٹائش نے جواب دیا۔

”مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہی تمہیں گل ہی ڈاکٹر کی طرف جانا چاہیے تھا مگر تم نے ضد کی۔“

”وہ میں پچھو پچھو کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

”معاف کرو بہن اور تم کرو میری حالت پر اور جوانی پر تمہاری اس کزن نے تو مجھے غمجا کر دینا ہے۔“

”اف کتنا ڈرتے ہیں آپ انزلہ سے جبکہ وہ تو بہت سویٹ ہے۔“

”ہاں تو ان کے سویٹ ہونے پر میں نے کب

اعتراض کیا ہے بلکہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ وہ محض سویٹ ہی نہیں بلکہ اسارٹ بھی کافی ہیں۔“ اس طرح کی باتوں میں ہی وہ سٹائش کو اپستا لے کر آ گیا۔

سٹائش نے باتوں میں دھیان نہ دیا تھا مگر اب اترے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا سو اس کو گاڑی سے اترنا پڑا اور ڈاکٹر نے جو خبر سنا سٹائش تو اس سے آگاہ بھی البتہ معزز بہت خوش تھا بولا۔

”تم دیکھنا سٹائش! ارمغان کس قدر خوش ہوگا۔ اگلی فلائٹ سے پاکستان نہ آیا تو میرا نام بدل دیتا۔“

”پلیز معزز آپ وعدہ کریں آپ اس بارے میں انہیں کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

معزز اس کی دگرگوں حالت اور اشک بار آنکھیں دیکھ کر کسی انہونی کے خوف سے کانپ کر رہ گیا۔ ”سٹائش سب خیر ہے تمہاری ارمغان سے کیا بات ہوئی۔ کیا وہ اولاد نہیں چاہتا۔“

سٹائش نے نفی میں سر ہلایا ”معزز وہ مجھے نہیں چاہتا وہ مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ وہ بلکہ بلکہ کر رونے لگی۔

معزز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا ”اصل میں دادا جان سچ کہتے ہیں یہ بھی بات کو سیدھے طریقے سے نہیں مانتا لیکن تم فکر مت کرو سر کے بل آئے گا معافی مانگے گا تمہارے پاؤں پکڑے گا میرا وعدہ ہے تم سے بس تم میری ہدایات پر عمل کرنا بانی کام مجھ پر چھوڑ دو۔ پہلی بات یہ کہ تم نے اب اس کی کال ریسیو نہیں کرنی اب تم گھر چلو کی یا انزلہ کو کون کی طرف۔“

”نہیں میں ابوی کی طرف ہی جاؤں گی۔“

”اوکے۔“

☆☆☆

صبح ناشتہ کرنے کا بالکل سوڈ نہیں تھا تو وہ جوس کا گلاس لے کر اپنے کمرے میں آ گیا کپڑے پہنچ کرنا ایک ہاتھ سے ٹائی سیٹ کرتے لیپ ٹاپ آن



کیا تو بیچ کھول کر پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ ”اونو“ جو میں اتنے دنوں سے اس کو سزا دے رہا ہوں وہ تو خود میری طرح بے قصور ہے، چلو آج آکر اس سے بات کرتا ہوں۔“

آفس پہنچتے ہی معجز کی کال نے حیران کر دیا کہ سٹائن گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے اور وہ وطلاق مانگ رہی ہے، یعنی کوئی لڑکی ارمان شاہ کو بھیکٹ کر رہی ہے، بس پھر تو وہ پاگل ہی ہو گیا اس نے ہر ممکن کوشش کی سٹائن سے بات کرنے کی لیکن سٹائن نے بھی دل سخت کر لیا تھا اسی طرح تین ماہ گزر گئے ڈالے صبا اور نمرہ آپنی اکثر ملتے رہتے تھے اور صبا اپنی فریڈ کی بہن سے آج کل سٹائن کی ٹریسٹ کروا رہی تھی البتہ بی جان اور دادا جان سے فون پر بات ہو جاتی تھی مگر پتا نہیں معجز نے ان کو کیا کہا انہوں نے بھی سٹائن کو گھر آنے کے بارے میں مجبور نہیں کیا۔

آج کل انزلہ اور معجز نے مل کر ارمان کو سیدھا کرنے کے منصوبوں پر عمل شروع کر رکھا تھا اور منظم کو بھی ساتھ ملا لیا تھا البتہ سٹائن کی زندگی بہت بے رنگ ہو گئی تھی۔ پھوپھو جان اکثر اس کی حالت کے پیش نظر اس کی دل جوئی کرتی رہتی تھیں جب کہ اورنگ زیب ویسے ہی چٹان کی طرح سخت بنے پھرتے تھے۔ زندگی ایک نقطے پر آکر رک گئی تھی نہ آگے بڑھتی تھی نہ کوئی احساس نہ تم اور نہ خوشی۔ بالکل بارش کے اس پانی کی طرح جو گڑبھوں میں رک جائے تو سوائے تکلیف کے کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ ایسی ہی سٹائن کی زندگی تھی کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہاں نکالیف لائقہ اور۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے ایک نقطے پر نظر جمائے بیٹھا تھا ”ارمان چلو یا را! ایک اینڈ ہے ہمیں باہر چلنے ہیں“ منظم نے اس کے ارکان کو کوڑا۔ ”موڈ نہیں ہو رہا کمرے میں جا رہا ہوں کچھ ریٹ کروں مگر عجیب تھکن سی محسوس ہو رہی ہے“ وہ

ایسا ہی ہو گیا تھا نہ باہر جانا نہ دوستوں سے ملنا بس کام کیا اور گھر۔

”اچھا چلو کچھ دیر رک جاؤ میں کافی بنا کر لانا ہوں تمہارے لیے بھی اور اپنے لیے بھی تم اتنے میں پاکستان بات کر لو شاید اچھا مل کر ڈالے اور جانے کے لیے مڑا ساتھ ہی موبائل نکال کر معجز کو بجایا۔ ”یار! ڈونڈرا ہلکی رکھو نہیں سیدھا کرتے کرتے شہید ہی نہ کر دینا بالکل مجنوں بنے پھرتے ہیں آج کل۔“

جب منظم کافی بنا کر لوٹا اس وقت ارمان بی جان سے باتیں کر رہا تھا۔ بی جان سلاخیوں پر ایک ننھا سا سویٹر بن چکی تھیں اور اب اس کے آخر کے دھاگے پھینچی سے کاٹ رہی تھیں اور ارمان سے باتیں بھی کر رہی تھیں۔

دیکھو ارمان! کتنا پیارا ہے۔“ آخری دھاگہ کاٹ کر سویٹر کو سامنے کر کے بولیں۔

”یہ تو بہت چھوٹا ہے بی جان! نمرہ اور ڈالے کے بے بیڑ تو اب بڑے ہو گئے ہیں۔“

بی جان نے کھو کر کہا ”ہاں تو تم سے کس نے کہا کہ یہ ان کے بے بیڑ زکا ہے یہ تو سید ارمان شاہ کے بے بی کا ہے۔“

کافی اس کی طرف بڑھاتے منظم کا ہاتھ چھلکا اور کافی ارمان کے پیروں پر گر گئی وہ پیر جھاڑتا اٹھا اور نگاہ اٹھا کر منظم کو دیکھا۔ منظم نے اس کی آنکھوں میں دنیا کی ساری خوشیاں مل جانے کی چمک دیکھی وہ بہت خوش تھا لیکن بی جان کی اگلی بات نے اس کی آنکھوں سے جان ہی نکال دی اور وہ فوراً صوفے پر بیٹھ گیا۔

”سٹائن بہت پریشان رہتی ہے منتقلی چیک اپ کروانے پر بھی راضی نہیں ہوتی۔ ہاں اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم بھی نہیں ہے کہ اس کے ہاں چکر لگاؤں اور وہ ہے کہ گھر آنے پر راضی نہیں ہے۔ ہاں البتہ جا اپنی دوست کی بہن سے اس کا علاج کروا رہی ہے اور

معجز نمرہ ملائکہ ڈالے چکر لگاتے رہتے ہیں صبا بتا رہی تھی اس کی رپورٹ کچھ نسلی بخش نہیں ہے۔ بہت پریشانی ہے۔ مجھے تو ”کیا کروں؟“ ارمان کی پریشانی پر لاتعداد مٹی نمودار ہو گئے اور اللہ حافظ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”یار منظم! اب کیا کروں اگر اس کو یا بے بی کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔“ سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”ہاں تو تمہیں اس سب سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم گزارو اپنی آزاد زندگی اپنی من مانی کر دو حالانکہ اس کی اس حالت کے ذمہ دار صرف تم ہو۔“ منظم نے ارمان کو گھور کر کہا۔

ارمان فون نکال کر معجز کا نمبر ملائے لگا۔

معجز اور انزلہ آفس کم اور گھر کے معاملات زیادہ ڈیکس کیا کرتے تھے اور معجز انزلہ کے دماغ کی تخریب کاریوں سے خوب فائدہ حاصل کر رہا تھا کہ وہ کام جس کو وہ دوماہ سے کر رہا تھا لیکن بات نہیں بن رہی تھی انزلہ نے اس کو دو ہفتوں میں ہی کر دکھایا تھا۔ سب سے پہلے انزلہ نے بی جان کو سٹائن کی حالت کے بارے میں مطلع کیا جس کے بعد گھر میں طوفان آگیا دادا جان نے تو خوب ہی کلاس لی اور سب نے ہی ارمان کو برا بھلا کہا ملائکہ بھی حیران تھی کہ اس قدر خون سفید ہو گیا کہ اولاد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ پھوپھو بھی کافی غضب ناک ہوئیں اور دادا جان نے تو فیصلہ ہی سنا دیا کہ اگر سٹائن کے ساتھ کچھ برا ہو تو میں ساری زندگی نہ ارمان کی شکل دیکھوں گا نہ اپنی دکھاؤں گا کیونکہ وہ اس احساس میں گرفتار تھے کہ ان کا بھی قصور ہے۔ جس طرح انہوں نے ان دونوں کی شادی کروادی اس طرح بھی یہی شادی ہوتی ہے۔ لہذا اب ازالہ کرنا چاہتے تھے بس سب اہل خانہ دادا جان کی بات پر مشتق ہو گئے۔ اور یہ خیریں اڑتی ہوئی ارمان کے کانوں میں بھی پہنچ چکی تھیں معجز کے فون پر کال آنے لگی۔

”ارمان کال کر رہا ہے،“ معجز نے حیرت اور

خوشی سے انزلہ کو بتایا۔ ”ایسیکر آن کرو پلینز! میں بھی سنوں گی۔“ انزلہ نے بے چینی دکھائی۔ معجز نے ایسیکر آن کر دیا۔ ”ہیلو“

”ہائے!“

”کیسے ہو معجز؟“

”اچھا ہوں۔“

”وہ تو تم ہمیشہ سے ہی ہو۔“

”کام کی بات کرو میں درامصرف ہوں۔“

معجز نے اکر دکھائی۔

”کیا مصروفیت ہے تمہاری اس وقت“

تو معجز ترنت بولا ”کسی کا چہرہ پڑ رہا ہوں“ اور نگاہیں انزلہ کے چہرے پر جمادیں جو ہاتھ میں پین اسٹینڈ اٹھائے دانت پیس رہی تھی اور معجز کے رد میں کھ موڈ کا پیرا خرق کر رہی تھی۔

”بولو میں تمہیں سن رہا ہوں۔“ معجز سیدھا ہو کر

بولا۔ ”وہ بی جان بتا رہی تھیں کہ تم چاچو بننے والے

ہو۔“ ہاں سنا تھا انزلہ نے دفتر جو ان کیا ہے تو اس

نے بتایا تھا لیکن وہ بتا رہی تھی کہ سٹائن ایسا کچھ نہیں

چاہتی وہ کہتی ہے جب ہماری زندگیوں میں اس قدر

بے اعتباری اور دوری ہے تو اس بچے کو مستقل اور ایک

چھت کب مل سکتی ہے سو قصہ ختم کروانے کے لیے

آج کل ڈاکٹروں کے پاس گھوم رہی ہے۔“

انزلہ نے سوچا اگر معجز کی یہ بات سٹائن سن

لے تو یقیناً ہمارے سر پھاڑ دے۔

ارمان فوراً کھڑا ہوا اور بولا ”تم اس کو روکو۔

سمجھاؤ کہ ایسا کچھ مت کرے میں اپنے بچے کو ایک

گھر کیوں نہیں دے سکتا۔“

”دات؟ آریو میڈ؟ میں تمہارا مطلب ہے

میں اس کو سمجھاؤں یہ تمہارا امریکہ نہیں ہے۔ شرم بھی

کسی چیز کا نام ہے مگر تم کیا جانو تم نے کب یہ سبق

پڑھا ہے۔“

”آئی میں ڈالے نمرہ صبا کوئی تو سمجھا سکتا ہے



یقین کرو تمہیں اندازہ نہیں بی جان کس قدر خوش ہیں تم کیسے بھی اس کو روکو۔“

”دیکھو ارمان میں تمہاری بی جان کو خوش کرنے والی عادات سے اچھی طرح واقف ہوں اور کچھ کا تو مشاہدہ اپنی ان گناہگار آنکھوں سے کر چکا ہوں سو پلیز اپنی بات کرو کہ تم کیا چاہتے ہو۔“

بس پھر ارمان کی اتنا اور ضد کی دیواریں زمین پوس ہو گئیں بولا ”معیز میں فیملی چاہتا ہوں منزل کی جستجو کرتا ہوں گھر کا سکون بھی جیسی میں تو بھی اس کی طرح کی اور لڑکیوں میں ڈھونڈتا ہوں میں بہت سی لڑکیوں سے دوستی رکھی مگر حدود بھی نہیں توڑیں۔ منزل کا یقین نہیں ہے میں تھک گیا ہوں۔ اصل کی طرف لوٹنا چاہتا ہوں۔ میں یہاں پر لڑکی میں ستائش کی شہیہ تلاش کرتا ہوں اسے روکو کچھ بھی غلط کرنے سے پلیز میری اس سے بات کرو اور پلیز۔“ اور فون بند کر کے اچھال کر صوفے پر پھینک دیا۔

معیز اس سے اس قدر جامیانہ اظہار محبت کی توقع نہیں رکھتا تھا جبکہ انزلہ آنکھیں کھلے چہرانی سے معیز کو دیکھ رہی تھی پھر زور سے اسے چٹکی لگائی اور ہنستی چلی گئی اور اس کی ہنسی میں معیز کی ہنسی بھی شامل تھی۔

☆☆☆

ارمان اپنے آفس میں چکر لگا تا کبھی دائیں جانب کبھی بائیں جانب نہایت احتیاطی کیفیت کا شکار تھا۔

”منظم اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“ منظم نے ہنر بڑا کر سر فائل سے باہر نکالا اور بولا ”پہلے تو میں تمہاری جگہ بھی ہوتا ہی نہ اگر ہوتا تو یہ وقت میری زندگی میں بالکل نہ آتا کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے ایک حادثے کے طور پر ہی مجھے اتنی اہمیت اور اس قدر خوب صورت پیوی دی ہوتی تو میں شکر ادا کرتا نہ کہ تمہاری طرح اس کو رسوا کرتا۔“ منظم نے خوب آئینہ دکھایا۔

”میں پاکستان جانا چاہتا ہوں قبل اس سے کہ

وہ کچھ غلط کرے۔“

”واٹ؟ تو یہاں پر کام کون دیکھے گا؟“

”تم دیکھو گے میں جلد ہی ستائش کو لے کر لوٹ آؤں گا۔ اتنے دن تنہا تم بیٹھ کر لوگے اس کے بعد میں مستقل پاکستان چلا جاؤں گا۔“

منظم منہ فائل کے اندر کر کے مسکرانے لگا وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ارمان پاکستان جائے اور اپنی بڑی غلطیوں کی تلافی کر لے اس سے پہلے کہ واقعی دیر ہو جائے کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہ کر جان چکا تھا کہ جتنا یہ اوپر سے سخت اور بے گانہ بنتا ہے اتنا ہی نہیں اور نہ ہی وہ مغرب کی زندگی سے خوش ہے کیونکہ اس کی زندگی بھی تو ان میں سے ایک تجربہ ہی تھی۔

☆☆☆

تین سال میں منظم اتنا تو ارمان کو پڑھ ہی چکا تھا۔ آج کل ستائش اپنی طبیعت میں عجیب بیزاری محسوس کر رہی تھی پھر پھر جان دل بہلاتی سرحدوں کب بہلاتا تھا وہ ہر وقت اس دشمن جان میں ایثار کرتا تھا اور دل و دماغ کی اس جنگ میں وہ تھک چکی تھی فون کی تیل پر چوٹی صبا کا لنگ دیکھ رہی فون ریسپونڈ کر لیا۔

”کیسی ہو ستائش! تم کل ڈاکٹر کی طرف کیوں نہیں گئیں؟“

”وہ صارف اصل میں بہت لیزی ہو رہی ہوں بالکل دل نہیں کرتا کہیں جانے کو۔“

”ابھی اٹھو ستائش تیاری کرو ڈاکٹر زارا کے پاس تمہاری اپائنٹمنٹ ہے۔ معیز تمہیں پک کر لے گا وہ گھر سے نکل گیا ہے اور تمہاری طرف آ رہا ہے۔“

ناچار ستائش کو اٹھنا پڑا۔ اشارے لے کر پنگ کمر کا سوٹ جس کے بارڈر اور آستین پر لائٹ گرین کمر میں دھاگے کا کام ہوا تھا۔ دو پنا خوب پھیلا کر لیا اور بالوں کو نازک سے کچر میں آدھے کھلے اور آدھے قید کیے فائل لے کر نیچے چلی آئی۔ پھر پھر تیاری دیکھی تو پوچھ لیا۔

”بیٹا! خیریت کہاں جا رہی ہو؟“

”وہ دراصل پھر پھر ڈاکٹر کو دکھانا تھا صبا لاری

ہے میں جاؤں۔“ معیز کی گاڑی کی آواز سن کر ستائش نے پھر پھر سے پوچھا۔

”ہاں بیٹا جاؤ۔“

وہ جانے لگی تو پھر پھر کی آواز سن کر رک گئی۔

”ستائش بیٹا ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“

جب سے انزلہ نے ماں کو ستائش کی زندگی کی حقیقت بتائی تھی وہ بہت شرمندہ تھیں کہ انہوں نے ستائش کی بات کیوں نہ سنی؟ کیا انہوں نے ماں بننے کا حق ادا کر دیا۔

”نہیں پھر پھر کیسی باتیں کرتی ہیں یہ تو میرا نصیب تھا جو روز ازل سے اسی طرح لکھا ہوا تھا، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔“ اور آنکھوں میں آئے آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے گیت غور کر گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی معیز کو سلام کر کے پہلا سوال داوا جان اور بی جان کے بارے میں کیا۔

”ہاں وہ دونوں تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔“

”پلیز معیز مجھے ان سے ملو اور تمہاری ہدایات نے تو مجھے بالکل قیدی کر دیا ہے۔“

”بس ستائش چند دن اور رک جاؤ پھر فیصلہ تمہارا ہوگا جس طرح تم نے چاہا اسی طرح ہوگا لیکن بھائی ہونے کے ناتے ایک ایڈوائز دوں۔“

”کیا مطلب؟“ ستائش نے حیرانی سے معیز کو دیکھا۔

”اس مطلب و طلب کو چھوڑو اور میری بات غور سے سنو منظم بتا رہا تھا کہ ارمان بہت پریشان ہے جب سے اس نے گڈ نیوز سنی ہے وہ پاکستان آنے کے لیے بہت بے چین ہے شاید تم نے غلطی کی ہے یہ سب پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا تو تمہارے درمیان اتنی غلط فہمیاں نہیں ہوتیں۔“

”غلطی تو ہمارے درمیان اول روز سے ہی ہے اور وہ دور کرنے کے لیے مل کر بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ ارمان کو گوارا نہیں تھا آپ کیا سمجھتے ہیں میں نے وضاحت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن جس نے میری عزت کی حفاظت کرنی تھی وہی میرے کردار پر

کچھ اچھا لگے گا بس یہ مجھے برداشت نہیں تھا۔“

گاڑی اسپتال کے گیٹ سے اندر کرتے معیز نے ٹشو باکس ستائش کے سامنے کیا اور بولا ”اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو اندر صبا تمہارا ویٹ کر رہی ہے جب تم لوگ فارغ ہو جاؤ مجھے کال کر دینا میں تمہیں ڈراپ کروں گا۔“

”اوکے؟“ ستائش نے اپنی فائل لی اور ڈاکٹر کی طرف چل پڑی۔

معیز کو صبا نے کال کر کے بلایا تھا لہذا وہ اپنے مقررہ وقت پر گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ گاڑی سے باہر نکل کر بولا ”تم ستائش کو لے کر آ جانا میں صبا کی گاڑی میں آ جاؤں گا کیونکہ ستائش کے ہاتھوں تمہاری درگت بننے میں تو کم از کم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔“

”ٹھیک ہے“ ارمان نے جس کو معیز ابھی لپٹا کر روٹے لے کر سیدھا آ رہا تھا ہنس کر جواب دیا۔

اسی دوران ستائش اپنی رپورٹ فائل میں ترتیب دیتی دروازے سے باہر آئی ارمان آج اسے چھ ماہ کے بعد دیکھ رہا تھا حسین تو بلاشبہ وہ پہلے بھی تھی لیکن غم واداسی نے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

ستائش نے رک کر اپنی مطلوبہ گاڑی تلاش کی اور معیز کی گاڑی پر نظر پڑے ہی جلدی سے گاڑی کی طرف آئی۔ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہی بولی۔

”پلیز آج تو دادا جان اور دادی جان سے ملو

مستحیما

تیت - 400 رپے

مستحیما

تیت - 400 رپے

32735021



## شمینہ فرحان

# علم سے اعمال

”چلو جلدی چلو بس آدھے گھنٹے میں بند  
نئے اتارنے سے لے کر... لیب کوٹ اتار کے  
ہوجائے گا۔“ رو ما کرے میں آتی ہی جلدی جلدی  
الماری میں ٹانگ کے اپنے جوتے موزے اتار کے  
کی رٹ لگانے لگی..... اپنا کالج بیک کندھے  
چپل پہننے تک لگتا تھا اس میں کوئی جاپانی بھردی گئی ہو۔



دو“ اور جیسے ہی نظر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص پر  
بڑی تو ساری کائنات ہی گویا ختم گئی جبکہ اس کے  
برعکس ارمغان جو بڑی فرصت سے دونوں ہاتھوں کو  
سینے پر باندھے اس کا مکمل جائزہ لے رہا تھا  
بولاً۔ ”دادا جان اور بی جان سے ملنے کی اتنی بے تابانی  
اور میں جو فون کروں وہ بھی نہیں سنتا مجھ سے بات کرنا  
بھی گوارا نہ سمجھا اور اب جو بات سب سے پہلے  
جاننے کا میں حق دار تھا وہ مجھے سب سے آخر میں پتا  
چلی۔ وہ بھی بھلا ہو بی جان کے بنائے گئے سویٹر کا  
تم نے تو مجھے اتنی بڑی خوشی سے دوڑ رکھا بلکہ محروم کرنا  
چاہا کیوں؟ ستائش کیوں کیا واقعی تم مجھ سے اتنی  
نفرت کرتی ہو“

ستائش کی نظریں چمک گئیں اور بولی ”ارمغان  
میں کبھی آپ کی خوشی نہیں تھی آپ نے شروع ہی سے  
اپنی زندگی کو امریکہ میں سیٹ کرنا تھا پھر میرے کردار  
کے بارے میں بھی آپ کے بہت سے غلط اندازے  
تھے میں بے قصور تھی مگر اس بات کو آپ ماننے کے  
لیے بالکل تیار نہیں تھے ایسے حالات میں، میں اور کیا  
فیصلہ کرتی۔“

”میں مانتا ہوں، میں نے بہت غلط کیا ہے  
تمہارے ساتھ اور اپنے تمام قریبی رشتوں کے ساتھ  
منظم ٹھیک کہتا ہے مجھے بغیر رشتوں کے رہتے رہتے  
ان کی قدر ہی نہیں رہی لیکن تم یقین کر دو میں نے  
رشتوں کو چھوڑنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا  
میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم سے معافی کس طرح  
مانگوں۔ اپنی اس بکواس کی جو میں نے فون پر تم سے  
کی لیکن پلیز مجھے معاف کر دو تم بالکل اتفاق سے  
میری زندگی میں شامل ہو گئی ہو پھر بھی میں نے شکر  
نہیں کیا۔ اور جانتے ہوئے مجھیں تکلیف پہنچائی لیکن  
اب وعدہ کرتا ہوں تمہیں اپنی ذات سے ملے تمام  
دکھوں کا ازالہ کروں گا تم میرا ہاتھ تمام لو بھی نہ  
چھوڑنے کے لیے میں اپنی تمام بری عادتیں میرا  
مطلب جو تمہیں پسند نہیں ہیں چھوڑ دوں گا۔ ہم جلی

بنائیں گے کیا تمہیں منظور ہے اگر ہاں تو پھر ہم دادا  
جان کی طرف چلیں۔“ پر امید لگا ہوں سے ستائش کو  
دیکھا جس نے شخص سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اثبات کی  
تصدیق کر دی کیونکہ وہ بھی اس پر وہی شہزادوں والی  
آن بان رکھنے والے شخص سے محبت کر بیٹھی تھی۔  
ارمغان نے لمبا سانس خارج کیا اور گاڑی  
اشارت کر دی نظر ستائش کی گود میں رہی فائل پر پڑی  
تو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ستائش نے فوراً فائل  
پر ہاتھ رکھ دیا اور آنکھوں سے گھورا۔  
”یار دیکھ رہا ہوں؟“  
”کیا؟“  
”یہ ہی کہ فیملی والی خواہش کب تک پوری  
کر دی۔“

ستائش اس کی بات سن کر مسکراتی ہوئی کھڑکی  
سے باہر بھاگتے مناظر دیکھنے لگی۔ اور ارمغان گنگنا تا  
ہوا گاڑی دوڑانے لگا۔  
”عم ہے یا خوشی ہے تو میری زندگی ہے تو۔“  
اور ذہن میں معیر کی کئی باتیں گونجنے لگیں جو  
ایر پورٹ سے واپسی پر کہی گئی تھیں جب اس نے  
پوچھا ”کیا ضرورت تھی انزلیہ کو آفس میں رکھنے کی  
جبکہ کوئی خاص سیٹ بھی نہیں تھی تو معیر دل پر ہاتھ رکھ  
کر بولا۔“ اس دل کی ضرورت تھی۔ وہ لڑتی ہوئی ملی  
میرے دل میں آ رہی تھی۔ اب تم اور ستائش مل کر  
میرے راسخے ہوا کر دو گے۔“  
”کیوں؟ تو یہ نیک کام تم نے خود کیوں نہیں کیا۔“  
”یار کر لیتا کروہ زبان سے زیادہ ہاتھ چلانے  
کی قائل ہے بس اسی لیے رک جاتا ہوں اب تمہاری  
راہیں میں نے ہموار کی ہیں۔ بدلے میں تمہارا اتنا  
فرض تو بنتا ہی ہے اگر تم بھجوتو۔“  
لہذا اب جلد ہی ان کے بارے میں بھی کچھ کرنا  
تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے تھوڑی تھوڑی دیر بعد  
ستائش کو پیار بھری نظروں سے دیکھ لیتا جو آنکھیں بند  
کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے اللہ تعالیٰ کی شکر  
گزار ہو رہی تھی جس نے اس کی دعائیں قبول کر لی



اور میں تو مجسمہ حیرت بنی سوچے گئی کہ یہ وہی روما ہے۔ جسے امی آوازیں دے، دے کے تھک جاتی تھیں کہ رومی بیٹا کھانا کھالے۔ چائے پی لے کر لڑیا ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اور روما صاحبہ یہ کہہ کر کہ ”بس امی ایک پیرا گراف رہ گیا ہے۔ ختم کر کے آتی ہوں۔“ کے بعد بھی گھنٹہ بھر کے بعد ہی جلوہ افروز ہوتی تھیں۔ روما کو تو لگتا تھا کہ دنیا میں صرف پڑھنے کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے گھر میں کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے۔ کون سا ڈرامہ ”ہٹ“ جا رہا ہے۔ ان باتوں کی تو حیرانہ بھی پروا بھی ہی نہیں..... پر غصہ تو تب آتا جب محترمہ اپنا کھانا پینا تک بھول جاتیں۔

امی تو ابھی تک یعنی اس کے میڈیکل میں داخلے کے بعد تک کہتی تھیں۔ ”پتا نہیں یہ لڑکی ڈاکٹر کیسے بنے گی۔“ میڈیٹھوں سے اترتے مجھے یاد آیا کہ ابھی پچھلے سال جب اس کے F.S.C کے امتحان ہو رہے تھے۔ ہماری امی جان گن کے سات بادام روزانہ رات کو پانی میں بھگو کے اپنی لاڈلی کو صبح نہار منہ کھانے کی تاکید کے ساتھ دے کے جاتیں کہ لاڈلی کا دماغ تیز ہوگا۔

غصہ تو مجھے آتا جب محترمہ کے کالج جانے کے بعد کمرے کی صفائی کرتے ہوئے وہ پھولے لٹوے ہوئے باداموں والا بدبودار مائلو جس میں لگتا تھا کہ جراثیموں کی نشوونما کے لیے کوئی کیمیائی تجربہ کیا گیا ہو کمرے کے کسی کو نہ کھد رے میں اپنی قسمت کو روتا ہوا ملتا۔ باداموں کو کوڑے کے ڈبے میں پٹختے کے بعد گلاس کو دھوتے ہوئے مجھے اسی اور روم دونوں پر غصہ آتا..... بیٹی ہے کہ انتہا کی کھلکھلاؤ اور

اماں ہیں کہ ممتا سے مجبور۔  
 ”امی آپ مت دیا کریں یاد ام اس بھلکے  
 کو..... آپ کو چاہے نا وہ کھانا بھول جاتی ہے میں  
 رگڑ، رگڑ کے کالج کے گلاس پر سے کشتی رنگ آلود  
 دھبے مابھتی ہوئی دہائی دیتی۔

سے بھی اسنے آپ کو اور بھی ان سب کو تنگ رہی تھی۔  
 ”سنو کوئل صرف ایک کا کھانا ملے گا ہمیں.....  
 بعد میں ہم کینٹین سے چائے کے سینڈوچز کھالیں گے۔“  
 رومانے میرے کان میں اسی مناسرو گوئی کی۔  
 ”تو پھر ضرورت کیا ہے لائن میں گلنے کی؟“  
 میرا انداز بہر حال سرگوئی کا سا تھا آواز نہیں..... جس  
 مرا کچی پچھلی لڑکیاں متوجہ ہو چکی تھیں اور رومانو تو جھٹ  
 گردن نیچے کیے یہ یاد کرانے کی کوشش میں تھی کہ  
 میرا اس سے بہن کا تو کیا..... کوئی اور تعلق بھی نہیں  
 ہے۔

”ابھی ہی چلتے ہیں ناں کینٹین.....“ میں نے  
پھر بلند و بالا سرگوشی کی۔  
”کینٹین چار بجے کھلے گی.....“ روما کے  
بجائے اس کے پیچھے لڑائی لڑکی کی طرف سے جواب  
موصول ہوا اور روما کی تو گلتا تھا جیسے گردن ٹوٹ کے  
میرے قدموں میں گر جائے گی.....

”ادھر سے آج کڑھی ہے نا.....“ اب کے میرے سامنے کھڑی لڑکی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔  
”اور کڑھی ہم میں سے کوئی بھی من نہیں کرتا۔“ پھر دوستانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ معلومات میں مزید اضافہ کیا گیا۔

لاسن میں لگ کے کھانا لینے اور ٹیبل پر بیٹھنے تک..... میری کچھ نہیں تو دس بارہ لڑکیوں سے ضرور دوستی ہو چکی تھی اور کڑھی کے نام پر دوڑ پکڑے پتلے پہلے شور بہ نایب محلول میں عوط زار میری آرزوؤں اور امیدوں پر پانی پھیر چکے تھے اور جب منہ میں نوالہ ڈالنا تو نہ شکل نہ عقل کے مترادف تھی بابا۔

”یار تمہارے میس والے کوئی ہتھوڑا یا چھڑ  
وغیرہ نہیں دیتے کڑھی کے ساتھ۔“ میں نے سر سر  
سے انداز میں دریا فنت کیا۔

”کیوں کس لیے“..... کئی آوازوں -  
سوال اٹھائے۔



”ہاں.....“ وہ چپل اتار کے بیڈ پر بیٹھتی ہوئی کہنے لگی۔

”فصہ آئے گی نا آج..... میری روم میٹ اس سے میری بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔“ اور اس بات کا تو مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ روم کم دوستیاں پالتی ہے لیکن بھائی تاحیات ہے۔

خیر جناب شام تک فصہ صاحبہ بھی سرگودھا سے ڈائیوڈ کے ذریعے سے اپنے بھاری بھر کم سامان سے لدی پھندی فاطمہ جناح ہاسٹل کی تین منزلہ سڑھیاں چڑھ کے ہانپتی کانپتی، پریشان حال پہنچ چکی تھیں اور اپنے سامان کو ٹھکانے لگانے سے پہلے پھولی سانسوں کے درمیان..... میری بہن سے صرف یہ کہا کہ بلکہ پوچھا۔

”یارزدن سسٹم مشکل تو نہیں ہے۔ آج فرسٹ لیکچر تھا نا..... تم مجھے سمجھا دینا پلیز آج کیا پڑھایا ہے.....“ تو مجھے تو خود اس کے نارمل ہونے پر شک گزرا اور فقط آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں کتابیں ٹھولے سر جوڑے زور سے سسٹم کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش میں کوشاں مجھے کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں۔

اردو انگلش دونوں میں بحث جاری تھی۔ اس سے پہلے کہ میرا دماغی توازن بگڑنا یا میرے دماغ کے خلیے ٹھنڈے غشی میں جانے کا سکتل دیتے ہیں دودھ پتی اور چینی لیے چائے بنانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

میرے بلبلاتے گراہتے دماغ کے خلیوں کو ایک زبردستی چائے ہی پر سکون کر سکتی تھی۔ پر جناب دودھ صرف دو کپوں کا تھا میں نے تین کپ آدھی آدھی چائے کے بنا ڈالے۔

”بھئی کوا اینٹی پرگزراہ کرو فصہ..... کوا اینٹی (معیار) اچھی ہے.....“ میں نے فصہ کو چائے کا کپ کپ تھاتے ہوئے کہا۔ تو دوستا دسی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے بھی اخلاقیات بھائیں.....

”تم بور ہو رہی ہو نا ہماری پڑھائی سے؟“

”ارے نہیں نہیں.....“ (مروت نہ ہوتی تو نجانے کیا ہوتا؟) میری معصوم بہن تو چائے پی کے دوبارہ کتاب کھول چکی تھی..... جبکہ فصہ مجھ سے کہیں لگانے میں مصروف ہوگئی۔

”یار کوئل چائے تو بہت زبردست تھی پر اتنی تھوڑی کہ میرے Neurons (دماغ کے خلیوں) کے صرف پاؤں ہی تر ہو سکے ہیں۔“ اس کی اتنی زبردست مثال پہ میں نے بڑا سا تہنید لگا کے داد دی۔

بس پھر کچھ ہی دیر میں باہمی مشورے کے بعد ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں سامنے والے کمروں کی فرسٹ ایئر کی لڑکیاں جن سے میری آج ہی نیچے میں دوستی ہوئی تھی۔ شامل ہو کر ہاسٹل کی افسانہ نویس صاحب کی کینٹین کی طرف رواں دواں تھا۔

وہاں میری ایک دو اور لڑکیوں سے علیک سلیک ہوئی اور ہم لوگ کینٹین کے آگے بنی سیزھیوں اور پکے فرش پر چوکڑی مارے چائے سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرنے لگے کیونکہ چائے کے نام پر کالاسیال حلق سے اتارنا بھی ایک صبر آزما کام تھا۔

”یار اتنی کالی چائے تم لوگ پیتے ہو؟“ میں نے افسوس ناک حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کینٹین والے لڑکے سے منت کی کہ اس میں تھوڑا سا دودھ اور شامل کر دے تو شاید پینے کے قابل ہو جائے۔

”اسی لیے میں یہاں نہیں آتی..... بہت بری چائے بناتے ہیں یہ لوگ دودھ تو ڈالتے ہی نہیں۔“ میرے کارن ایک نازک اندام حیز کو بھی اپنے جلے کٹے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔

”جب ایک پاؤ دودھ سے درجن بھر کپ بنائیں گے۔ تو ایسے ہی بنیں گے نا۔“ فصہ نے بھی منہ بناتے ہوئے کینٹین والے لڑکے کو اپنا۔ کپ تھمایا۔

”سنو میری چائے میں بھی تھوڑا سا دودھ ڈال دو۔ اتنی کڑوی ہے پی ہی نہیں جا رہی۔“

”ہم کیا کریں.....؟ دوسری ڈاکٹریں آتی ہیں تو کہتی ہیں کڑک بناؤ کڑک..... ہم تو اس لیے پھر کڑک بناتے ہیں۔“ تیرہ چودہ سالہ لڑکے نے اپنا دفاع کیا..... لیکن خیر فصہ کا بھی کپ وہ دودھ ڈالنے کے لیے لے گیا۔

”ویسے ان کو چاہیے کہ ایک گرم دودھ کا تھرماس بھر کے رکھ دیں۔ اس کو دودھ زیادہ ڈالنا ہو وہ ڈال لے۔“ مجھے مسئلے کا کچھ حل سمجھ آیا۔

”وہ جی بہت پہلے ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ میرے ماموں بناتے تھے دودھ کا اور قبوے کا تھرماس بھر کے ٹیبل پر رکھ دیا جاتا تھا..... جو جیسی چائے بنانا چاہتا تھا بنا لیتا تھا یہ بات بہت سال پرانی ہے..... گوئی تیس چالیس سال پرانی جب میرے ماموں ہمیں میری طرح کام کیا کرتے تھے اب تو وہ بھی بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ کینٹین میں کام کرنے والے بچے کے حیرت انگیز انکشاف پر ہم سب کو ہی بہت تعجب ہوا۔

”تو اب ایسا کیوں نہیں کرتے؟“ میں پوچھے بنانہ رہ سکی۔

”جی اب تو زمانہ بدل گیا ہے..... اتنی تو مہنگائی ہے ہمارا تو اپنا پورا نہیں پڑتا۔“ وہ آس پاس سے کپ اٹھاتا زمانے کے سر پر الزام دھرتا چلتا بنا۔

”چل بھی روما..... تو نے تو بہت ہی بھڑے (برے) زمانے میں اس ہاسٹل میں قدم رکھا ہے تو بھی تیس چالیس سال پہلے ہی ڈاکٹر بن جانی تو اچھا تھا۔“ وہ ایسی پکڑے تک جاتے ہوئے میں نے روما اور فصہ کا خوب ریکاؤ لگایا۔ اور اپنی سے لوٹ پوٹ ہوتے تین منزلہ سڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچے تو کمرے کے باہر چوکیدار، بھیا کے آنے کا پیغام لیے کھڑا تھا۔ اور ہم دونوں بہنوں کو معلوم تھا کہ بھیا مجھے لینے آئے ہیں۔ وارث روٹے سے واپڈا ناؤن کا سفر تو لگتا ہے جیسے آپ کسی دوسرے شہر جا رہے ہوں۔

پورے راستے زمانہ بدل گیا ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ مروت والے لحاظ والے ہوتے تھے۔ اسی قسم کی سوچیں سرٹھاتی رہیں زمانہ کیسے بدل جاتا ہے..... زمانہ تو لوگوں سے ہے لوگ اپنے اعمال نہیں سدھارتے اور الزام زمانے کو دیتے ہیں۔

گھر آ کر پیٹ بھر کے قیمہ شملہ مرچ کے بھنے ہوئے سالن کے ساتھ گرم گرم روٹی کھائی..... تو تندرستی ہزار نعمت کے بعد جواب ہزار بلکہ دس ہزار نعمت لگا وہ گھر تھا..... اور باعث رحمت بھی۔

☆☆☆

صبح کا آغاز وہی روٹین کی ہڑبونگ سے ہوا بھابھی کا اٹھو لا ڈالا انہیں عاجز کیے حسب معمول کتنی کا ناچ نچا تھا پھر رہا تھا۔ میں اسی جان کے لیے چائے بنانے کچن میں آئی تو بھابھی تیزی سے میری طرف آئیں۔

”سنو کوئل! حمزہ کے اسکول کے لیے رولز تھل دینا پلیز.....“ اور ہاں وہ جاتے جاتے مڑ کے دوبارہ آئیں۔

”وہ ولی بھی آ گیا ہے اس کی بھی چائے بنا دو ساتھ ہی۔“ اف ولی ہمارے چچا صاحب کے ہونہار صاحب زادے جو UET میں پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو آئن اسٹائن کے جانشین سے کم نہیں سمجھتے اور ٹیکنیکل انجینئرنگ کے آخری سال میں پہنچ کر ویسے بھی ان کا دماغ ساتویں آسمان سے نیچے نہیں اترتا۔ لیکن جہاں بات کھانے کی ہو تو بڑے بڑے ریسٹورنٹ کو بھی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ اور کیونکہ حمزہ کا اسکول ولی کی یونیورسٹی کے راستے میں آتا ہے تو حمزہ کو اسکول چھوڑنے کے لیے جانے ولی صاحب اپنے گھر کے بجائے اپنے برابر والے گھر یعنی ہمارے گھر میں کھانا، پینا، ٹھونسا، اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہوئے ہر روز علی الصبح ہمارے گھر آدھکتے ہیں۔

”میں تو سمجھ رہا تھا یہ پرسکون فضا کچھ دن اور رہے گی۔ ہن تو واپسی ہوگئی مہاری۔“

ایک تو۔ امریکن اسٹائل کے اوپن کچن میں



یہ بڑا مسئلہ ہے کہ نہ تو آپ سبک میں پڑے گندے برتن چھپا سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ کو ہمارے گھر میں تو عین سامنے برآمدے میں آتے ہی نظر آ جاتا ہے کہ کچن میں کون ہے اور کیا کر رہا ہے میں اس کی بکواس سنی سن سنی کرتے ہوئے چائے کا پانی چڑھا کے پراٹھا بنانے کے لیے کینٹ کھول کر کھنی کا ڈبر اور بیلن وغیرہ نکالنے لگی۔

”بھی تمہاری چھٹیاں تھیں ایک دو ہفتہ اور رک جاتیں روما کے پاس ہاسٹل میں تم سے بھی نا، لوگوں کا سکون برداشت نہیں ہوتا۔“ اس نے تپانے کی ایک اور کوشش کی۔ اس کی بکواس پر کان نہ دھرتے ہوئے میں نے توا چو لے پر رکھا اور پراٹھا پیلے لگ گئی۔

”ارے میں ناشتہ کر کے آیا ہوں پراٹھا مت بناؤ۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”یہ میں اپنے لیے بنا رہی ہوں۔“ مختصر سا جواب سنجیدگی سے دیتے ہوئے میں نے پراٹھے پر لگا لگایا۔

”یہ تم اتنے گھی والے پراٹھے کھاتی ہو تب بھی سوکھی سڑی کیسے ہو بھی۔“ اس کی زبان کو پھر جھکی ہوئی۔ ”میں تو ذرا بے احتیاطی کر لوں تو وزن بڑھ جاتا ہے۔“

میں نے گھی لگانے کے بعد بیڑا پلیٹ کے رکھا اور ایلٹے ہوئے پانی میں جی ڈالی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ کھولتے ہوئے پانی میں اسے بھی جھونک دوں۔

”سب سے پہلی بات تو یہ میں سوکھی ہرگز نہیں ہوں۔ تم مونٹے ہو اور ہر ایک کو اپنے نکتہ نظر سے دیکھتے ہوئے تمہیں اپنے مقابلے میں ہر دوسرا بندہ سوکھا نظر آتا ہے۔“ تو نے کے نیچے آج تیز کرتے میں نے اسے بھی سلا دیا۔

”اور دوسرا یہ کہ میں اتنے نہیں صرف ایک پراٹھا کھاتی ہوں۔ تمہاری طرح نہیں کہ کھانے بیٹھوں تو دنیا مافیہا سے بے خبر بس ٹھونسنے ہی چلے

جاؤ۔“

اطمینان سے اسے جلا کر راکھ کرنے کے بعد میں نے ڈسٹیکل رولر کڑا ہی پھوڑے اور پراٹھا پیلے لگ گئی۔

”بد زبانی، بد لطافتی اور بد تہذیبی کا مقابلہ ہوتا تم اول آؤ کوئل۔“ تانی امی ٹھیک پریشان ہو رہی تھیں تمہارے لیے۔ میں نے سوچا پتا نہیں تمہیں کئی نے بتایا ہے کہ نہیں اور سنا ہے کہ ایسے موقعوں پر ڈھٹ سے ڈھٹ لڑکیاں بھی شرما جاتی ہیں تو چلو ہم بھی ایسی انہونی کو پانی آنکھوں سے دیکھ کر تصدیق کر لیں۔ کل تمہاری غیر موجودگی میں بڑے بڑے فیصلے کیے گئے۔“ وہ میرا جائزہ لینے کو رکا۔

”مثلاً کیا۔“ سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے میں نے رولر کو الٹ پلٹ کیا۔

”بھئی دیکھو نا اپنے ہی اپنوں کے عیب ڈھانتے ہیں۔“ اس کی تمہید بھی ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

”کون سے عیب۔۔۔۔۔؟“ مجھے الجھن ہوئی۔

”بھئی دیکھو نا۔ روما کا تو میڈیکل کالج میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ ڈاکٹر بھی بن ہی جائے گی اب تمہارا اتحاد مارا ہوتا تو۔۔۔۔۔“ وہ اپنے گھٹیا پن کی طرف آیا۔

”تو کسی اچھی یونیورسٹی میں تمہارا بھی داخلہ ہو جاتا۔۔۔۔۔ تمہارے لیے تو یہ ہی بہتر ہے کہ جس طرح بلکے پھلکے آرٹس کے مضامین پڑھ رہی ہو۔ بی اے ہی کر لو تو بڑی بات ہے۔ بھئی دیکھو نا ابھی تھرڈ ایئر کے امتحان دے رہی ہیں اگلے سال تک بی اے مکمل ہوگا۔“ آگے بک۔۔۔۔۔ ضبط کرتے ہوئے میں نے تو نے پر پراٹھے کو چھتے سے پلٹا۔ دل تو چاہ رہا تھا تو نے کی ساری کا لک اتار کے اس جاہل کا منہ کالا کر دوں۔

”تو بس پھر کل سب۔۔۔۔۔ اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے اب اتنی تانی امی سب ہی کہہ رہے تھے کہ خاندان میں یا خاندان سے باہر صرف بی اے اور

ادبیاتی شکل کے ساتھ کون اپنا نئے گا کوئل کو۔۔۔۔۔ حالانکہ کہاں ولی، میکینیکل انجینئر۔۔۔۔۔ کوئی جوڑ تو نہیں بنا لیکن اپنے ہی اپنوں کے عیب ڈھانتے ہیں۔“ ”اے اے۔۔۔۔۔“ میں نے گرم چٹا عین اس کے منہ کے سامنے کیا تو وہ بدک کے پیچھے ہٹا۔

”منہ دھو رکھو۔“ تمللاتے ہوئے میں بولی نہیں بھڑکی تھی۔

”لو تم منہ دھونے کی بات کر رہی ہو۔“ وہ ڈھٹ بڑی خواہش سے ہنسا۔ ”میں تو نہادھو کے پیل لگا کے پریسوم چھڑک کے آیا ہوں۔“

”افسوس پھر بھی پھٹکی کے پھٹکی نظر آرہے ہو۔“ ”تم افسوس کو چھوڑو تم صرف پھٹکن بننے کی

ناری کرو۔ افسوس کے لیے اور بہت سی باتیں ہیں۔۔۔۔۔ دیا ہے کہ طور پر ہماری کام والی ماسی ایک

مہینے کی چھٹی پر گئی ہے اور تانی امی کے حکم کے مطابق اس نے رشتے کے پیش نظر میرے پڑے تم ہی

دھوکے استری کیا کر دی۔ ہمارے گھر کے دیگر کاموں کے علاوہ۔۔۔۔۔ شام کو جب گندے کپڑے

لے کر آؤں گا تو افسوس کرنے کی پوری کتاب لاؤں گا۔ تمہارے افسوس ناک مطالعے کے لیے۔“ وہ

ڈھٹائی سے کہتا ہوا پچن سے نکل کر برآمدے میں جا کر امی کے پاس شرافت سے بیٹھ گیا۔

اتنی دیر میں بھابھی بھی ہولاتی ہوئی وارد ہوئیں۔ ”تل دیٹے رولر؟“ لچ باکس دیکھا حزرہ

کا؟“ پھر دونوں رولر پلیٹ میں لے جا کر حزرہ کو دکھاتے ہوئے بولیں۔ ”یہ دیکھو حزرہ دو رولر ہیں اور

دونوں تم نے کھانے ہیں۔ بریک میں خبردار جو کسی کو دیتے۔ ممی علی کو میرے رولر بہت اچھے لگتے ہیں ایک تو

وہ ضرور کھائے گا۔“ حزرہ بے چارگی سے کہہ رہا تھا۔ ”اس کی ممی اس کو روز بکٹ دیتی ہیں۔ وہ

کہتا ہے کہ اس کو بکٹ نہیں اچھے لگتے۔“ ”ہاں تو اس کی ممی بنا کر دیں نا اسے رولر تم

کیوں دیتے ہو۔“ بھابھی کو غصہ آیا۔ ”وہ مانگتا جو ہے اور پانی بھی میری ہی بوتل

سے مانگ مانگ کے پیتا ہے۔ اس کی بوتل گم ہو گئی ہے ناں اس کی ممی کے پاس ٹائم نہیں ہے۔ نیو بوتل لینے کا۔۔۔۔۔ حزرہ معصومیت سے صفائیاں دے رہا تھا۔

”ہاں اس کی ممی کے پاس ٹائم نہیں ہے اور تم اپنا پانی ختم کر دو اسے پلا پلا کے۔۔۔۔۔ کوئی ضرورت

نہیں ہے۔ صاف منہ کر دینا۔۔۔۔۔ کہنا کہ تمہارا گلا خراب ہے۔“ بھابھی کے جھوٹ بر میری اور ولی کی

مسکراہٹ ایک ساتھ ابھری۔ ولی تو خیر دبا گیا۔ اور میں حزرہ کا لچ باکس ڈھونڈنے کے سفر پر نکل گئی۔

”یہ دیکھیں بھابھی! بیک میں تھا اس باگل کا لچ باکس اور دیکھیں اتنے سارے چپس بجا کر لایا

ہے۔“ میں نے لچ باکس کھول کر بھابھی کو دکھایا۔ ”کیوں نہیں کھائے تم نے چپس۔۔۔۔۔ کل ہی

نکال دیتے تو میں ماسی کو پی دے دیتی۔ اب تو شائد خراب ہو گئے ہوں۔“ سوچتی ہوئی کہنے لگیں۔

”پھر بھی کوئل پلیٹ میں نکال دو ماسی آنے والی ہے۔ شائد کھالے۔“

”بھابھی میرا خیال ہے ان کو دینے سے بہتر ہے کہ آپ ایک آلو ماسی کو دے دیجیے گا کہ وہ گھر

جا کے اس کے چپس بنا کر کھالے۔“ میں نے اپنے حساب سے بہتر تجویز پیش کی۔

”تم رہنے ہی دو۔۔۔۔۔ وہ آلو اکیلا نہیں لے گی۔ کہے گی باجی تیل بھی دیں تنے کے لیے۔“ بھابھی

نے خود ہی چپس پلیٹ میں نکال کے دوسری پلیٹ سے ڈھکے تو امی نے بھی دیکھا۔

”دینا! امی وہیں سے بھابھی کو کہنے لگیں۔“ ”چھٹک دو یہ چپس۔۔۔۔۔ پتا نہیں ہے خراب چیز

دینے پر وہ کتنی باتیں بناتی ہے کل بھی تم نے اسے کھانے کے لیے باسی روٹی دے دی تھی۔ وہ تو میں

نے دیکھ لیا تو اس سے کہا اپنے لیے تازہ روٹی بنا لے۔ ارے بھی کھا تو وہ کھاتی ہے یہاں۔“

امی کہہ کے دوبارہ اپنی لچ پکڑ چکی تھیں۔ ولی اور امی برآمدے میں ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے چائے پی

رہے تھے میں اور بھابھی کچن میں تھے۔



”ہاں تو پھر آپ آکر دیکھتے ہیں۔ اس نے کون سا سوکھی روٹی بنائی پھر۔ اتنا سارا کھانا اس پر اسی لیے میں نہیں چاہ رہی تھی کہ اپنی روٹی خود بنائے یہاں۔۔۔۔۔ جب بھی اپنی روٹی بناتی ہے اس پر اتنا سارا کھانا تیل ضرور لگاتی ہے۔“ بھابھی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

”ارے تو کیا ہو گیا ہمارا کون سا ایک دو چچے گھی سے بہت بڑا نقصان ہو گیا اور کیا پتا بے چاری کو وہ کھانسی والی روٹی کتنی پسند ہو۔ اپنے گھر میں تو یہ لوگ روکھی سوکھی ہی کھاتے ہیں نہ اچھا کھانا نہ اچھا پہننا۔۔۔۔۔ اور چار پیسوں کے لیے مارے مارے پھرنا۔ چلو ہم کچھ اور نہیں کر سکتے ان کے لیے ایک وقت کا اچھا کھانا ہی کھلا دیں۔۔۔۔۔ اور جو یہ ہم اب چسپ پیچکنو کی ان کو تنے میں تیل نہیں لگا گیا۔ اوپر سے تم بچے کو بھی یہ ہی تربیت دے رہی ہو کہ کسی کو نہ کھلائے بے مروتی تو خود سکھار ہی ہوا تنے سے بچے کو۔۔۔۔۔“ امی بھی جب شروع ہو جائیں تو چپ ہونے کا نام نہیں لیتیں۔۔۔۔۔ بھابھی ظاہر ہے کہاں تک برداشت کرتیں وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کے میدان جنگ چھوڑ گئیں۔

اور ولی تو جھڑپ کے زور پکڑتے ہی پتلی گلی سے نکل کے ٹی وی لاؤنج میں پناہ گزین شام کوئی نو بج چیل آن کر چکا تھا۔

”ویسے امی آپ کو بھابھی کو ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔“ امی قرآن پاک شروع کرنے ہی والی تھیں کہ میں ہمت جمع کرتے ہوئے ان کے برابر تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”لو تو کیا میں نے غلط کہا۔ ارے اپنے لیے تو بھی خیال کر کے خرچ نہیں کرتی بس دوسروں کو دیتے ہوئے ہی جان جاتی ہے اس کی ابھی بازار جائے گی مجھے سے مہنگا سوٹ اٹھا کر لے آئے گی۔ اپنے لیے۔“ اسی سابقہ موقف پر ڈٹی قرآن پاک کا غلاف کھولنے لگیں۔

”لیکن امی آپ کو کبھی یوں سب کے سامنے مہناز بھابھی کو نہیں ٹوکنا چاہیے تھا۔ اس طرح انسان

بجائے سدھرنے کے مزید اکڑ جاتا ہے اور ویسے بھی کل ہم نے سورۃ حم جحدہ میں نہیں پڑھا تھا کہ سخت کلامی کا بھی بہت اچھے طریقے سے جواب دینا چاہیے۔“ پچھلا مہینہ رمضان کا گزرا تھا اور رمضان کے مہینے سے ہم نے یعنی میں، بھابھی اور امی نے قرآن پاک ترجمہ سے پڑھنا شروع کیا اور میری تو پچھلیاں تھیں تو ابھی تک ہمارا یہ ہی معمول تھا کہ گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر بھلے سے پانچ آیات ہی کیوں نا پڑھیں پڑھتے ترجمہ کے ساتھ تھے اور امی کے ہاتھوں میں جو قرآن تھا اس میں کل کا نشان بھی لگا ہوا تھا۔

”یہ دیکھیں۔“ میں نے نشان پر انگلی رکھ کے کھولا۔ سورۃ حم جحدہ آیت نمبر 33۔

”نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں تو سخت کلامی کا ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو ایسا کرنے سے تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن ہے تمہارا گرم جوش دوست بن گیا ہے۔“

سورۃ حم جحدہ آیت نمبر 34 اور یہ بات ان ہی کو حاصل ہوئی ہے جو بہت برداشت کرنے والے بہت نصیب والے ہوتے ہیں۔“ القرآن ”بھئی میں تو اسے عقل دے رہی تھی۔ قرآن پاک کے حوالے پر امی کا لہجہ نرم پڑ چکا تھا۔

”مگر اس طرح ڈانٹ کر کہنے سے تو بات کا اثر ضائع ہو جاتا ہے نا۔۔۔۔۔ اب بھابھی باہر آئیں تو آپ ذرا اچھے طریقے سے بات کر لیجے گا پکیزہ۔“ رہان سے کہتے کہتے میرا لہجہ التجا بن گیا۔

”میں دیکھو درازمہ تیار ہوا کہ نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھ کے برآمدے سے ہوتے ہوئے ٹی وی لاؤنج سے گزر کے بھابھی کے کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹانے ہی والی تھی کہ ولی صوفے سے اٹھ کر میرے سامنے آ گیا۔

”میں سوچ رہا تھا یقیناً مجھ میں ہی ایسی جو ہر شئ اس صفات ہوں گی۔“

”ولی پلیز ایسی امی ملتی باتوں کو سننے کا میرا

موڈ نہیں ہے۔“ تیزی سے کہتے ہوئے میں نے اسے مزید کچھ بھی کہنے سے روکا۔

”بھئی دیکھو نا۔۔۔۔۔ ہیرے کو جو ہری ہی پرکھ سکتے ہیں۔“ وہ بھی بھلا کہاں چپ رہنے والا تھا۔

”تم میں کچھ تو بات ہے جب ہی تو میرا دل تمہاری طرف کھینچتا ہے۔“ اسی لمحے دروازہ کھلا۔

”چلو ولی جلدی۔۔۔۔۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ غلت بھرے انداز میں بھابھی نے حمزہ کا بیگ ولی کو پکڑایا اور دوسرے ہی لمحے وہ دونوں بھاگتے دوڑتے گھر سے نکل رہے تھے۔

میں اپنی اور بھابھی کی چائے اور اپنا خستہ پراٹھلے کر لاؤنج میں آ گئی۔ بھابھی صبح صرف چائے پیتی تھیں۔ بعد میں بھیا کے اٹھنے کے بعد دونوں، ساتھ ناشتہ کرتے تھے۔

امی صحن میں تخت پر بیٹھی اپنے صبح کے وظائف شروع کر چکی تھیں۔

”ویسے امی بھی نا۔۔۔۔۔ غصہ میں پتا نہیں کیا کچھ کہہ دیتی ہیں اور بعد میں شرمندہ ہوتی رہتی ہیں۔“ میں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

”تم بتاؤ کوئل ایسا میں نے کیا غلط کہا تھا جو انہوں نے اتنی سنا ڈالیں؟“ ناراض ناراض سے لہجے میں غصہ کی بھی جھلک تھی۔

”بی بی تو۔“ میں نے ان کی آنکھوں میں چمکتے ننھے ننھے قطروں کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا۔ ”اور بعد میں افسوس کر رہی تھیں کہ میں نے ناحق کو اتنی سنائیں۔ یہ نہ کہہ سکی کہ بی بی اللہ پر بھروسہ کرو اللہ اور دے گا انہا سے ناراض کر دیا۔“

”تم یقین کر کوئل!“ بھابھی کو بھی شام کو ذرا ڈھارس ہوئی۔

”میرا بھی دل چاہتا ہے کہ غریبوں کی مدد کروں پر اس بڑھتی ہوئی مہنگائی سے خوف آتا ہے اوپر سے امی کی ذریا ولی ہے کہ قہقہے میں ہی نہیں آتی۔ تمہیں یاد ہے جب رومہ کا رزلٹ آیا کہ اس طرح امی نے مایوسیوں کو اٹھا اٹھا کر سوٹ دیے۔ میں کہتی رہ

گئی کہ پہلے میڈیکل میں داخلہ تو ہو لینے دیں۔ یہ نہیں جب داخلہ ہوا تب دوبارہ انہیں نوازا گیا۔ کوئی کچھ سات ہزار تو صدقہ خیرات کی نذر ہو گئے اور ابھی تو۔ آج دودھ والے کو بھی امی نے اور پیسے دے کا کہا ہوا ہے۔ میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ ہمیں کل کی بھی تو فکر کرنی چاہیے حمزہ کی تو ابھی سے اتنی فیس ہے۔ پھر انسان اپنا بھی تو کچھ جوڑتا ہے۔ بھابھی نے جیسے اپنا ہی کچھ ہلکا کیا۔

”اصل میں بھابھی امی کی بھی اپنی ہی سوچ ہے۔“ مجھے خود سمجھ نہیں آیا کہ کیا بات کروں بھابھی کی دلجوئی کروں کہ انہیں قائل کروں۔

”اب جیسے امی کتنا کہتی رہتی ہیں نا کہ صدقہ خیرات سے آزمائشیں اور مصیبتیں مل جاتی ہیں۔۔۔۔۔

اب دیکھیں ماشاء اللہ سے ہماری رومہ کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو گیا۔ آپ کو پتا ہے اس کی دونوں فرینڈز حالانکہ کتنا اچھا پڑھتی تھیں ان دونوں کا پرائیویٹ میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے۔

پرائیویٹ کالجوں کی تو فیس لاکھوں میں ہے۔ بس اللہ نے اپنا کرم کیا اور ہمیں اس مشکل سے بچایا۔ اصل میں انسان جتنا بھی روک کے خرچ کر لے جہاں اللہ تعالیٰ نے پیسے خرچ کروانے ہوتے ہیں وہاں لگ ہی جاتے ہیں۔ امی بس یہ ہی کہنا چاہتی تھیں کہ ضرورت مندوں کو دوتا کہ اللہ ہمیں کسی چیز کا محتاج نہ کرے۔ لیکن بس غصہ میں الٹا سیدھا بولنے لگ گئیں۔ اور بعد میں شرمندہ ہوتی رہیں۔“

”نہیں خیر اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔“ بھابھی نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔

”تمہیں بھی تو میرے سامنے کتنا ڈانٹنی رہتی ہیں۔“ شکر کہ لہجے میں کچھ اپنائیت کچھ بردباری کی جھلک نظر آئی۔ تو میں نے بھی اپنا پراٹھا چائے میں ڈبو دیا۔

”ویسے بھابھی کتنے پیسے دے رہی ہیں دودھ والے کو؟“ نوالے کے اوپر میں نے گرم چائے کا گھونٹ بھرا۔ ہمارے دودھ والے کے جوان بیٹے کا



کچھ دن پہلے ہی فیکٹری میں کام کرتے ہوئے مشین میں آکے ہاتھ کٹ گیا تھا۔ اس نے جب ای کو اپنی دکھ بھری کہانی سنائی اسی نے تو اسی وقت پیسوں سے اس کی مدد کی اور اسی سلسلے میں آج بھی اور پیسے دینے لگے۔

”دیکھو جتنے ہو سکے۔ ویسے کوئل جب سے یہ بغیر پانی ملا دودھ دینے لگا ہے۔ چاہے کتنی اچھی بنتی ہے نا۔“ بھابھی نے میری توجہ چاہنے کی طرف دلائی۔

”یہ تو ہے۔۔۔۔۔ آپ کو پتا ہے میں نے اتنا تھوڑا سا دودھ ڈالا تھا پھر بھی کتنے مزے کی چائے بنی ہے۔ چلو اس واقعہ سے اس کا ایمان اور اللہ پر بھروسہ تو مضبوط ہوا۔“ میں نے چائے کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”لو تم کیا سمجھتی ہو۔۔۔۔۔ وہ سب لوگوں کو یہ خالص دودھ دے رہا ہے۔ پاگل ہم تو اس کے بیٹے کے علاج کے لیے پیسے دے رہے ہیں۔ اس لیے وہ ہمیں خالص دودھ دینے لگا ہے وہ بھی صرف چاروں سے، باقی پورے محل کو تو دیتی۔ پانی والا ہی دودھ ملتا ہے۔“ بھابھی نے جیسے میرے خیالات کا مذاق اڑایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ سچ بتائیں۔“ مجھے یقین نہ آیا۔  
”تو اور کیا۔۔۔۔۔ ہمارا دودھ تو وہ الگ ایک چھوٹے سے ڈبے میں کسی سوغات کی طرح لے کر آتا ہے۔ سچ اتنا خالص اتنا گاڑھا دودھ۔ ہمیں پتا ہے پہلے تو دو کلو بھی پورا نہیں پڑتا تھا۔ میں تو سوچ رہی ہوں اگر یہ اسی طرح خالص دودھ دیتا رہے تو ہمارے لیے تو ایک کلو ہی کافی ہوگا۔“ بھابھی کے دماغ کے بنوس ناگ کو کچن مارتے اگر ہماری ای جان دیکھ لیتیں تو اپنے پاؤں سے چل کے اس کا قلع قمع کر دیتیں خیر شک تو میں بھی گئی تھی۔

”اور پتا ہے۔“ بھابھی اسی جوش سے شروع ہوئیں رات کو باٹنے وقت میں اس میں دو گلاس پانی کے بھی ڈال چکی ہوں اب سوچو! میں کیا سوچتی۔

میں تو مینا بھابھی کے دل و دماغ میں کنجوسی کا فغانیں مارتا سمندر دیکھ رہی تھی۔ سچ کہہ رہی ہوں ایک کلو بہت ہے ہمارے لیے۔۔۔۔۔ پورے تین ہزار سات سو کی بچت ہے۔“

”خیر رہنے ہی دیں ہمیں بھی کچھ دن خالص دودھ انجوائے کرنا چاہیے۔“ میں نے لہروں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔  
یا اللہ یہ اپنے نادر خیالات کا اظہار اپنی ساس کے سامنے کر کے مزید ڈانٹ سننے کا سبب نہ بنیں میں نے تہہ دل سے دعا کی۔

☆☆☆

گیٹ پر ہونے والی ٹیل اس بات کی علامت تھی کہ دودھ والے چچامیاں تشریف لائیں ہیں اور اس تصدیق کے بعد کہ پورے محلے میں ایک واحد ہمارا ہی وہ خوش نصیب گھر اند ہے جو اللہ کی اس نعمت سے اپنی اصلی شکل میں بہرہ مند ہو رہا ہے وہ بھی فقط چاروں سے تو مجھے تو بہت ہی تاؤ آیا۔

”وہ جی پورا نہیں پڑتا۔ پانی نہیں ملاؤں گا تو کھاؤں گا کہاں سے اب تو جی بیٹے کا بھی علاج کروانا ہے۔ اس کے بھی دو بچے ہیں ان کو بھی جی اب میں نے ہی پالنا ہے۔“ امی کے تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھے چچامیاں صفائیاں دے رہے تھے۔  
”آپ کے خیال میں اس ملاوٹ سے آپ کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“ میں نے ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔

”نہیں جی یہ میں نے کب کہا ہے۔ ہر انسان اپنی تو کوشش کرتا ہے نا۔“ چچامیاں نے مجھے لاجواب کر دیا۔

”یہ تو آپ غلط کوشش کر رہے ہیں کیا آپ کو اللہ پر بھروسہ نہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”اللہ پتو ہے چھوٹی باجی۔ پر اس کے بندوں پر نہیں۔“ انہوں نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک مڑی تری پرچی میرے سامنے کی۔ ”یہ چھ ہزار کی دوئیاں لکھی ہیں ڈاکٹر نے۔ اوپر سے میں

ہزار آرپیشن کا خرچہ۔ غریب آدمی بھلا کہاں سے دے، ہمیں بھی اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ پر اللہ جانتا ہے دودھ میں پانی نہیں ملاؤں گا تو اتنی مہنگائی میں دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہے۔“ چچامیاں بے چارگی سے بولے۔

”یہ مہنگائی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی آپ اللہ پر بھروسہ تو کریں، ہمت تو کریں جو اللہ نے حکم دیا ہے۔ وہ تو پورا کریں اللہ میاں آپ کا ضرور ساتھ دیں گے۔“ میں نے انہیں قائل کرنے کی اپنی پوری کوشش کی۔

”وہ جی بیٹا آپ کی بات ٹھیک ہے پر نہیں ہوتا گزارا تب ہی تو درد کے شوق ہے دودھ میں پانی ملانے کا۔“

”پھر تو اس کا مطلب ہے آپ کو اللہ پر بھروسہ ہی نہیں ہے۔“ تیزی سے بولی مان کر ہی نہیں دے رہے تھے چچامیاں۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں چھوٹی بی بی! وہ بے چارگی سے میرے پیچھے تخت پر بیٹھی امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

”اللہ پر تو سب ہی کو بھروسہ ہے۔“  
”نہیں جب آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں کی بات مان کر آپ کا گزارا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ اس لیے آپ دودھ میں ملاوٹ کرتے ہیں۔ اپنے دل کی مانتے ہیں شیطان کی مانتے ہیں۔ تو آپ کو بھی مان لینا چاہیے کہ آپ کو اپنے رب پر بھروسہ نہیں۔“ میں شاید پہلے وہی سے صبح ہی صبح مغز ماری کے بعد پھر امی اور بھابھی کو بالترتیب سمجھانے اور بھجانے کے بعد چچامیاں سے سر پھوڑ رہی تھی تو آواز جذبات میں کچھ زیادہ ہی اونچی ہو گئی۔

”اے لڑکی تمیز سے بات کر۔ بڑے ہیں تم سے ابھی صبح مجھے کیسے من من کر کے سمجھا رہی تھی۔ امی آپ بھی مجھ کو ایسے نہ کہا کریں۔ بری بات ہے۔ نرمی سے بات کیا کریں۔ اب خود اتنی بدتمیزی کر رہی ہے۔“ امی نے تو جو کہا سوا کہا سامنے مینا بھابھی کے

چہرے کے بدلنے رنگ پھر ان کی وہی دلی دلی مسکراہٹ میرا تو شرمندگی سے برا حال۔ ایک تو بڑے میاں کس سے کس ہونے کا نام نہ لیں اور ایک میں جیسے پورے زمانے کو سدھارنے کا ٹھیکہ مجھے ہی ملا ہو۔

”تم اٹھو جاؤ اپنا ناشتہ ختم کرو۔“ میں جو دودھ والے انکل کے آتے ہی جذبات میں آکر اپنا ناشتہ سچ میں چھوڑ آئی تھی۔ بھابھی نے مجھے اٹھایا اور خود میری جگہ تخت کا کونا سنبھال لیا۔

”آپ کب سے دودھ میں پانی ملا رہے ہیں۔“ مجھے پراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہی ہنسی آگئی لگ رہا تھا جیسے بھابھی کسی ٹاک شو میں انٹرویو کر رہی ہوں۔

”ہمیشہ سے جی پتا نہیں کتنے سال ہو گئے۔“ چچامیاں کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ رسی تڑوا کے بھاگ جائیں۔

”اچھا یہ بتائیں اگر آپ کے پاس ہتھسارا روپیہ پیسہ ہوتا تو آپ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے؟“ ”بالکل کرتے جی۔ کیوں نہیں کرتے ضرور کرتے۔“ چچامیاں بھی سوچ رہے تھے کہ آج کہاں بچھن گیا اور ایک امی ہمیں جو پیسے تھا کے اب دنیا سے بے خبر خرچ کرائے جاری ہیں۔ ان کا کام تھا مدد کرنا جو وہ کر چکی تھیں۔ اب چچامیاں جانیں ان کا کام۔

اردو محاکمات کی طرف سے جہن کے لیے عربی سرت ذیل



**فصل غم کا گوشوارہ**  
**رضیہ جمیل**

تقریباً 300 روپے

مکتبہ عمران ڈاکٹ: 37 - اردو بازار، کراچی - فون نمبر: 32735021





لنگاہیں در پہ لگی ہیں، اُداس بیٹھے ہیں  
کسی کے آنے کی، ہم لے کے آس بیٹھے ہیں

نظر اٹھالے کوئی ہم کو دیکھتا ہی نہیں  
اگرچہ بزم میں سب روشناس بیٹھے ہیں

الہی کیا میری رخصت کا وقت آ پہنچا  
یہ چارہ ساز میرے، کیوں اُداس بیٹھے ہیں

الہی کیوں تن مردہ میں جان نہیں آتی؟  
وہ بے نقاب ہیں، ثربت کے ساتھ بیٹھے ہیں

صوفی تبسم

میرے دل کو درد سے بھر گیا

مجھے بے یقین سا کر گیا

میری بات بیچ میں رہ گئی

تیرے شہر میں میرے ہم سفر

وہ دکھوں کا جم غفیر تھا

مجھے راستہ نہیں مل سکا

میری بات بیچ میں رہ گئی

امجد اسلام امجد

”اچھا آپ یہ ہی سمجھ لیں کہ آپ خالص دودھ بیچ کر اللہ کے بندوں کی مدد کر رہے ہیں۔ انسان تو صرف کوشش کر سکتا ہے۔ اس کی کمائی کتنی بڑھے گی کسی طرح خرچ ہوگی سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ چاہے تو بڑھا دے اپنی برکت سے اور چاہے تو اتنے خرچے نکال دے کہ کمائی کم پڑ جائے۔ ہم سب کو اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہوئے صرف اسی کا کہنا ماننا چاہیے۔ چاہے حالات کچھ بھی ہوں۔ خود سوچیں اپنے رب کا ناراض کر کے کوئی کام اچھا ہو سکتا ہے۔ نہیں نا؟“

بڑے میال تو بڑے میال پیچھے بیٹھی امی جان بھی تسلیج روک کے بڑی توجہ سے بھابھی کی باتوں کو سن رہی تھیں۔

”تسلیج اچھی طرح دینا دودھ والے کو سمجھایا کتنے پیار سے ایک یہ لڑکی ہے لڑنے کو دوڑتی ہے غصہ تو ناک پر دھرا رہتا ہے اس کا۔“ موجوں کا رخ بدل چکا تھا۔

چچا میال کے جانے کے بعد ان کلمات میں امی جان نے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا۔

خیر میں خوش تھی۔ چچا میال قائل ہوئے کہ نہیں۔ لیکن ان کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ جیسے انسان کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہو جائے اور اول مرحلہ تو احساس کا، آگاہی کا ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی غلطی کو ماننے، تسلیم کرنے کے بعد ہی اصلاح کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

امی کو ناشتہ دینے کے بعد میں بھابھی کو ڈھونڈتی ٹیرس پر آگئی۔

”بھیا کو نہیں اٹھانا کیا جو اوپر آگئی ہیں؟“

”ہاں اٹھانی ہوں۔۔۔۔۔ وہ آج دیر سے جائیں گے۔“ وہ تار پر شنگے پکڑوں کو اتارتی ہوئی بولیں۔

”بادل آئے تو میں نے سوچا کہ کہیں بارش نہ ہو جائے۔ اسی لیے پکڑے اتارنے آگئی۔“

”ویسے کوئل۔۔۔۔۔ دلی بچ کہہ رہا تھا۔“

”کیا۔۔۔۔۔ میں بھی پکڑے اتار اتار کر قرب



”تو اس میں اتنا ناراض ہونے والی کیا بات تھی؟ ان کا رشتہ تو تمہارے لیے بہت معقول اور مناسب تھا۔“ مریم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔  
”میں کب کہہ رہی ہوں کہ ان کا رشتہ میرے لیے برا تھا۔ ناراضگی کی وجہ یہ بھی کہ وہ پچھلی رات بھی مجھ سے شادی کی درخواست کر چکے تھے۔ اور میں حامی بھر چکی تھی۔“ نازیہ نے بتایا۔  
(گلشن اقبال..... لاہور)

### غلط فہمی

بیوی شوہر سے۔ ”تم رات کو سوتے میں مجھے گالیاں دے رہے تھے۔“  
شوہر۔ ”تمہاری غلط فہمی ہے۔“  
”بیوی۔“ کیا غلط فہمی ہے۔“  
شوہر۔ ”یہی کہ میں سو رہا تھا۔“  
(عائشہ بدثر..... لاہور)

### ایسوی لینس

خاتون نے ایمر جنسی نمبر پر ایسوی لینس سینٹر فون کیا۔  
آپریشن نے مستعدی سے کہا ”لیس..... پلیز۔“  
”میرے پاؤں کی انگلی چائے کی میز سے گرا گئی ہے۔“ خاتون نے کراہتے ہوئے کہا۔  
آپریشن نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”اور اس کے لیے آپ ایسوی لینس منگوانا چاہتی ہیں؟“  
”نہیں..... ایسوی لینس تو میں اپنے شوہر کے لیے منگوا رہی ہوں..... اب دیکھو، انہیں منسا تو نہیں چاہیے تھا۔“ خاتون نے بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

### آپ اپنے دام میں

ایک دیہاتی مسافر ایک ریلوے پلیٹ فارم پر بیٹھا رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔  
”میری بیوی کو میرے ساتھ کا مسافر بھگا کر لے گیا، میں برباد ہو گیا۔“  
اس کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ایک نوجوان نے ازراہ ہمدردی اس دیہاتی مسافر کو شور دیا۔  
”دوست! اس طرح تو تمہاری بیوی کا ملنا بہت مشکل ہے، بہتر ہے کہ تم اس واقعے کی رپورٹ پولیس اسٹیشن میں درج کروادو۔“  
دیہاتی روتے روتے چپ ہو گیا اور سنجیدگی سے بولا۔  
”میں یہی تو نہیں کر سکتا بھائی! کیونکہ میں خود دوسرے کی بیوی بھگا کر لایا تھا۔“  
(آمنہ بی بی..... حیدر آباد)

### بھولا بابا

بابا بے شک بھولا بھالا سادا ہے  
چاند سے چہروں کا اب بھی دلدادہ ہے  
سننے سمجھنے اس کے کمر ہی چلتے ہیں  
شادی کرنے پر اب بھی آمادہ ہے  
(عزیزین اعوان..... کراچی)

### برہمی

مریم نے نازیہ سے پوچھا۔  
”کل تم عارف صاحب پر اتنی ناراض کیوں ہو رہی تھیں اور انہیں اتنا برا بھلا کیوں کہہ رہی تھیں؟“  
”وہ مجھ سے شادی کی درخواست کر رہے تھے۔“ نازیہ نے برا سامنے بنا کر جواب دیا۔

تم ایسا کرنا کہ کوئی جگنو، کوئی ستارہ سنبھال رکھنا  
مرے اندھیروں کی فکر چھوڑو، بس اپنے گھر کا خیال رکھنا  
ایسا موسم میں ریت دھرتی پہ فصل بوئی تھی چاندنی کی  
اب اس میں اگلنے لگے اندھیرے تو کساجی میں ملال رکھنا  
دیوارِ اُلفت میں اجنبی کو، سفر ہے درپیش ظلمتوں کا  
کہیں وہ راہوں میں کھو نہ جائے، خدا درپچہ اجال رکھنا  
پچھڑنے والے نے وقتِ رخصت کچھ اس نظر سے دیکھ دیکھا  
کہ جیسے وہ بھی یہ کہہ رہا ہو، تم اپنے گھر کا خیال رکھنا  
یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے، یا خزاں بہاروں کی گھاتیں ہے  
نصیب صبح عروج ہو تو، نظر میں شام زوال رکھنا  
کسے خبر ہے کہ کب یہ موسم اڑکے رکھ دے گناہاں آند  
تم احتیاط لے لو، سر پر فلک کی چادر ہی ڈال رکھنا  
اعجاز احمد آند

غم سے بہل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
درد میں دھل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
سایہ وصل کب سے ہے آپ کا منتظر مگر  
ہجر میں مل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
اپنے خلاف فیصلہ، خود ہی لکھا ہے آپ نے  
ہاتھ بھی مل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
زحمتِ قربتِ دگر، دوست کو دیجیے نہیں  
گر کے سنبھال رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
دائرہ دار ہی تو ہیں، عشق کے رستے تمام  
راہ بدل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
دشت کی ساری رونقیں خبر سے گھر میں ہیں تو کیوں  
گھر سے نکل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
اپنی تلاش کا سفر، ختم بھی کیجیے کبھی  
غلاب میں پل رہے ہیں آپ آپ بہت عجیب ہیں  
بیرزادہ قاسم



(نورین شاہ.....کراچی)

## ڈکٹری

کسی فرم کے ایک سینئر مینیجر ریٹائر ہوئے تو ساتھیوں نے انہیں الوداعی پارٹی دی۔ کھانے کے بعد ان کے جانشین نے تقریر کے دوران کہا۔

”آج ہم میں سے ایک ایسا شخص جدا ہو رہا ہے جو خوف اور بزدلی کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔ جسے ظلم اور زیادتی کے معنی نہیں آتے، جو شکست کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہے۔“

تقریب میں پیچھے کی طرف بیٹھے ایک صاحب نے زیر لب کہا۔

”تو پھر تجھے کے طور پر انہیں ڈکٹری دے دی جائے۔“

(عائشہ صدیقیہ.....راولپنڈی)

## سیلفی

ماں گھبرائی ہوئی بولی۔ ”بیٹا! جلدی آ جاؤ، بہو کو فاج کا ایک ہوا ہے۔ منہ میڑھا، آنکھیں اوپر اور گردن گھوم گئی ہے۔“

”رہنے دیں امی! وہ سیلفی لے رہی ہوگی۔“ بیٹے نے جواب دیا۔

(سونیا خان.....جھنگ)

## تحریر شناس

ایک خاتون تحریر شناسی کے حوالے سے بڑی معروف تھیں۔ وہ خواتین کے ایک مقبول ماہر تھیں۔ میں ”تحریر شناس“ کے عنوان سے ایک کالم بھی لکھتی تھیں اور اس سلسلے میں انہوں نے خواتین کو دعوت عام دے رکھی تھی کہ وہ انہیں کسی بھی شخصیت کی تحریر کا نمونہ ارسال کریں تو وہ اس کی عادات، خصائص اور کردار کے بارے میں بہت سی صحیح اور مفید باتیں بتا سکتی ہیں۔ خواتین بہت ذوق و شوق سے انہیں تحریروں کے نمونے ارسال کرتی تھیں جن میں ان کی

اپنی تحریروں کے نمونے کم اور دوسروں کے زیادہ ہوتے تھے۔

ایک خاتون نے تحریر کا ایک نمونہ انہیں بھیجے ہوئے لکھا۔

”یہ ان صاحب کی تحریر کا نمونہ ہے، جن سے میں محبت کرتی ہوں۔ براہ مہربانی اس کا بہت توجہ سے تجزیہ کر کے بتائیے کہ یہ اچھے شوہر ثابت ہو سکیں گے یا نہیں؟“

خاتون تحریر شناس نے انہیں کالم میں جواب دینے کے بجائے براہ راست جواب ارسال کرتے ہوئے لکھا۔

”محترمہ! اس تحریر کا تجزیہ کرنے کے لیے مجھے زیادہ توجہ یا غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس تحریر کا حامل شخص تین سال میرے لیے تو اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا۔ اچھا ہوا کہ آپ نے قسمت آزمائی سے پہلے اس کی تحریر کا نمونہ مجھے ارسال کر دیا۔“

(ضوفشاں.....سیالکوٹ)

## مساوات

کسی نے ایک دفعہ چاہے بخشے سے عرض کی کہ خواتین کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں۔

چاجا: ”پترا! اصولی طور پر تو میں اس کا حامی ہوں لیکن تمہاری چاچی مجھ سے چار ہتھ دھ (زیادہ) ہے۔ وہ میری برابری پر نہیں ماننے کی۔“

(زربینہ گل.....سکھر)

## پچو کا انتقام

پچو گلی میں کرکٹ کھیل رہا تھا کہ بال ایک گھر کی کھڑکی کا شیشہ توڑتی اندر چلی گئی۔

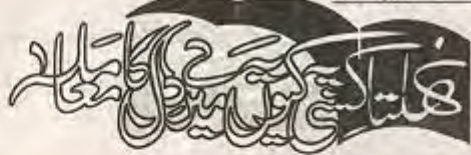
گھر کے مالک جاوید صاحب نے بچوں کو گیندواہیں نہیں کی۔ اگلے دن جاوید صاحب اپنی بیگم کے ساتھ پارک میں کھیل رہے تھے کہ اچانک پچو سامنے آ کر ہولا۔

”انکل! اوہ کل والی آئی زیادہ اچھی تھیں۔“

اب جاوید صاحب دو دن سے بغیر کچھ کھائے پیے پچو کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

(عالیہ رشید.....ہری پور)

## خحالہ جیلائی



خدیجہ سارنگ ہارچ داؤد والا، تلمبہ تم آئے ہو نہیں بھی آزلہ کے دیکھ لیتا ہوں تمہارے ساتھ بھی کچھ دودھ لیتا ہوں

فاطمہ رانی داؤد والا، تلمبہ یہاں منظر سے پس منظر تک جراتی ہی جراتی ہے

سنگی اصل کا مجھ سے نہیں کھٹکا کبھی پتھر خراب نہیں ہوتا

بہم بنیر حسین عشق بار دگر ہوا ہی نہیں

دل لگا یا تھا، لگا ہی نہیں ایک سے لوگ، ایک سی باتیں

گھر بدلنے کا فائدہ ہی نہیں اقصی ناصر

جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات میں وہ اپنے درمیان تھے، ابھی کل کی بات ہے

ماہا بنیر حسین مجھوں کا سفر، اس طرح بھی گزرا تھا

سکتے دل سے مسافر، سکتے پانی نہ معنی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل

غزل بھی وہ، جو کسی کو ابھی سنائی نہ تھی

شازیہ ہاشمی شازیہ ہاشمی شازیہ ہاشمی

تو نے دیکھا ہے منڈیروں پر جراتی کو فقط

میں نے ملتا ہوا ہر دور میں انسان دیکھا

ماریاہ منڈیر وہ جو کہتا تھا کچھ نہیں ہوتا

اب جو روتا ہے تو چپ نہیں ہوتا

یاسین کنول لا حاصل کا ملال ہے وہ نہ

مجھے کب کوئی شعر کہنا تھا

رانی ریاض تمہیں پا کر بھی مشکل میں تھے

تمہیں صبر کر بھی بھجھتا ہے بہت

ان آئے جاتے غلوں میں میرے دل کو تم یاد آئے بہت

نمرہ، اقرار کچھ خوشیاں، کچھ آنسو، کچھ حیرانی ہوتی ہے

ہر انسان کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے

غجدہ اکرم گاؤں گولیوں ہزار سال سے میں عالم فراق میں ہوں

مختار گیلانی وہ لمحہ جسے گزرنا تھا

نوال افضل گلشن مجھوں کا سفر، اس طرح بھی گزرا تھا

مجھوں کا سفر، اس طرح بھی گزرا تھا

سکتے دل سے مسافر، سکتے پانی نہ معنی

بچھڑتے وقت ان آنکھوں میں تھی ہماری غزل

غزل بھی وہ، جو کسی کو ابھی سنائی نہ تھی

شازیہ ہاشمی شازیہ ہاشمی شازیہ ہاشمی

تو نے دیکھا ہے منڈیروں پر جراتی کو فقط

میں نے ملتا ہوا ہر دور میں انسان دیکھا

ماریاہ منڈیر وہ جو کہتا تھا کچھ نہیں ہوتا

اب جو روتا ہے تو چپ نہیں ہوتا

یاسین کنول لا حاصل کا ملال ہے وہ نہ

مجھے کب کوئی شعر کہنا تھا



## گلشنِ حور

### رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔  
”مومن بھولا بھالا شریف ہوتا ہے اور فاسق دھوکا باز ٹھیکہ ہوتا ہے۔“

ف۔۔ حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی طبیعت میں چال بازی اور مکاری نہیں ہوتی وہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے اور ان کے بارے میں بدگمانی کرنے سے اپنی طبعی شرافت کی وجہ سے دور رہتا ہے۔ اس کے برخلاف فاسق کی طبیعت ہی میں دھوکا دہی اور مکاری ہوتی ہے۔ فتنہ و فساد پھیلانا ہی اس کی عبادت ہوتی ہے۔

### بے وقوف اور حلوہ

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔  
”عقل مندوں کے ساتھ جنگ نہ کرنا بے وقوفوں کے ساتھ حلوہ کھانے سے زیادہ کسان ہے۔“  
انصاف، ناہر، کراچی

### رجبتِ آخرت

”جس حالت میں کہ دنیا میں کی ہے اور فانی ہے اور آخرت سوئے کی ہے اور باقی ہے، تو رجبتِ آخرت کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ دنیا کے ساتھ۔“  
اقرا، نغز، کراچی

### بے قابو زبان

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ زبان سارے بدن کی اصلاح کی بنیاد ہے۔ جب زبان ٹھیک ہو جائے تو سارے اعضاء ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ اور جب زبان بے قابو ہوجاتی ہے تو تمام اعضاء بے قابو ہوجاتے ہیں۔ (آخر جز بن ابی الدیانی العت)

### زبان کی احتیاط

حضرت عیسیٰ بن عقبہؓ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ دہنے زمین پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے زبان سے زیادہ عمر قید کی ضرورت ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ ”میں نہیں بے کار باتیں کرنے سے ڈراتا ہوں اور بقدر ضرورت بات کرنا ہی تمہارے لیے کافی ہے۔“  
حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ ”قیامت کے دن سب سے زیادہ خطا میں ان لوگوں کی ہوں گی جو دنیا میں فضول بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے۔“

### کھانے کے آداب

بچے میں سب سے پہلے کھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے لہذا لازم ہے کہ اس کو کھانا کھانے کے آداب سکھائیں۔ تاکہ وہ سیدھے ہاتھ سے کھائے اور ہم اللہ بڑھ کر کھانا شروع کرے۔ جلدی جلدی نہ کھائے۔ اچھی طرح چبائے۔ دوسروں کے نوالوں پر نظر نہ کرے۔ اپنے سامنے سے لے کر اٹھائے اور جب تک ایک نوالہ نہ نکلے، دوسرا نوالہ نہ لے۔ کھانے کو ہاتھوں پر نہ لگے دے اور نہ کپڑے خراب کرے۔

کسی بھی کھانے کو روکھی روٹی بھی کھائیں۔ تاکہ وہ ہمیشہ سالن کا طالب نہ ہو۔ بچے کے سامنے پیار خوری کی خدمت کریں اور بتائیں کہ یہ کام باقودوں اور اطفال کے لیے ہے۔ اور اس کے سامنے بیٹھنے کی مذمت کی جائے اور باادب بچے کی تعریف کریں تاکہ اس کی تعریف کی کر

اس میں حمیت پیدا ہو اور وہ خود بھی اس پر عمل کرنے لگے۔  
قطع رحمی

حضرت عثمان بن عفانؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابوالوبسہؓ بیان کرتے ہیں۔

”ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہؓ، شب جمعہ میں جمعرات کی شام کو ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ ہماری اس مجلس میں جو بھی قطع رحمی کرنے والا بیٹھا ہوا ہے میں اسے جلدی تائید سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا جائے۔ اس پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات میں دفعہ ہی تو اس پر ایک جوان اپنی بھوپھی کے پاس گیا جس سے اس نے دو سال سے تعلقات ختم کر رکھے تھے اداسے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ حیب اپنی بھوپھی کے پاس پہنچا تو بھوپھی نے اس سے پوچھا۔  
”میاں! تم کیسے آئے؟“

اس نے کہا۔ ”میں نے ابھی حضرت ابو ہریرہؓ کو ایسے اور ایسے فرماتے ہوئے سنا ہے (اس وجہ سے آیا ہوں)۔“

بھوپھی نے کہا۔ ”ان کے پاس والیں باؤ امدان سے پوچھو کہ انہوں نے ایسا کیوں فرمایا ہے؟“  
اس نو جوان نے والیں جا کر ان سے پوچھا تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا۔

”میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب جمعہ میں ہر جمعرات کی شام بنی آدم کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں (اور انسانوں کے اعمال قبول ہو جاتے ہیں لیکن) قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔“

(آخر جز البخاری فی الادب)

### ایمان کامل

جب تک سطر زمین پر ایک بھی شخص ایسا ہے جس کا تیرے دل میں خوف یا اس سے کسی قسم کی توقع ہو، اس وقت تک تیرا ایمان کامل نہیں۔ (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

### صوفی وہ ہے

”صوفی وہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں قرآن مجید اور دوسرے ہاتھ میں سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔“

(علی بن حجر عسقلانی)

### تکمیل انسان

انسان کی تکمیل تین چیزوں سے ہوتی ہے۔  
1۔ خوف 2۔ امید 3۔ محبت۔  
1۔ خوف خدا گناہ سے بچاتا ہے۔  
2۔ امید اطاعت پر آمادہ کرتی ہے۔  
3۔ اور محبت میں محبوب کی رضا کو دیکھنا پڑتا ہے۔

### پلو شیدہ سمرت

دینا دار اور دولت مند بڑی بلا میں گرفتار ہیں کہ دنیا کی ماضی سمرت کو دیکھتے ہیں اور دینی سمرت ان سے پوشیدہ رہتی ہے۔  
(بخاری کاکی)

### توا اور تیر (سب کچھ تیرے باپ کا ہے)

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے باپ کی شکایت کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرا باپ مجھ سے پوچھتا نہیں اور میرا مال خرچ کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے والد کو بلاؤ۔ جب ان کے والد کو بتایا کہ میرے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میری شکایت کی ہے تو دل میں رنجیدہ ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے چلے۔ چونکہ عرب کی لکھی میں شاعری تھی تو راستے میں کچھ اشعار دہن میں ہوا کہ جھوٹے کی طرح آئے اور چلے گئے۔







## شعاع کے ساتھ ساتھ

(ادارہ)

حمنی اقبال..... منڈی فیض آباد

(1) شعاع کب پڑھنا شروع کیا یہ تو نہیں یاد کیونکہ تب میں بہت چھوٹی تھی شاید دس، گیارہ سال کی تب تو معنی بھی ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ خیر اتنی بھی پرانی نہیں ہوں میں ابھی تو بیس کی ہوئی ہوں۔ ہمارے گھر میں رسالے پڑھنے کی پابندی نہیں تھی پہلے ای اور پھر آئی انم پڑھتی تھیں ان کی ساتھ ساتھ میں بھی شروع ہوئی تقریباً دس سال ہو گئے ہمارے ساتھ کو..... اور یہ ساتھ خیر سے بہت اچھا رہا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا شعاع سے۔

(2) صبح کا آغاز تھوڑی دیر سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن صبح اٹھ کر سب سے پہلے نماز پڑھتی ہوں قرآن پاک پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتی ہوں۔ اس کے بعد گھر کی صفائی کرتی ہوں۔ صفائی میں کچھ زیادہ نہیں ہوتا کیونکہ رات کو ہی باورچی خانے کی صفائی کر لیتی ہوں مطلب برتن صاف کر کے چیزیں وغیرہ سمیٹ کر ہی سوتی ہوں اس لیے کچھ زیادہ نہیں ہوتا پھر اسکول جانے کی تیاری..... نہیں نہیں جناب میں اسکول میں پڑھتی نہیں ہوں بابا بابا..... بلکہ میں اسکول میں پڑھانے جاتی ہوں ہاں جی میں حمنی اقبال فچر بھی ہوں ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی مکمل کر رہی۔ اسکول میں جانے سے پہلے تیار ہو کر جلدی جلدی ناشتا اسکول کو بھاگتی ہوں۔

ہاں جناب کیونکہ اسکول کو درپور ہی ہوتی ہے میری کزن عائش پہلے ہی اسکول کے لیے نکل جاتی ہے پھر میں بھی دوڑ لگا دیتی ہوں اور دس منٹ جاتے ہوئے گتے پڑھتی ہوں اور میں پھر بھی اس سے پہلے اسکول میں داخل ہوتی ہوں۔ اسکول میں بہت اچھا وقت گزرتا ہے۔

اسکول سے آ کر نماز پڑھ کر کھانا کھاتی ہوں۔ کہ ٹیوشن والے بچے آنے لگتے ہیں۔ ہاں جی اب میں کیا کروں اسکول والے جان چھوڑتے ہیں اور نہ ہی ٹیوشن والے بچے جان چھوڑتے ہیں کیونکہ میں ہوں ہی بہت اچھی اور سچی بات ہے میرا بھی دل نہیں کرتا ان کو چھوڑنے کو..... سب کہتے ہیں کہ جب تمہاری شادی ہوگی تب ہی جدا ہوں گے ہم، ورنہ نہیں اور میں پاگل، بے وقوف یہ بات سن کر ہی خوش ہو جاتی ہوں۔ بابا بابا۔

ان سے فارغ ہو کر کھانا وغیرہ بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر ہم سب مل کر بیٹھ جاتے ہیں باتیں وغیرہ کرتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں ہم تین بہن بھائی ہیں دو بہنیں اور ایک بھائی..... آپ کی شادی ہوگئی ہے خیر سے اور میں گھر میں چھوٹی ہوں اور لاڈلی سی..... باورچی خانہ صاف کر کے دس بجے سو جاتی ہوں۔

(3) افسانوں میں سب کچھ خیالی ہوتا ہوگا مجھے نہیں لگتا کیونکہ بس یہ سب سچ ہے اور میں خود بھی خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی ہوں۔

(4) خوبیاں اور خامیاں..... خامیاں یہ ہیں کہ میں غصہ بہت جلدی کر جاتی ہوں اور بس ایک ہی خامی ہے اور سب کچھ بہت اچھا ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہی، سب کہتے ہیں۔

خوبیاں بہت سی ہیں، سب سے بہت پیار کرتی ہوں، کسی کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتی، کسی کی تکلیف برداشت نہیں ہوتی، ہر وقت ہنسی رہتی ہوں اور اس طرح جو کوئی پریشان ہو، وہ میری مسکراہٹ دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے۔ کیونکہ میری مسکراہٹ بہت پیاری ہے۔ اپنی وجہ سے کسی کو پریشان نہیں کرتی، کسی کو دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی اور بھی بہت کچھ لیکن اب

بس کیونکہ نظر لگ جانے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔

(5) شعاع بہت اچھا، بہت زبردست ہے۔ ہر انداز اچھا ہے، اس کی کس کس چیز کی تعریف کروں بس یہ کہ ایسا اچھا مجھے کوئی کوئی لگتا ہے۔ اور شعاع مجھے بہت اچھا لگتا ہے تحریریں ایسی دلنشین ہوتی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ ہم اس کے سحر میں گم ہو گئے ہیں۔

(6) مجھے بارش بہت اچھی لگتی ہیں میں بہت انجوائے کرتی ہوں۔ خاص طور پر سردی کی بارش اف

بہت مزہ آتا ہے۔ سردی مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور مٹی کی خوشبو..... کیا بات ہے۔ اس سال کا ایک واقعہ بتاتی ہوں کہ بہت سردی تھی ایک صبح میں اسکول گئی میری کلاس میں ایک گھڑی ہے۔ جسے کھول کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ سب نے کہا سردی لگ جائے گی لیکن پرواکس کو بھی میری فرینڈ آئی اس نے کہا حمنی پلیز ایسا نہ کرو، میں یہ کہہ کر ٹھیک ہے تھوڑی دیر بعد بند کر دیتی ہوں، تھوڑی دیر بعد میں نے بند کر دی لیکن مت پوچھے کہ میرا کیا حشر ہوا۔ اتنی سردی ہوئی لگی کہ بس۔

(7) میری پسندیدہ کتاب قرآن مجید ہے۔ میں سب سے زیادہ پیار بی بی فاطمہ سے کرتی ہوں اور وہ میرے لیے مشعل راہ ہیں۔ میں ان کو اپنا لیڈر سمجھتی ہوں اور میرا موٹ فیورٹ ناول جنت کے پتے ہیں بہت اچھا ناول ہے۔

(8) اقتباس: جس کے دل میں عشق مقیم ہو جائے اس دل میں ہمیشہ درد کا دھواں بھرا رہتا ہے۔ جو پوری جان کو سلگائے رکھتا ہے۔ وہ بھٹی اس کو جلا کر نیست و نابود نہیں کرتی، بلکہ اس کو پا کر مضبوط کر دیتی ہے پھر وہ ٹھنڈا ٹھنڈا چشمہ بن جاتا ہے جس سے ہر پیاسا اپنی پیاس بجھاتا ہے۔

”محبت کو تقسیم نہ کرو، ضرب دو، تقسیم سے ہٹی ہے، ضرب سے بڑھ جاتی ہے۔“

شمن شفیق..... راولپنڈی

نام تو میرا آپ جان ہی چکے ہوں گے مک نیم ”سنی“ ہے اور یقین کیجیے ہر طرف سے ”سنی“ سننے کی اب اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر کوئی شمن پکارے تو بہت ہی اوپر لگتا ہے۔ بہر حال.....

(1) شعاع کے ساتھ وابستگی کے بارے میں اتنا ہی لکھوں گی کہ جب تین سے چار بچوں کے لفظ پڑھنا بہت مشکل لگتا تھا اور جب بہت سے الفاظ کے معنی سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے تب سے پڑھتی ہوں اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچہ بچہ پکھیلنے ہوئے

اپنے (فرضی) اسٹوڈنٹس کے نام ناول میں موجود کرداروں کے ناموں پر پڑھتی تھی۔ تو بس..... بے قاعدہ تو کافی عرصہ پڑھا البتہ باقاعدہ پڑھنا پانچ سے چھ سال مکمل شروع کیا۔

(2) صبح کا آغاز ماما کی آواز سے ہوتا ہے۔ نماز پڑھ کر سب بہن بھائیوں کو جگانا اور سب سے چھوٹی لایہ کو اسکول کے لیے تیار کرنا میری ذمہ داری ہے۔ بعد ازاں گھر کی صفائی..... تقریباً ساڑھے نو بجے تک سب کاموں سے فارغ ہو کر میں اور ماما شہد کرتے ہیں کیونکہ دس بجے مجھے مسجد جانا ہوتا ہے جہاں پر میں عالمہ بننے کا دوسرا لہ کورس کر رہی ہوں۔ تقریباً بارہ بجے تک واپسی ہوتی ہے، اس کے بعد دو بجے تک کا وقت شعاع، خواتین کے لیے ہوتا ہے۔ اس کے بعد نماز پڑھتی ہوں۔

اس دوران بہن بھائی اسکول سے آ جاتے ہیں۔ کھانا وغیرہ کھا کر اور تھوڑا کھیل کر یہ سب مسجد چلے جاتے ہیں اور میں ایک دفعہ پھر سارا کھراوا سمیٹ کر لیٹ جاتی ہوں۔ تھوڑا آرام (آرام سے مراد لیٹ کر خواتین، شعاع کا مطالعہ) کرنے کے بعد ٹیوشن، ف، اف.....

مغرب کے وقت بھائی آفس سے واپس آ جاتا ہے اور پاپا سے سب کی بات کرواتا ہے۔ اور مجھے بٹھا



کر شاعری سنا تا رہتا ہے جب تک کہ کال چلتی رہے۔ (مطلب اس وقت میری شاعری کی کلاس ہوتی ہے) بس یونہی دن تمام ہوتا ہے۔ اور ہاں سونے سے پہلے بھی ڈائجسٹ کا مطالعہ کرنا میری پختہ عادت ہے۔

(3) پسندیدہ تحریریں فی الحال مجھے ”جنت کے پتے“ جتنی اچھی کوئی تحریر نہیں لگی۔ پسندیدہ میں سب سے زیادہ رائٹر ساثرہ رضا پسند ہیں، دوسرے نمبر پر نایاب جیلانی علاوہ ازین قانیہ راجہ، صدف آصف، راشدہ رفعت اور بنت سحر بھی پسند ہیں۔ اپنی جھلک کسی بھی ناول میں نظر نہیں آئی۔

(4) خوبیاں اور خامیاں: ماما کہتی ہیں کہ گھر کا کام سارا کرتی ہوں (یہ خوبی ہے) اور کپڑوں کو ہاتھ تک نہیں لگاتی (یہ خامی ہے) مطلب نہ دھوئی ہوں نہ استری کرتی ہوں) غصہ آئے تو بالکل خاموش ہو جاتی ہوں۔ بہت اچھی سماع ہوں، لیکن اپنی باتیں کسی سے زیادہ شیر نہیں کرتی۔ جلد فریک نہیں ہوتی۔ اپنا احتساب کرتی رہتی ہوں۔ (خوبیاں اور خامیاں خود الگ الگ کر لیں)..... خوبی احسن بھائی سے پوچھا تو کہنے لگا کہ خوبیاں سوچنے کے لیے مجھے کم از کم گھنٹے کا وقت دو البتہ خامیاں بنار کے بتا سکتا ہوں (ہائے) ٹارن (چھوٹا بھائی) کہتا ہے کہ ڈرپوک ہو بہت۔ خیر یہ تو سب گھر والوں کی اجتماعی رائے ہے میرے بارے میں یہ بھی خامی ہے کہ جب بھی کوئی ناول پڑھنا شروع کرتی ہوں تو تین چار سطریں پڑھ کر اینڈ والا صفحہ کھول لیتی ہوں اور پھر آخری پیرا گراف پڑھتی ہوں۔

ایک پیر یہ نہیں ہوں بالکل بھی۔  
تحریر جملے..... اسکول، کالج میں میرے اردو لب و لہجہ کی بہت تعریف ہوتی تھی۔

(5) پسندیدہ شعر.....

اب حال دل نہ پوچھ کہ تاب بیاں نہیں  
اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

میرے ہی لہو پہ گزر اوقات کرو ہو  
مجھ سے ہی امیروں کی طرح بات کرو ہو  
اک ستم صبح اک ستم شام کرو ہو  
وہ دوست ہو کہ دشمن کو بھی مات کرو ہو  
دامن یہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ  
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

☆☆☆

عائشہ مری..... کوئٹہ

(1) شعاع سے وابستگی تو بہت پرانی ہے۔ کتاب کے ساتھ تعلق تو چولی دامن کا رہا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی گھر میں ہم نے ان رسالوں کو پایا ہے۔ کسی کی ترجیح، جاسوسی، سپنس تو کزنز اور سسٹرز خواتین رسالوں کی رسیا۔ ماما بھی جب تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کر لیں، انہیں خینڈ نہیں آتی۔

ہمارا گھر انہ خاصا ادبی ہے۔ میرے نانا ایک ادب دوست انسان تھے۔ انہیں کتابوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ کتابوں کا ایک انمول خزانہ ان کی ملکیت ہے جو کہ اب میری لائبریری کا حصہ بن چکا ہے۔ کتابوں سے یہ لگاؤ تو ہم سب میں بچپن سے ہی ہے تو اس حساب سے یہ وابستگی بھی کافی پرانی ٹھہری۔

(2) شب گریزاں ہوئی آخر جلوہ خورشید سے یہ چمن معمور ہوگا نفثہ توحید سے صبح کا آغاز ناشتے اور پھر تلاوت قرآن پاک سے ہوتا ہے۔ پھر روزمرہ کے کام، پڑھائی سے اب چونکہ فراغت ہے، تو یہی گھر کے کام۔ خصوصاً صفائی کا کام میرے ذمے ہے۔ دیگر فارغ اوقات میں سلائی سیکھنا، لکھنا اور پھر دودھ کو فراغت پاتے یا پھر شام کو کام نمشا کر بستر میں دیکے کتابیں ہوتی ہیں اور ہم، جب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

خواتین کے آتے ہی اکثر ہم بہنوئی لڑائی میں شعاع کا ٹانگلہ پڑے پڑے ہو جاتا۔ اب چونکہ خیر سے سب اپنی اپنی لائف میں مگن ہیں، تو شعاع پر اب ہمارا راج ہے۔

(3) زندگانی جس کو کہتے ہیں فراموشی ہے یہ خواب ہے، غفلت ہے، سرمستی ہے، بے ہوشی ہے یہ اپنی خوبیوں اور خامیوں پر کبھی غور ہی نہیں کیا، ویسے حساس ہوں، ایمان دار ہوں (آہم آہم)۔

جب کہ آپ کہتی ہیں میں بے دھنکی، بے پرواہی ہوں اور یہ بات کافی حد تک درست بھی ہے۔ میں واقعی بعض معاملوں میں سست اور لا پرواہ ہوتی ہوں۔ جو کہتی ہیں کہ اتنی بڑی ہو کر بھی تمہیں بولنا نہیں آیا، کیا واقعی (حالانکہ اب اتنی بھی بڑی سیانی ہوئی نہیں) یہی کمٹ جامہ کی میچر نے بھی کیا تھا۔

ایسے ہی بے شمار خامیاں ہیں ان کے حصار سے نکلی اور سدھر گئی تو خوبیوں کے متعلق بھی سیریس ہو کر سوچا جائے گا۔

(4) پسندیدہ کردار کہانی، پسندیدہ کہانی تو یارم کو ہی کہنا چاہوں گی۔ یارم کو میں نے بار بار پڑھا ہے اور ہر بار پڑھنے پر دل چسپی پہلی بار پڑھنے جیسی ہوتی ہے۔ سیر احمد کی ہر تحریر خواہ محبت سن خرم، دائم انیس سب ہی لا جواب ہوتی ہیں۔ یادگار ذہن پر امنٹ نشان چھوڑنے والی عمیرہ احمد کی پیر کال، امرتیل، بشری بی کی سفال گرہ سب اپنی مثال آپ ہیں۔ ایسے ہی نگہت سیما اور نایاب جیلانی بھی عمدہ قلم کار ہیں، ان کی ہر تحریر یادگار، بے مثال جیسے بار وفا، پل صراط ہو یا پھر طلوع سحر سے شام محبت یا شہر خطا یہ سب وہ تحریریں ہیں جو ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں۔ جہاں تک بات ہو پسندیدہ کردار کی تو یارم کا عالیان، امرتیل کے عباس کا کردار، دست کوڑہ گر کے محل کا کردار یا پھر قمر قریم کے تاج محل کے افق کا کردار انہیں پسندیدہ کہا جائے تو چٹا نا ہوگا۔

کسی کردار میں اپنی جھلک تو نظر نا آئی، ہاں

ستارہ شام کی تنوی کی کافی عادتیں مجھ سے ملتی ہیں جب کہ جو کو ہر دو، کمزور اور بے وقوف لڑکی میں میری جھلک دکھائی دیتی ہے۔

(5) ساون رت، برسات کے اچھی نہیں لگتی۔ دھیمی پوچھاڑ اور خاموش بوندوں کو پہروں سننا اچھا لگتا ہے۔ کبھی بوندوں کی نرم پھوار اندر تک سرشار کر دیتی ہے جب کہ تیز بارش میں بجلیکا اور موسم رت کو انجوائے کرنا، یہ وہ پل ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں۔

(6) پسندیدہ شعر تو کافی ہیں، ایک عرض ہے۔ کبھی جو سر یہ بخود ہوا تو زمین سے آنے لگی صدا ترادل تو ہے صنم آشنا تھے کیا طے گا نماز میں کتاب یارم، سفال گرہ، بانو قدسیہ صاحبہ کی راجہ گدھ، لا حاصل جب کہ آج کل انڈس میں انجلی زیر مطالعہ ہے اور چند اسلامی کتب ہیں، کلام پاک جو کہ سرچشمہ ہدایت و رحمت ہے، اقتباسات کے بجائے چند آیات کا ترجمہ کلام پاک سے۔

اچھی بات کہنا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستانا ہو اور اللہ بے پروا علم والا ہے۔

اور اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور تو اسے دیکھتا۔ جھکا ہوا، پاش پاش ہوتا اللہ کے خوف سے یہ اور یہ مثالیں لوگوں کے لیے ہم بیان فرماتے ہیں کہ وہ سوچیں۔ (سورہ حشر)

ان کی کہادت جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس دانہ کی طرح جس نے لگائیں سات بائیں، ہر مال میں سودا نے اور اللہ اس سے بھی زیادہ بڑھائے۔ جس کے لیے چاہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والہ عالم والا ہے۔

عطیہ مری

(1) شعاع سے وابستگی زیادہ پرانی نہیں۔ پہلے دوران تعلیم کبھی کبھار ان رسالوں سے پالا پڑا۔ تاہم تعلیم کو خیر باد کہنے کے بعد اب باقاعدگی سے پڑھنے لگے ہیں۔ فقط شعاع، خواتین ہی نہیں دیگر رسائل بھی



زیر مطالعہ ہیں، پر شعاع کے کیا کہنے۔ وقت کے ساتھ شعاع میں بھی کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جیسے پھولوں، بادلوں، تلیوں کے قصے، وہ لوگ جھونک، ہنسی چھیڑ خانی، محبتوں کے قصے۔ فائزہ افتخار، بشری سعید، شازبہ چوہدری، نگہت عبداللہ اور ماہا مالک کی تحریریں، جن کی نظیر نہیں ملتی اب۔ شعاع میں وہ پہلے کی سی بات نہیں رہی۔

یا پھر وقت بدلنے کے ساتھ انداز تحریر میں سادگی کی جگہ بناوٹ اور مصنوعی پن نے لے لی۔ تاہم اب بھی دیکھا جائے تو ان سب کے باوجود شعاع کا معیار دیگر رسائل سے اعلیٰ ہے۔

(2) صبح کا آغاز اس امید کے ساتھ کرتی ہوں کہ آج ناسی کل کبھی اپنے گھر جا کر میاں جی سے بیڈ ٹی جیسے نعرے اٹھاؤں گی (خالی پلاؤ)۔ جی، یہ میرا خواب تھا بچپن سے، کم از کم میکے میں تو لڑکیوں کو اس طرح کے خواب دیکھنے پر کوئی پابندی تو نہیں۔

پھر روٹین کے کام، گھر داری، آج کل میں دل جی سے کوئی کنگ سیکھ رہی ہوں۔ امی کہتی ہیں لڑکی اگر ہر فن میں طاق ہو تو سب کچھ سن جاہل جاتا ہے۔ بس یوں ہی یہ بات میں نے اپنے پلو سے باندھ لی، پھر مطالعہ، ٹی وی۔ بس یوں ہی دن تمام ہو جاتا ہے اور پھر ایک نئی صبح کا آغاز..... نئی امید اور عزم وہی پرانا، بھئی میاں جی کو گھر داری سکھانا، سمجھنا بنانا.....

باہا۔

(3) خوبیاں اور خامیاں، اپنی زبان سے یہ سب بیان کرنا کافی مشکل ہے اور خوبیاں اگر دیکھی جائیں تو حساس ہوں کافی زیادہ۔ اتنی نرم کہ ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ تھوڑی تازک مزاج ہوں، جلد دوسروں کی بات دل پر لے لیتی ہوں اور ویسے ہی جلد دوسروں پر اعتبار بھی کر لیتی ہوں۔

اپنوں کا اور خود سے وابستہ لوگوں کا خیال رکھتی ہوں، تھوڑی سی جولی ہوں۔ شاید اس لیے بچوں کی فیورٹ آنٹی ہوں۔ جی ایسے ہی ایک لمبی لسٹ ہے

اور رہی برائیاں تو خیر جہاں پھول ہوں وہاں کانٹے تو ہوتے ہی ہیں (آہم آہم)۔

بقول عائشہ کے، بہت سادہ ہوں، جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتی ہوں۔ اس وجہ سے بہت بامدتی بھی گھائی پڑی، تھوڑی آڈٹ اسپون ہوں۔ اس وجہ سے کافی مشکل اٹھانی پڑی، خیر اب کوشش کر رہی ہوں، اپنی بری عادتوں سے چھکارا پانے کی۔

(4) شعاع کی تمام ہی تحریریں لا جواب ہوتی ہیں، جیسے، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، درد دل، قتل، جب کہ عیسہ اور فائزہ افتخار کی تو ہر تحریر لا جواب ہوتی ہے اور جس کردار نے سب سے زیادہ مرعوب کیا وہ عالم شاہ، امرتیل کا عمر، میں تو اکثر سوچتی ہوں نا جانے یہ لوگ کس جہاں میں بستے ہوں گے۔ یقیناً بہت خوب صورت دنیا ہوگی (خواہوں کی دنیا)۔

بہت سے ایسے کردار ہیں جن سے انپائریشن ملی، آگے بڑھنے کا حوصلہ، سبق، لیکن ان تحریروں اور کرداروں سے ملی۔

مجھے امرتیل کے عمر اور اپنے خیالات ملتے جلتے لگے۔ لیو ہوں نا، اس لیے جی ایسا کوئی کردار تو ذہن میں نہیں البتہ مریم (کزن) کو میری مماثلت صوفشاں میں نظر آتی ہے۔

(5) سادوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں چونکہ گرج چمک سے بہت ڈر لگتا ہے تو اس لیے زیادہ تر برسات ابجوائے ہی نہیں کر پاتی۔

(6) یوں تو شعر و شاعری سے کوئی خاص شغف نہیں، ہاں کبھی بکھار کوئی نظم یا غزل نظر سے گزر جائے تو یاد رہ جاتی ہے، ان میں سے ایک شعر آپ کی نذر۔ وہ عشق نماز سکھا مجھ کو یارب جس نماز میں صرف تو ملے مجھ کو

(آمین)

پسندیدہ کتاب، ناول دیکھا جائے تو، شہر دل کے دروازے، جو چلے تو جاں سے گزر گئے، میں عبد القادر ہوں، وغیرہ وغیرہ۔



## فوجی سلیوٹ

فوجی سلام یا ”سلیوٹ“ کی تاریخ سولہویں صدی عیسوی تک جاتی ہے۔ 1588ء میں جس وقت انگریزوں کو ہسپانیہ کے بحری بیڑے ”ارمادا“ پر فتح حاصل ہوئی۔ تو انگریزی بحری بیڑے کے کپتان ”ڈریک“ نے فتح کا جشن منانے کا اعلان کیا۔ اس عظیم جشن کے موقع پر ”ڈریک“ نے ملکہ الزبتھ سے درخواست کی کہ وہ بہ نفس نفیس تشریف لا کر فوجیوں کو تمغات عطا فرمائیں۔ ملکہ کے جاہ و جلال اور عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے ”ڈریک“ نے ایک عجیب و غریب حکم نامہ جاری کیا جو کہ یوں تھا۔

”ہماری ملکہ کے ہوش رہا اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے حسن کے پیش نظر تمغات کے لیے نامزد کیے جانے والے ہر فوجی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ تمغہ وصول کرتے وقت اپنا دایاں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر اپنی آنکھوں کی حفاظت کرے۔“

یہی طریقہ بدلتے بدلتے موجودہ سلام یا سلیوٹ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ دنیا کی تمام دوسری فوجوں نے یہ سلام انگریزی فوجوں سے مستعار لیا ہے۔

(ایس نو بہار شمع..... اسکر دو ملتستان)

## سلطان نور الدین زنگی

سلطان نور الدین زنگی بیت المال سے معاوضہ لیتے تھے لیکن اس قلیل رقم سے گھریلو اخراجات بڑی سہولت سے پورے ہوتے تھے۔ اہلیہ نے اضافے کی درخواست کی تو سلطان نے فرمایا۔

”اگر تم بھتی ہو کہ بیت المال میرا ذاتی خزانہ

ہے تو یہ غلط ہے۔ میں تو صرف خزانچی کے طور پر اس کا محافظ ہوں۔ دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے میں اس میں خیانت نہیں کر سکتا۔ اسی قلیل مشاہیرے پر قناعت کرو اور سادگی اختیار کرتے ہوئے گزراوقات کرو۔“ (فرحانہ سلیم..... میاں چنوں)

## اخلاق کی قوت

جن دنوں سلطان صلاح الدین ایوبی صلیبیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ ایک چور رات کو ایک صلیبی خیمے میں جا گھسا اور ایک ماں سے اس کا شیر خوار بچہ چھین کر غائب ہو گیا۔ ماں روتی بیٹھی رچرچ کے پاس گئی۔ اس نے کہا۔

”میں بے بس ہوں۔ تم صلاح الدین کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ وہ اسلامی خیموں سے گزر کر صلاح الدین کے ہاں پہنچی۔ ایوبی نے اسے عزت سے بٹھایا۔ توجہ سے بات سنی اور تیز رفتار سواروں سے کہا کہ جاؤ اور چور کو تلاش کرو۔ وہ سوار سب سے پہلے بازار میں گئے، انہیں معلوم ہوا کہ فلاں آدمی نے کسی نادانف سے ایک بچہ خریدا ہے۔ یہ اس بچے کو لے کر واپس ایوبی کے پاس پہنچے۔

ماں دیکھتے ہی بچے کی طرف لپکی اور چٹ گئی۔ صلاح الدین ایوبی نے خریدار کو دکنی رقم دے کر بچہ خرید لیا اور اس خاتون کو کھڑے پر سوار کرا کے بحفاظت اس کے خیمے میں پہنچا دیا۔

جب یہ کہانی رچرچ تک پہنچی تو اس نے کہا۔ ”جن لوگوں کے پاس اخلاق کی یہ قوت موجود ہو، ان سے لڑنا خود کشی کے مترادف ہے۔“

(حمیرا خان چٹانی..... ملتان)



بے ہنگام

ایک بار مغل فرماں روا اورنگ زیب صبح جلدی اٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی شہزادی زیب النساء کی ایک خواص کو حکم دیا کہ ہمیں فجر سے پہلے جگا دیا جائے۔ خواص رات بھر جاگتی رہی۔ مبادا اس کی آنکھ لگ جائے اور وہ بادشاہ کو بروقت نہ جگا سکے۔ اتفاقاً اس رات ایک مرغ نے قبل از وقت بانگ دے دی خواص نے گھبرا کر بادشاہ کو جگا دیا۔ رات ابھی کافی باقی تھی۔ اورنگ زیب کو خواص کی یہ غفلت بہت ناگوار گزری۔ اس نے غصے میں کہا۔

”سربریدن لازم است۔“ (سرکاشا لازم ہے۔)

خواص تھر تھر کانپنے لگی اور سیدھی شہزادی کی خواب گاہ میں پہنچی۔ اس نے آہستہ سے پاؤں دبا کر شہزادی کو بے دار کیا اور یہ واقعہ سنایا۔ شہزادی کو کینز پر بہت رحم آیا۔ اس نے سلی دی اور صبح کے انتظار کا حکم دیا۔ صبح ہوئی تو شہزادی کینز کو اپنے ہمراہ لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے بادشاہ سے دریافت کیا کہ کینز کے حق میں کیا حکم ہے، جواب ملا۔

”سربریدن لازم است۔“

شہزادی نے برجستہ کہا۔

سربریدن لازم است، آن مرغ بے ہنگام را این پری چہرہ چہ داند وقت صبح و شام را (سرکاشا لازم ہے، اس مرغ کا جس نے بے موقع اذان دی۔ اس میں اس خوب صورت لڑکی کا کیا قصور ہے کہ بے وقت صبح شام ہوگی۔)

بادشاہ نے یہ جواب سن کر کینز کا قصور معاف کر دیا۔

بہ نفس

ایک ایرانی قبیلے کے سردار نصیر الدین سے ملک کا بادشاہ سلطان تکش ناراض ہو گیا اور اس نے حکم جاری کیا کہ سردار کا سرکاش کر حاضر کیا جائے۔ بادشاہ

کے سپاہی حکم کی تعمیل کے لیے سردار کے پاس پہنچے سردار نے سپاہیوں کو کسی نہ کسی طرح اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ اسے بادشاہ کی خدمت میں زندہ لے جائیں۔ چنانچہ اسے بادشاہ کے سامنے زندہ لے جایا گیا۔ بادشاہ پھڑک اٹھا۔ اس نے حکم عدولی کے جرم میں سپاہیوں کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نصیر الدین سچ نے موقع کی نزاکت بھانپ کر ایک برجستہ شہر پڑھا۔

سرخاستہ بدست کس نتواں داد  
سے ایم دبر گردن خود سے آرم  
آپ نے سر طلب کیا تھا، میں کسی کے ہاتھ کیوں بھیجتا خود اپنی گردن پر لیے حاضر ہوں۔  
بادشاہ پھڑک گیا۔ اس نے سردار کی نصیحت معاف کر دی اور اسے انعام سے نوازا۔

قدرت کے کھیل

عباسی خلیفہ مقتدر اپنے وزیر حسین بن قاسم سے کسی تقصیر کے باعث ناراض ہو گیا اور اسے معزول کرنے کے بعد ابن مقلہ کو وزیر بنادیا۔ ابن مقلہ کو خوف ہوا کہ بادشاہ حسین بن قاسم سے دوبارہ راضی ہو کر کہیں اسے پھر سے وزیر نہ بنادے، یوں ابن مقلہ کی حیثیت ثانوی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے حسین بن قاسم کو لکھ کر اس کا سر عجب گھر میں رکھوا دیا۔ مقتدر کے بعد جب ”راضی“ خلیفہ ہوا تو اس نے کسی بات پر ناراض ہو کر ابن مقلہ کو قید کر ڈالا اور اس کے ہاتھ چننی کنوا دیے۔ اس کے بعد عباسیوں کے عجائب گھر میں حسین بن قاسم کے سر کے ساتھ ابن مقلہ کے کٹے ہوئے ہاتھ بھی نظر آنے لگے۔ جن کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔

”یہ وہ ہاتھ ہیں جنہوں نے اس سر کو قلم کیا۔“ (شمینہ انجم ہاشمی)

نشان عظمت

دونوکر، ایک کمن لڑکا۔ عمر بیکو کوئی گیارہ بارہ

ہیں، ایک باغ میں دوڑ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک شیر کا بچہ تھا۔ لڑکا نوکروں سے چند قدم پیچھے تھا۔ آگے جا کر نوکر نے شیر کے بچے کو گھیر لیا۔ جوں ہی ایک نوکر اس کے گلے کی زنجیر پکڑنے کے لیے جھکا، اس نے غرا کر اپنے دونوں اگلے پنجے اٹھا دیے۔ نوکر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا ساتھی ڈر کے مارے پہلے ہی ایک طرف ہو گیا تھا۔ کم سن لڑکا ہنستا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اطمینان سے شیر کے بچے کے جسم پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس کی زنجیر پکڑ لی اور اسے نوکر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو۔ اب اسے لے جاؤ۔“

نوکر جواب تک ڈر ہوا تھا، بولا۔ ”حضور! یہ کاٹا ہے۔“

”تم خوا خواہ ڈرتے ہو، یہ دیکھو۔“ لڑکے نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ شیر کے بچے کے منہ کے سامنے کر دیا۔ شیر کا بچہ لڑکے کے ہاتھ چاٹنے کے بعد اس کے پاؤں پر لیٹ گیا۔

بچپن سے ہی شجاعت کے ایسے کھیل کھیلنے والا یہ بہادر بچہ کون تھا۔ یہ بچہ فتح علی شہو سلطان تھا۔ جس نے بڑے ہو کر بھی بڑی بہادری کے ساتھ انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور میدان جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔

”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

محمد علی جناح

قائد اعظم محمد علی جناح کا مقام پیدائش عام طور پر تو کراچی بتایا جاتا ہے لیکن حیدر آباد یونیورسٹی کے ساتھ ملحق اسٹیٹ ٹیوٹ آف سندھالوجی کے محققین کا فیصلہ ہے کہ آپ کی پیدائش ٹھٹھہ کے قریب جبرک کے مقام پر ہوئی۔

عام طور پر مشہور ہے کہ آپ اسماعیلی خوجے

تھے لیکن مجھے اس بارے میں ایک عجیب اقتباس ملا ہے 1964ء میں ماہنامہ نقوش نے بارہ صفحات پر مشتمل شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ جس میں مشاہیر کی زندگی کے حالات، ان کی اپنی تحریروں سے یا اپنے اقوال کے حوالے سے بڑی خوب صورتی سے جمع کیے گئے تھے۔

محمد علی جناح کے بقول آپ اصل میں منگھری کے علاقے کے ایک راجپوت خاندان کی نسل سے ہیں۔

قائد اعظم سے جب نواب صاحب باغ پت نے کہا کہ آپ کا خاندان تو تجارت پیشہ ہے پھر آپ میں یہ گھن گرج کیسے آئی تو آپ نے کہا۔

”میں اصل میں پنجابی راجپوت ہوں۔ کئی پشتیں گزریں کہ میرے اجداد میں سے ایک صاحب جو منگھری (موجودہ ساہیوال کے رہنے والے تھے۔) کا ٹھہرا واڑ چلے گئے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک خوجہ لڑکی سے شادی کر لی تھی اور ان ہی کے خاندان میں مل گئے تھے۔ اس وقت سے ہم لوگ خوجوں میں شمار ہونے لگے لہذا میں اسماعیلی خوجہ نہیں ہوں بلکہ میری رگوں میں جو خون ہے وہ راجپوت کا ہے۔“

اس قول کے راوی صغیر احمد عباسی پرائیویٹ سیکریٹری آف نواب صاحب چھتاری ہیں۔

(ڈاکٹر اسرار احمد)

(علامہ اقبال، قائد اعظم اور نظریہ پاکستان)

شہنشاہ محمد سلیم نور الدین جہانگیر سلطنت مغلیہ کا چوتھا فرماں روا شہزادہ سلیم تھا۔ وہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ جو 1559ء میں پیدا ہوا تھا۔

شیخ سلیم چشتی سے عقیدت کے باعث اکبر بادشاہ نے اس کا نام محمد سلیم رکھا تھا ار اسے پیار سے شیخو بابا کہتا تھا۔ چنانچہ شیخو پورہ اس کے نام سے موسوم ہے۔



میرے شوہر تو جب بھی پاکستان گئے عوام نے ہماری بہت پذیرائی کی اور ہمیں عزت و احترام سے دیکھا (ہمارے عوام ہیں ہی اتنے امن و محبت والے۔ لیکن اپنے ملک کے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں یہ ہم اور ہمارے ادارے بہتر جانتے ہیں۔)

تجربہ

شمن انصاری نے صرف چار سال کے عرصے میں ٹی وی انڈسٹری میں اپنا نام بنالیا ہے وہ ٹی وی ڈراموں میں مختلف کردار بہت خوبی سے نبھاتی نظر آتی ہیں۔ جب شمن انصاری سے پوچھا گیا کہ کیا انہوں نے اداکاری کی باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے تو انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں وہ حادثاتی طور پر اداکارہ بنی ہیں۔ (حادثاتی طور پر.....؟) ان کا کہنا ہے کہ اس پر کام کرنا ان کے لیے بہت ہی زبردست اور بالکل مختلف تجربہ ہے۔ آڈینس کے سامنے کام کرتے



بد نصیبی

پریم کورٹ آف پاکستان نے بھارتی پروگراموں پر یہ کہہ کر پابندی لگا دی ہے کہ ان پروگراموں سے ملتی ثقافت کو نقصان پہنچ رہا ہے جس کی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی۔ معروف شاعر جاوید اختر اور ان کی بیگم اداکارہ شبنم اعلیٰ کا اس پابندی کے متعلق کہنا ہے کہ فن کی راہ میں رکاوٹیں نہیں کھڑی کرنا چاہئیں۔ (شبنم! کیا بھارت میں پاکستانی پروگرام دیکھنے کی اجازت ہے؟) پابندی کا فیصلہ بد نصیبی ہے۔ یہ فیصلہ پورے کرشمے اور سیاست دانوں کا تو ہو سکتا ہے عام پاکستانی کا نہیں (شانہ! آپ پاکستان کے بارے میں کیسے یہ فیصلہ صادر کر سکتی ہیں؟)

فن کار تو لوگوں کو آپس میں جوڑتے ہیں۔ ہمارے ملک کے بھی کچھ سیاست دانوں کی خواہش ہے کہ فن اور فنکاروں پر پابندی لگے۔ (آپ کے تو عوام بھی.....؟) انہوں نے مزید کہا کہ میں اور

بادشاہ کے قریب لا رہا تھا اور بادشاہ اس کی پھرتی پر اس اش کر رہا تھا۔

وہ ایک تیز رفتار ہرنی کے پیچھے لگا ہوا تھا کہ ہرنی پہاڑ پر چڑھ گئی۔ نوجوان ہنکارا بھی چٹانوں کو عبور کرتا ہوا اس کے پیچھے جا رہا تھا کہ اچانک ایک چٹان سے اس کا پاؤں پھسلا، اس نے ایک جھاڑی کا سہارا لینے کی کوشش کی، لیکن جھاڑی جڑ سے اکڑ گئی اور وہ نوجوان لڑکا پتھریلی چٹانوں سے ٹکراتا، قلابازیاں کھاتا زمین پر بادشاہ کے قریب آ رہا۔ اس کی ہڈیاں بالکل چور چور ہو چکی تھیں۔ وہ بادشاہ کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ بادشاہ نے فوراً شکار موقوف کیا اور اپنی قیام گاہ میں آ گیا۔

جہانگیر پہلے ہی دسے کا مریض تھا۔ ایک نوجوان وفادار ہنکارے کی اچانک موت نے اس کی صحت پر منفی اثرات ڈالے۔ اس کی خواہش کے مطابق لاہور کی طرف سفر تیزی سے شروع کیا گیا۔ لیکن ابھی رجواری ہی میں مقیم تھے کہ 28 صفر 1037ھ بمطابق 1627ء بروز جمعہ المبارک بوقت چاشت بادشاہ جہانگیر اس عالم فانی سے رخصت ہو گیا۔ مرتے مرتے یہ وصیت کر گیا تھا کہ اسے نور جہاں کے بنوائے ہوئے باغ دلکشاں واقع شاہدرہ لاہور میں دفن کیا جائے، چنانچہ ملکہ نور جہاں اپنے محبوب شوہر کی میت کو لے کر لاہور کی طرف عازم سفر ہوئی۔ جب وہ ہجرات شہر کے قریب پہنچے تو موسم گرمی کی شدت کے باعث بادشاہ کا جسم چٹنے سڑنے لگا تو باہم مشورے سے بادشاہ کی آستین اور

معدہ نکال کر ہجرات شہر کے نواح میں دفن کی گئیں۔ آج بھی وہاں جلال پور جٹاں روڈ پر ایک بوسیدہ سا مزار اس قبر کی نشاندہی کرتا ہے، جہاں اہل علاقہ ہر سال ”شاہ جہانگیر“ کا میلہ مناتے ہیں۔



وقت گزرنے کے ساتھ شہزادہ سلیم جسانی طور پر مضبوط ہوا۔ بلکہ ایک عالم فاضل آدمی بن گیا تھا۔ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ علم تاریخ، علم سوانح نگاری، علم جغرافیہ اور علم حیاتیات میں بہت دسترس رکھتا تھا۔

سلیم 1605ء میں تخت نشین ہوا اور اس نے نور الدین جہانگیر کا لقب اختیار کیا۔ اس کے پُر امن اور ترقی یافتہ دور کی وجہ شہزادہ خرم کی شانہ روز محنت تھی۔ جہانگیر نے جو بڑے بڑے کارنامے بطور حکمران سرانجام دیے۔ ان کے علاوہ ترک جہانگیری بھی اس کی تصنیف ہے، جن کی وجہ سے وہ مغل بادشاہوں میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر تقریباً بائیس برس تک سرس اقتدار رہا۔ اس کے اقتدار کے آخری سال میں سپہ سالار رہابت خان (زمان بیگ) نے بادشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کو یہاں بنالیا اور اپنے وطن کابل کی طرف چلا گیا۔ آخر کار سلیقہ مند ملکہ نور جہاں کی تدبیر کام آئی اور جہانگیر اس جنگل سے آزاد ہوا۔ کثرت سے نوشی سے جہانگیر کی صحت روز بروز گری رہی تھی۔ مہابت کی حراست میں رہ کر اس کی صحت پر مزید بڑے اثرات پڑے۔ چنانچہ 1627ء میں رہائی کے بعد شہنشاہ جہانگیر بحالی صحت کی خاطر کشمیر چلا گیا۔ وہاں اس دفعہ طبیعت سنبھل نہ سکی۔ اسی دوران پتا چلا کہ شہزادہ شہر یار (ملکہ نور جہاں کا داماد جولاہور میں مقیم تھا) بال جھڑنے کی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔

لہذا بادشاہ سلامت نے لاہور کا قصد کیا۔ بادشاہ جہانگیر، عالم شہزادگی سے شکار کا شوقین تھا۔ کشمیر سے واپسی پر دل بہلانے کے لیے اس نے ایک دن شکار کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ رجواری کے قریب بیرم کلہ میں شکار کا بندوبست کیا گیا۔ حسب معمول بہت سے ہنکارے جنگلی ہرنوں کو گھیرنے میں مصروف تھے۔ ان میں ایک نوجوان خورولڑکا بھی شامل تھا۔ وہ بڑی پھرتی سے ہرنوں کو گھیر گھیر کر





میں نے کی ہے اس کی وجہ ہے فلم کو کامیاب تو ہوتا تھا۔  
(اسے غلط بھی کہتے ہیں یا خوش بھی؟.....)  
اپنی ہی فلم کے متعلق مایا علی کا کہنا ہے کہ انہیں فلم  
سائن کرتے وقت بتایا گیا تھا کہ اس فلم کی ہیروئن ماہرہ  
خان تھیں مگر اپنی مصروفیات کے باعث اب وہ ہیروئن  
نہیں ہیں۔ میں نے اس حوالے سے زیادہ سوالات  
بھی نہیں کیے۔ (کیا کر سکتی تھیں؟.....) بس اپنا  
اسکرپٹ پڑھا اور اپنے کام پر توجہ دینا شروع کر دی  
ہے۔ مجھے فلموں میں کامیابی اور ایکشن کا تجربہ ہے۔  
(تجربہ!) اب میں کچھ نیا کرنے جا رہی ہوں۔  
(نیا.....؟)

لیکن مایا! ماہرہ خان نے فلم چھوڑی نہیں ہے فلم  
کی ہیروئن ماہرہ خان ہی ہیں اور جلد ہی ان کا کام بھی  
عکس بند کیا جائے گا۔

مایا فلموں پر ہونے والی تنقید کو زیادہ اہمیت نہیں  
دیتیں وہ کہتی ہیں کہ فن کاروں کو کسی بھی تنقید سے گھبراتا  
اور دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ فن کار فلم یا  
ٹی وی کا نہیں ہوتا بلکہ فن کار صرف فن کار ہوتا ہے۔  
اس کی صلاحیتوں سے کہیں بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

### کچھ ادھر ادھر سے

مفروضوں اور حکمت عملیوں سے ضروری  
نہیں آپ کی مرضی کے نتائج حاصل ہوں، سیاست  
اور جنگ دونوں میں کسی ایک فریق کی حکمت عملی فیصلہ  
نہیں کرتی دوسرے فریق کا رد عمل جنگ اور سیاست کا  
فیصلہ کرتا ہے، اسی لیے ہمارے کرم فرماؤں کو اب  
مفروضوں سے نکل کر حقائق کی دنیا میں آنا ہوگا۔ مٹی  
کے مادہ بنانے سے سیاست نہیں چلتی، اس کے لیے  
اصلی نام اور اصلی کام والوں کو سامنے لانا ہوگا جنگ اور  
سیاست میں جھلی بہر نہیں چلتے بلکہ ان کی اصلیت کھل  
جانی ہے۔ سیاست کی ڈوریاں کھینچیں، اسے آزاد  
چلنے دیں۔ پاکستان خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔  
(سہیل وزرائی۔ فیض عام)

کبھی مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ لکھنے اور بنانے پر کوئی  
حد بندی نہیں ہونی چاہیے (حد بندی نہ ہو تو ہمارے  
یہاں فلم فی دی، انڈسٹری کے لوگ بالی وڈ اور ہالی وڈ کو  
بھی پیچھے چھوڑ دیں عریانیات میں ہمارے ایوارڈ شو  
اس کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔) انہوں نے مزید کہا  
کہ آج کل کیا فنکار ننگے نظر آ رہے ہیں ٹی وی پر،  
ڈرامے میں بھی لوگ وہی لباس پہنتے ہیں جو عام  
زندگی میں پہنے جاتے ہیں (جی ہاں سٹیو لیس کے بعد  
دوپٹہ بھی لیس ہی ہو گیا ہے ٹی وی پر؟)

### فخر

چارویٹ لفظ بہنوں نے حکومت پاکستان سے  
درخواست کی کہ وہ پاکستان میں خواتین کے  
پاور لفٹنگ کے کھیل کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دے۔  
لاہور کے ایک ہی گھر سے تعلق رکھنے والی یہ چارویٹ  
لوکیاں ویٹ لفٹنگ میں پاکستان کا فخر بن گئیں۔ ویٹ  
لفٹنگ جیسے مشکل کھیل میں اپنی پہچان بنانا آسان نہیں تھا  
تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور یہ کر دکھایا۔

ٹوٹنکل، ویرونیکا، مریم اور سٹیبل ایشین جیمپن  
سمیت بین الاقوامی سطح پر کئی مقابلے جیت چکی ہیں  
اور اب ایشین اور کامن ویلتھ گیمز میں شرکت کی  
تاریاں بھی جاری ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے دادا  
اور چچا ہمارے والد سے کہتے تھے کہ یہ تم نے لڑکیوں کو  
کس کام پر لگا دیا۔ اب ہم جب اس مقام پر پہنچ گئے تو  
اب سب ہم پر فخر کرتے ہیں۔

ان کا مزید کہنا تھا کہ اگر ہمیں باہر کوئی ایونٹ ویٹ  
لفٹنگ کا کھیلنا ہے تو اس کے لیے تین سے چار سال  
پاکستان میں کھیل کر ایونٹس جیت کر میسج کرنا پڑیں  
گئے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ حکومت ہمیں سپورٹ  
کرے۔ (کاش آپ کی آواز حکومت وقت سن سکے۔)

### تنقید

مایا علی اپنی فلم کی کامیابی کی وجہ سے اپنی عمر اور تجربے  
سے زیادہ بڑی باتیں کرنے لگی ہیں۔ اپنی فلم کے متعلق کہتی  
ہیں کہ مجھے اس کی تیاری کے دوران ہی پتا تھا کہ جتنی محنت

ہوئے فنکار کو فوری رد عمل مل جاتا ہے۔ شمن انصاری  
پہلی مرتبہ اسٹیج پر کام کر کے اتنی پر جوش تھیں کہ ان کا  
بس چلے تو وہ صرف اسٹیج پر ہی کام کریں۔ (خیال  
رہے شمن! اسٹیج ڈرامے یہاں بہت کم ہوتے ہیں۔  
کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کم ہو جائیں۔) ٹی وی سے  
متعلق شمن انصاری کا خیال ہے کہ نئے پروڈیوسر اور  
ڈائریکٹر مرکزی کردار زیادہ تر خوب صورت اور  
اداؤں سے بھرپور لڑکیوں کو دے دیتے ہیں وہ یہ نہیں  
دیکھتے کہ وہ لڑکی اس کردار کی باریکیوں کو سمجھ بھی پائے  
گی یا نہیں..... کردار کو نبھانے کی باتیں۔

### نوٹس

بیمبرانے حال ہی میں انٹرنیشنل چینلوں کو نوٹس  
جاری کیا ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں متنازع اور غیر  
اخلاقی موضوعات اور عورت کو نفی انداز میں دکھانا بند  
کر دیں۔ بیمبرانے کہا کہ ایسے ڈرامے بنائے جائیں  
جو پاکستانی معاشرے کی عکاسی کریں اور اسلامی اور  
معاشرتی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں۔  
بیمبرا کے اس نوٹس کے متعلق بات کرتے  
ہوئے فہیل الرحمن قمر نے کہا کہ ”قلم کار کے کام میں





# موسم کے پکوان

خالہ جیلانی

## بہاری چکن تکہ

ضروری اشیاء:-

چکن	آدھا کلو
تیل	حسب ضرورت
دہی	آدھا کپ
ہری مرچیں پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
لال مرچ پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن اور کپ	ایک کھانے کا چمچ
پیاز پسلی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
گرم مسالا پیسا ہوا	آدھا کھانے کا چمچ
زیرہ پیسا ہوا	آدھا چائے کا چمچ
چکن کو دھو کر کچن پیپر سے خشک کر لیں۔ دہی	
میں ہری مرچوں کا پیسٹ، لال مرچ، نمک، لہسن،	
اورک، پیاز، گرم مسالا اور زیرہ ڈال کر کس کر کے	
میرینیشن تیار کر لیں۔	
چکن میں تیار کی ہوئی میرینیشن لگا کر اسے دو تین	
گھنٹے تک فریج میں میرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔	
میرینٹ کی ہوئی چکن کو تیل میں لگا کر سینک لیں یا	
اودن میں بیک کر کے تازہ سلاو کے ساتھ پیش کریں۔	

## انڈوں کا قورمہ

ضروری اشیاء:-

انڈے	آٹھ عدد
(اگلے ہوئے درمیان سے کٹے ہوئے)	
بلدی	ایک چائے کا چمچ
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ

لیموں کا رس  
لال مرچ پسلی ہوئی  
کڑی پتہ  
تل  
خشخاش

دو کھانے کے چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
تین سے چار عدد  
ایک چائے کا چمچ  
دو چائے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
بادام  
(تل، خشخاش، بادام کو باریک پیس لیں)  
تیل  
آدھی پیالی

کڑا ہی میں تیل کو گرم کریں اور اس میں دہی،  
لال مرچ، تل، خشخاش، بادام، نمک، کڑی پتہ ڈال کر  
اس کو بلی آج پر پکائیں یہاں تک کہ سائمن گاڑھا  
ہو جائے اس میں اگلے ہوئے انڈے ڈال دیں۔ کچھ  
دیر دم پر رکھیں پھر اس کے اوپر لیموں کا رس ڈال کر  
اتار لیں۔ یہ ڈش چاولوں کے ساتھ مزادے گی۔

## برنس روڈ چکن کڑا ہی

ضروری اشیاء:-

مرغی کا گوشت	ایک کلو
ٹماٹو پیسٹ	ایک کپ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسلی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
بلدی	چوتھائی چائے کا چمچ
لہسن اور کپ	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں	(چوب کیا ہوا)
ہرا دھنیا (چوب کر لیں)	آٹھ سے دس عدد
دہی	(چوب کر لیں)
نمک	آدھی ٹمبی
تیل	ایک کپ

سائمن میں تیل گرم کر کے ٹماٹو پیسٹ اور دہی  
ڈال دیں۔ تھوڑا میٹھون کر گوشت شامل کر دیں۔ تین چار  
منٹ تک پکائیں۔ لال مرچ، بلدی، لہسن، اورک، ہری  
مرچیں، سفید زیرہ اور نمک ڈال کر بجھان لیں۔ پانی شامل

کر کے گوشت کو جگالیں۔ حسب پسند گرم پوری رکھ کر ہرا دھنیا  
شامل کر دیں۔ سردنگ پلیٹ میں نکال کر پیش کریں۔  
چائینیز چرغہ پلاؤ

ضروری اشیاء:-

ثابت مرغی  
(خوب اچھی طرح صاف کر کے گہرے کٹ لگو لیں)  
ایک عدد  
چاول  
(نمک ڈال کر بال لیں)  
ایک کلو

چائینیز نمک  
لہسن اور کپ  
لوگ (پس لیں)  
دارچینی (پس لیں)  
سونف (پس لیں)  
اجوائن (پس لیں)  
نمک  
دو چائے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
چار عدد  
دو چھوٹے ٹکڑے  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
حسب ذائقہ

شملہ مرچیں  
(تیل نکال کر لمبے سلاکس کاٹ لیں)  
گاجر  
(لمبے سلاکس کاٹ لیں)  
ہری پیاز  
دو عدد  
دو عدد  
دو کھانے کے چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
حسب ضرورت  
ایک چائے کا چمچ

دوسرے شازسوس  
سفید سرکہ  
چلی سوس  
سیاہ مرچ پسلی ہوئی  
سفید مرچ پسلی ہوئی  
تیل  
زعفران یا زرد رنگ  
مرغی میں، دوسرے شازسوس، سفید مرچ، لہسن  
اورک، نمک اور چلی سوس، سویا سوس، چائینیز نمک،  
سیاہ مرچ اور سرکہ کی آدھی مقدار ڈال کر میرینٹ  
ہونے کے لیے رکھ دیں۔  
کڑا ہی میں تیل گرم کریں، اس میں میرینٹ کی

ہوئی مرغی ڈال کر درمیانی آج پر فرانی کر کے نکال لیں۔  
پتلی میں تیل ڈال کر گرم کر کے اس میں شملہ  
مرچیں، گاجر اور ہری پیاز ڈال کر سائے فرانی کریں اور  
بقیہ سویا سوس، چائینیز نمک، سیاہ مرچ، سفید مرچ ڈال  
دیں، نمک ڈالیں اور چاول ڈال کر اتنا پانی ڈالیں کہ  
چاول کھڑے کھڑے رہیں۔ اوپر فرانی کی ہوئی ثابت  
مرغی رکھ دیں، جب چاول تھوڑے کھٹے باقی رہیں،  
تب زعفرانی رنگ ڈال دیں اور سیاہ مرچ چھڑک کر  
دم دے دیں، مزے دار چائینیز چرغہ پلاؤ تیار ہے۔

## سیخ کباب برگر

ضروری اشیاء:-

ایک پاؤ	قیمہ
دو کھانے کے چمچ	سیخ کباب مسالا
تین چار عدد	ہری مرچیں
آدھا کپ	ہرا دھنیا
ایک کپ	ماپونیز
آدھا کپ	گاجر (کدو کی ہوئی)
حسب ذائقہ	نمک
چوتھائی چائے کا چمچ	سیاہ مرچ
تین سے چار عدد	برگر بن
حسب ضرورت	تیل
چوتھائی چائے کا چمچ	لہسن اور کپ
چوپر میں قیمہ، سیخ کباب مسالا، نمک، لہسن	
اورک، ہری مرچیں اور ہرا دھنیا ڈال کر اچھی طرح	
باریک پیس لیں۔	
قیمے کو فریج میں میرینٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔	
اس کے بعد اس قیمے کو سیخ کباب کی شکل دے کر فرانی پین	
میں تیل گرم کر کے فرانی کر لیں اور ٹھوپیر پر نکال لیں۔	
ایک باؤل میں ماپونیز، نمک، چلی بھر سیاہ مرچ	
اور کدو کش گاجر ڈال کر اچھی کس کر لیں۔ اس کے بعد	
برگر پر ماپونیز لگا لیں اور سیخ کباب رکھ دیں اور دوسرا	
حصہ اس پر رکھ کر چلی گارلک سوس یا من پسند چٹنی کے	
ساتھ گرم گرم پیش کریں۔	



FaceFresh

## GIVE YOU SKIN Cleansing TREATMENT

داغ دھبے اور چھائیوں کا  
مکمل خاتمہ

REAL  
BEAUTY  
REAL  
SHINE

FaceFresh  
CLEANSER CREAM

FaceFresh  
CLEANSER CREAM  
5  
FORMULA  
REMOVES FRECKLES,  
ACNE MARKS, DARK SPOT  
WITHEALS & DARK CIRCLES  
Freckles Treatment  
Night Cream  
Removes Acne Marks

facefresh1

face.fresh

www.facefresh.com



### پچھے ہونٹوں کا علاج

سرسوں کے تیل کے استعمال سے بال صحت مند اور چمک دار ہو جاتے ہیں خشکی سے بچنے کے لیے سرسوں کے تیل کا سر میں مساج معمول بنائیں۔ یہ سر کی خارش اور بال گرنے کی شکایت بھی دور کر دے گا۔  
سرسوں کا تیل پچھے ہونٹوں کا بھی موثر علاج ہے۔ پچھے ہونٹ پوری شخصیت کو متاثر کرتے ہیں ایسے میں ہونٹوں پر ذرا سا سرسوں کا تیل مل لینے سے ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔  
رات سونے سے قبل 1 چمچ دہی میں سرسوں کے تیل کا ایک قطرہ کس کر کے ہونٹوں پر لگانے سے صبح ہونٹ نرم ملیں گے۔

### پیٹ اندر کریں

بعض خواتین موٹاپے کا شکار تو نہیں ہوتیں البتہ ان کا پیٹ ضرور باہر نکلا ہوا ہوتا ہے۔ جس کے باعث ان کی جسمانی خوبصورتی، بد صورتی میں بدل جاتی ہے۔ پیٹ کو اندر رکھنے کے لیے پیٹ کی ورزشیں کریں۔ ذیل میں چند ورزشیں بتائی جا رہی ہیں۔  
(1) فرش پر لیٹ جائیں، اپنے اوپری جسم کو زمین سے اوپر اٹھائیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی جانب لے جا کر انگلیاں زمین پر ٹکائیں۔ جسم کے اوپری حصے کو زمین سے اوپر کی طرف اٹھائیں۔ اپنی ٹانگوں کو بھی زمین سے تھوڑا اوپر اٹھائیں اور سانس اندر کھینچیں۔ اپنے گھٹنوں کو سینے سے قریب کرنے کی کوشش کریں پھر سانس باہر نکالیں۔ اب ٹانگیں سیدھی کر لیں اس طرح آٹھ مرتبہ کریں۔  
(2) آرام سے لیٹی رہیں۔ ٹانگوں کی پوزیشن کو

سائیکل چلانے کے انداز میں لائیں۔ بائیں ٹانگ کو موڑیں اور بائیں گھٹنے کو دائیں کہنی، پھر دائیں ہر کے گھٹنے کو بائیں کہنی سے ملائیں۔ ہاتھ اس طرح گردن کی پشت پر رکھیں اور سر اودھکندھے فرش سے اوپر رکھیں یہ بھی آٹھ مرتبہ دہرائیں۔

(3) فرش پر آرام دہ حالت میں بیٹھ جائیں۔ اپنے سینے کو دائیں پر جھکائیں ٹانگوں کو سیدھا رکھیں۔ پیروں کو سامنے کی طرف سیدھا کریں۔ دونوں ہاتھوں سے پیروں کو پکڑیں اور آٹھ تک گنتیں پھر ٹانگوں کو چھوڑ دیں اور آٹھ تک گنتیں، یہ ورزش تین مرتبہ دہرائیں۔ آہستہ آہستہ اپنے سر کو پیروں کے پیچوں کے پاس لانے کی کوشش کریں۔

(4) زمین پر بیٹھ کر اپنی ٹانگوں کو دونوں اطراف میں پھیلائیں۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو چہرے کے بالکل سامنے فرش پر ایک دوسرے کے اوپر رکھیں اور سینے کو ممکنہ حد تک آگے جھکانے کی کوشش کریں اور سولہ تک گنتیں گنتیں۔

(5) بیٹھی رہیں دونوں ٹانگوں کو ملا کر اپنے سامنے رکھیں اور دونوں ہاتھوں کو پیچھے پشت کی طرف نکالیں۔ دونوں گھٹنوں کو سینے کی طرف لائیں۔ اس طرح پھر فرش سے اوپر اٹھ جائیں گے پھر سینے تک گھٹنے لا کر آٹھ تک گنتیں۔

(6) فرش پر لیٹ جائیں اور دونوں ہاتھوں کو فرش پر بالکل سیدھا رکھیں۔ اپنی دونوں ٹانگوں کو اوپر اٹھائیں اور سر کی سمت لاتے ہوئے سر کے اوپر سے گزرتے ہوئے فرش پر لگانے کی کوشش کریں پھر واپس ٹانگوں کو اپنی سابقہ پوزیشن پر لائیں۔ اسے آٹھ مرتبہ دہرائیں۔

ان ورزشوں کو باقاعدگی سے کرنے کے بعد آپ خود اپنی جسمانی ہیپ میں خوبصورت تبدیلی محسوس کریں گے۔ لیکن ان تمام ورزشوں کو ایک ساتھ شروع نہ کریں جب عادی ہو جائیں تو ایک ایک اسٹیپ بڑھاتی جائیں حاملہ خواتین یہ ورزشیں نہ کریں۔